MAHS114CCT

تاریخ ہندوستان

(1857–1757)

History of India

(1757–1857)

فاصلاتی اور روایتی نصاب پر مبنی خود اکتسابی مواد

ایم۔اے۔(پہلا سمسٹر)

چوتھا پرچہ

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد، تلنگانہ، بھارت– 032 500

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Course: History of India (1757–1857)
ISBN: 978-93-95203-35-7
Edition: December 2022

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2022
Copies	:	1000
Copy Editing	:	*Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha, Programme Coordinator–History, DDE, MANUU, Hyderabad Dr. Syed Meer Abul Hussain, Asst. Professor of History (C), DDE, MANUU, Hyderabad Mr. Mohd Aasim, Asst. Professor of History (C), DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, Asst. Professor of Urdu (C), DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Print Time & Bussiness Enterprises, Hyderabad.

M.A. History

History of India
(1757 – 1857)
1st Semester

On behalf of the Registrar, *Published by*:
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad – 500032 (TS), Bharat
Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing from the publisher (registrar@manuu.edu.in).

مدیر اعلیٰ

Chief Editor

Prof. S.M. Azizuddin Husain
Former Head, Department of History & Culture
Jamia Millia Islamia, New Delhi
&
Maulana Azad Chair Professor
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین
سابق صدر، شعبہ تاریخ وثقافت
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
مولاناآزاد چیئر پروفیسر
مولاناآزاد نیشنل اردو یونیورسٹی،
حیدرآباد

مدیر

Editor

***Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha**
Programme Coordinator – History
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا
پروگرام کوآرڈی نیٹر، تاریخ
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولاناآزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مدیر زبان

Language Editor

Dr. Mohd. Akmal Khan
Assistant Professor of Urdu (C) / Guest Faculty
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ڈاکٹر محمد اکمل خان
اسسٹنٹ پروفیسر اردو (عارضی)/ گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولاناآزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مجلس ادارت

Editorial Board

Prof. Perwez Nazir
Centre for Advanced Studies
Department of History
Aligarh Muslim University, Aligarh

پروفیسر پرویز نظیر
سینٹر فار ایڈوانسڈ اسٹڈیز، شعبہ تاریخ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Prof. Alauddin Khan
Head, Department of History
Shibli National College, Azamgarh

پروفیسر علاؤالدین خان
صدر، شعبہ تاریخ
شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

***Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha**
Programme Coordinator – History
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا
پروگرام کوآرڈی نیٹر، تاریخ
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Dr. Ahmad
PGT (History)
MANUU Model School
Hyderabad

ڈاکٹر احمد
پی جی ٹی (تاریخ)
مانو ماڈل اسکول، حیدرآباد

Dr. Syed Meer Abul Hussain
Assistant Professor of History (C) / Guest Faculty
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ڈاکٹر سید میر ابوالحسین
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (عارضی)/ گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Mr. Mohd. Aasim
Assistant Professor of History (C) / Guest Faculty
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

جناب محمد عاصم
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (عارضی)/ گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

پروگرام کوآرڈی نیٹر
ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا
اسسٹنٹ پروفیسر (تاریخ)، نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
• ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا اور ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	1،2،3
• ڈاکٹر اے۔ سبھاش	4،5،6،8
• ڈاکٹر کھانڈے پرویز احمد	7
• ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	9،10،11
• پروفیسر پرویز نظیر	12
• ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا	13،14
• ڈاکٹر خورشید احمد بٹ	15
• پروفیسر مجیب اشرف	16

پروف ریڈرس:

1. جناب محمد عاصم
2. ڈاکٹر سید میر ابوالحسین
3. ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	پروگرام کوآرڈی نیٹر	9
بلاک-I	**18ویں صدی کا ہندوستان: پلاسی اور اس کے بعد**	
اکائی1	علاقائی طاقتوں کا عروج	13
اکائی2	یوروپی نوآبادیاتی طاقتیں: برتری کی جدوجہد	31
اکائی3	برطانوی حکومت کا قیام	49
بلاک-II	**برطانوی ہندوستانی سامراج**	
اکائی4	آزاد خیالی اور سامراج: استشراقیت، افادیت پسندی اور مقامی رد عمل	70
اکائی5	جنگ اور حکمت عملی	87
اکائی6	حکمرانی کے اعضاء: ساخت اور ادارے: فوج، پولیس اور شہری خدمات	108
اکائی7	رجواڑہ ریاستوں سے تعلقات	128
اکائی8	پارلیمنٹ اور سامراج: آئینی ارتقاء	140
بلاک-III	**برطانوی حکمرانی کے اثرات**	
اکائی9	زمینی مالگزاری بندوبست: استمراری، رعیت واری اور محل واری بندوبست	162
اکائی10	دولت کی نکاسی اور مقامی صنعتوں کا زوال	175
اکائی11	نوآبادیاتی معیشت کی خصوصیات	189

اکائی12	جدید تعلیم کا آغاز وارتقاء	203
اکائی13	سماجی-مذہبی اصلاحی تحریکیں	216
بلاک-IV	**برطانوی حکمرانی کی مزاحمت**	
اکائی14	مزاحمت کی نوعیت اور اس کی شکلیں	237
اکائی15	اہم کسان اور قبائلی بغاوتیں	247
اکائی16	1857 کی بغاوت اور برطانوی حکومت کی طرف منتقلی	263
نمونہ امتحانی پرچہ		291

پیغام

مولاناآزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں ۔(1)اردو زبان کی ترویج و ترقی (2)اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3)روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل و اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اردو میں دستیاب تحریریں قاری کو کبھی عشق و محبت کی پُر پیچ راہوں کی سیر کراتی ہیں تو کبھی جذباتیت سے پُر سیاسی مسائل میں اُلجھاتی ہیں، کبھی مسلکی اور فکری پس منظر میں مذاہب کی توضیح کرتی ہیں تو کبھی شکوہ و شکایت سے ذہن کو گراں بار کرتی ہیں۔تاہم اُردو قاری اور اُردو سماج دور حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔یہی وہ مبارزات (Challenges) ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔انہیں مقاصد کے حصول کے لیے اردو یونیورسٹی کا آغاز فاصلاتی تعلیم سے 1998 میں ہوا تھا۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ اس کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا ہے۔ فاصلاتی تعلیم کے طلباء کے لیے کم سے کم وقت میں خود اکتسابی مواد اور خود اکتسابی کتب کی اشاعت کا کام عمل میں آ گیا ہے۔ پہلے اور دوسرے سمسٹر کی کتب شائع ہو کر طلباء و طالبات تک پہنچ چکی ہیں۔ تیسرے سمسٹر کی کتابیں بھی جلد طلباء تک پہنچیں گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے ہم ایک بڑی اردو آبادی کی ضروریات کو پورا کر سکیں گے اور اِس یونیورسٹی کے وجود اور اِس میں اپنی موجودگی کا حق ادا کر سکیں گے۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کار گر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈِویژن سے ہوا اور اس کے بعد 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈِویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بی UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کر کے خود اکتسابی مواد SLM از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جا رہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 5 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 155 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centre) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کر دیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔

پروفیسر محمد رضاءاللہ خان
ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

عزیز متعلمین! تاریخِ ہند(1757–1857)کے اس کورس میں خوش آمدید۔اس کورس میں، آپ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی حالات کو سمجھیں گے اور یہ کہ مغلیہ سلطنت کے بکھرنے کے بعد کئی علاقائی طاقتیں کیسے ابھریں۔آپ یہ بھی سمجھیں گے کہ کس طرح مختلف یورپی استعماری طاقتیں ہندوستان میں داخل ہوئیں۔آپ سیاسی برتری کے لیے ان کی باہمی جدوجہد، اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کو سمجھ سکیں گے۔مزید برآں، آپ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی کے طریقوں، غیر ملکی حکمرانی کے قانونی جواز کے نظریات، توسیع اور استحکام کے حربے، مقامی حکمرانوں کے تئیں اس کے سلوک وغیرہ کی جانکاری حاصل کریں گے۔آپ خاص طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی تباہ کن معاشی پالیسیوں، منصوبہ بند طریقے سے ہندوستان کی مقامی صنعتوں کی تباہی اور 'کم ترقی یافتہ کی ترقی' کو سمجھیں گے۔اس منظم بربادی کا نتیجہ بے شمار لوگوں کی جانب سے احتجاج یہاں تک کہ بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوا۔آپ دیکھیں گے کہ مزاحمتی تحریکات کی رہنمائی ہمیشہ جدید نظریات جیسے آزادی، مساوات اور بھائی چارے/بہن چارے سے نہیں ہوتی تھی: اس میں ابتدائی شناختوں نے ایک اہم کردار نبھایا۔ آپ ان ہندوستانی دانشوروں کو سراہیں گے جنہوں نے بڑے سماجی خطرات مول لیتے ہوئے ہندوستان کو جدید بنانے کے لیے سماجی اور مذہبی اصلاحات کی تحریکیں چلائیں۔آپ سمجھیں گے کہ حکومت کیوں اور کیسے انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاجِ برطانیہ کو منتقل ہوئی۔

میرے عزیز طلبا دوستوں! حالیہ دور تک، تاریخ کو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے عظیم کارناموں/بداعمالیوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ملکائیں بھی زیادہ تر اپنے عظیم مردوں کے تعلق کی وجہ سے ظاہر ہوئیں۔دوسرے لفظوں میں، تاریخ کو بادشاہوں اور ریاستوں، شہنشاہوں اور سلطنتوں، کے ناموں کی ایک لمبی فہرست سمجھا جاتا تھا۔اس میں ان کے ذریعے لڑی جانے والی جنگوں اور ان کی محبوباؤں وغیرہ کا تذکرہ بھی شامل تھا۔مختصراً، تاریخ کا مطلب سیاسی تاریخ تھا اور بدقسمتی سے یہ سوچ عام لوگوں کے ذہنوں پر ابھی بھی حاوی ہے۔عام لوگ، محنت کش عوام، جو اصل تاریخ ساز تھے، شاید ہی کبھی تاریخ کے ڈرامے میں نظر آئے۔لیکن اب تاریخ کے بارے میں نقطہ نظر بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور اسی لیے تاریخ لکھنے کا طریقہ بھی بدل گیا ہے۔عام لوگ بشمول مرد و خواتین، نے تاریخ میں اپنے حصے کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے۔اب تاریخ کی توجہ حکمرانوں سے رعایا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔جیسا کہ تیلگو شاعر سری سری (سری رنگم سری نواس راؤ) نے اپنی نظم میں مناسب طریقے سے بیان کیا ہے، اب مورخین اس کی کھوج کرنا چاہتے ہیں اور "تاریخ کے اندھیرے میں دبی پڑی سب کہانیوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔وہ پوچھنے لگے کہ دریائے نیل کی تہذیب میں عام زندگی کیسی تھی اور تاج محل کی تعمیر میں پتھر ڈھونے والے قلی کون تھے اور سلطنتوں کے باہمی جنگوں میں عام لوگوں کی بہادری کیسی تھی۔ناوہ ڈولی گنتی کی تھی چڑھ بیٹھا جس پر راجا، اس کے واہک کلی کون تھے؟" یہ بے حد ضروری ہے کہ تاریخ کا مطالعہ عام آدمی کے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔مشہور ادیب جارج اورویل نے تاریخ کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ: "جو ماضی کو کنٹرول کرتے ہیں وہی مستقبل کو کنٹرول کرتے ہیں: جو حال کو کنٹرول کرتے ہیں وہی ماضی کو کنٹرول کرتے ہیں۔" ممتاز مورخ پروفیسر کے ایس ایس شیشن نے زور دیا کہ "تاریخ کا معاشرے سے وہی رشتہ ہے جو یادداشت کا فرد سے ہے ودیا واچسپتی ایس ایم باشا کا ماننا ہے کہ جو ماضی کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں، وہ حال کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں، ماضی کو سمجھنے کے لئے حال کا گہرا فہم ہونا لازمی ہے۔ UGC-DEB کی ہدایات کے مطابق، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے سیلف لرننگ مٹیریل لکھنے کے لیے بہترین مصنفین کو راغب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔امید ہے کہ یہ نہ صرف آپ کی تعلیمی کارکردگی کے لیے کارآمد ثابت ہوگا بلکہ مختلف مسابقتی امتحانات کو اعتماد کے ساتھ دینے کے قابل بھی بنائے گا۔ہم شعبہ تاریخ، نظامت فاصلاتی تعلیم میں، آپ کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔کورس میں ایک بار پھر خوش آمدید اور میں آپ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

پروگرام کوآرڈی نیٹر

تاریخ ہندوستان

(1857-1757)

History of India

(1757-1857)

اکائی 1۔علاقائی طاقتوں کا عروج

(Emergence of Regional Powers)

اکائی کے اجزا

1.0		تمہید
1.1		مقاصد
1.2		نئی طاقتوں کا عروج
1.3		مراٹھا
	1.3.1	معیشت
	1.3.2	انتظامیہ
1.4		سکھ
1.5		بنگال
	1.5.1	معیشت
	1.5.2	انتظامیہ
1.6		اودھ
	1.6.1	معیشت
	1.6.2	انتظامیہ
1.7		حیدر آباد اور میسور
	1.7.1	انتظامیہ
1.8		اٹھارویں ویں صدی کی ریاستوں کی معاشی بنیاد
1.9		خود مختاری کے اظہار کے طریقہ کار
1.10		اقتدار کو جواز مہیا کرنا

1.11 اکتسابی نتائج
1.12 کلیدی الفاظ
1.13 نمونہ امتحانی سوالات
1.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
1.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
1.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
1.14 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1.0 تمہید (Introduction)

مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی ہندوستان میں متعدد آزاد علاقائی ریاستیں وجود میں آئیں۔ بنیادی طور پر یہ تین طرح کی ریاستیں تھیں۔ اول وہ جنہیں طاقتور مغل امراء نے مغل سلطنت سے خود مختاری کا دعویٰ کرتے ہوئے قائم کیا۔ دوسری وہ ریاستیں تھیں جنہیں مغل سلطنت کی دشمن طاقتوں نے قائم کیا۔ تیسری قسم میں وہ ریاستیں شامل تھیں جو یا تو پہلے سے موجود تھیں یا پھر انہیں کسی اولوالعزم مہم جو شخص نے قائم کیا۔ مقامی زمیندار، کسان، کاروباری اور تاجر لوگ جو مغل سلطنت کے ابتر حالات اور بیرونی حملوں سے پریشان تھے، انہوں نے ان نئی علاقائی طاقتوں کو امن وامان کے قیام کے بدلے اپنی حمایت اور وفاداری فراہم کی۔ ان ریاستوں کے حکمرانوں نے امن وامان بحال کیا اور پائیدار معاشی وانتظامی نظام قائم کیا۔ انہوں نے ان نچلے درجے کے افسروں، چھوٹے چھوٹے سرداروں اور زمینداروں کے اختیارات کم کرنے کی کوشش کی جو کسانوں کی زائد پیداوار پر قبضہ کرنے کی جدوجہد میں اعلیٰ افسروں اور جاگیرداروں سے مسلسل لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور خود اقتدار اور سرپرستی کا مرکز بننا چاہتے تھے یا کسی کو بنانا چاہتے تھے۔ ان کوششوں میں نئے حکمرانوں کو کبھی کم تو کبھی زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔

ان ریاستوں کی سیاست یک سر غیر فرقہ وارانہ یا سیکولر تھی۔ شہری اور فوجی تقرریوں میں بھی وہ مذہبی بھید بھاؤ نہیں کرتے تھے۔ ان کے اقتدار کے خلاف بغاوت کرنے والے بھی حکمراں کے مذہب کا کوئی لحاظ نہیں کرتے تھے۔ بہر کیف ان میں سے کوئی بھی ریاست اتنی طاقتور نہیں ہو سکی کہ وہ ایک کل ہند طاقتور سلطنت قائم کر سکے بھلے ہی ان ریاستوں نے اپنے علاقوں میں تجارت، کاروبار اور زراعت کو ترقی دی اور ثقافتی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارہویں صدی کا نصف آخر اور انیسویں صدی کا پہلا حصہ سنگ میل کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔ یہ تبدیلیاں صرف سیاسی میدان تک محدود نہیں تھیں، بلکہ سماجی، معاشی اور ثقافتی میدانوں میں بھی ہو رہی تھیں۔

1.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- اٹھارہویں صدی میں کس طرح متعدد علاقائی طاقتیں ابھر کر سامنے ائیں، ان کی وجوہات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- مراٹھا، حیدرآباد، میسور وغیرہ جیسی علاقائی طاقتوں کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ان علاقائی طاقتوں کی خوبیوں اور کمزوریوں کو سمجھ سکیں گے جو برطانوی حکومت کے قیام میں معاون ثابت ہوئیں۔

1.2 نئی طاقتوں کا عروج (Emergence of New Forces)

18ویں صدی میں منصب داروں کے طبقہ امراء نے اپنی مضبوط سیاسی حیثیت پر زور دینا شروع کیا۔ ایسا اس لیے ہوا کیونکہ منصب اور جاگیر کا نظام جس پر مغلوں کے اس انتظامی اعلیٰ طبقے کا وجود قائم تھا، ٹوٹنے لگا تھا۔ مقامی بغاوتوں کے سبب جاگیروں سے حاصل ہونے والی آمدنی میں کمی پیدا ہوگئی اور بیرونی حملوں نے مغل سلطنت کے مالی وسائل کو سخت دھکا پہنچایا۔ سلطنت کے زوال کے ساتھ اس کا مرکزی اقتدار ڈھیلا پڑ گیا اور صوبائی گورنروں نے صوبائی آمدنی کو مرکزی خزانے میں بھیجنے سے انکار کرنا شروع کر دیا۔ یہ ایک طرح سے علاقائی خود مختاری کا اعلان تھا۔ مقامی زمینداروں، تاجروں اور ساہوکاروں نے بھی ان علاقائی طاقتوں کو اپنا مسیحا سمجھا اور ان کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ نتیجتاً ان نئے سماجی گروہوں نے اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کیا۔ انہوں نے ریاست سے حاصل ہوئی زمینوں پر مالکانہ حقوق حاصل کر لیے تھے اور انہیں ذاتی ملکیت میں تبدیل کر دیا جو اس سے پہلے مغل دور میں کبھی بھی منتقل کی جاسکتی تھی۔ انہوں نے بازاروں اور تجارت سے ٹیکس وصول کرنے شروع کیے۔ ان میں سے بعض جیسے مراٹھا، سکھ اور جاٹوں نے علاقوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے بغاوت کا راستہ اپنایا۔ انہوں نے پرگنہ سطح پر اپنے مضبوط رشتہ داری تعلقات کا استعمال کیا اور سیاسی رسوخ کے اپنے دائرے کو مزید بڑھایا۔

دکن کے علاقائی جھگڑوں میں مغلوں کی مداخلت سے قدیم ہندو زمینداروں کو کافی فائدہ پہنچا۔ مختلف مسلم حکمراں ان زمینداروں سے مصالحت کرنا چاہ رہے تھے تاکہ اپنے مخالفین کے خلاف ان کا استعمال کر سکیں۔ جیسے کہ شواجی کے باپ دادا بیجاپور کی سلطنت کے حامی اور مددگار تھے۔ یہ عمل مغربی دکن میں مراٹھوں کے عروج کی بنیاد ہو سکتا ہے۔ مغل سلطنت کی توسیع کے دوران بہت سے مقامی راجاؤں اور زمینداروں کو مغل نظام میں شامل کر لیا گیا تھا جس سے مغلوں کے ساتھ ساتھ مقامی سرداروں کو بھی فائدہ پہنچا۔ اس اعلیٰ طبقہ کا تعاون نئے علاقوں کے زرعی فاضل پیداوار حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا۔ اسی لیے سیدھے طور پر موجودہ زمینداری حقوق پر مغلوں کی نئی افسر شاہی (Bureaucratic) ساخت کو عائد کیا گیا۔ مغل نظام حکومت، کوئی نہیں یک جنس نہیں تھا بلکہ یہ ایک سیڑھی دار اور متفرق اقتدار کا ڈھانچہ تھا جس میں مختلف ایک دوسرے پر بڑھ چڑھ جانے والے حقوق اور ذمہ داریاں تھیں۔ مغل ریاست ان مقامی طبقہ اشرافیہ کے ساتھ اقتدار اعلیٰ کے بہت سی خصوصیات ساجھا کرتی تھی۔ مقامی طبقہ اشرافیہ افراد اور وسائل کے حقیقی مالک تھے ساتھ ہی ساتھ مقامی سطح پر ذات کے نظام کے سرپرست تھے۔

1.3 مراٹھا (The Marathas)

مراٹھاایک نیا طبقہ اعلیٰ تھا جو مختلف ذاتوں جیسے کنبیوں، لوہار، سونار، بھنڈاری، ٹھاکر اور یہاں تک کہ دھنگروں (چرواہوں) سے آنے والے خاندانوں سے مل کر بنا تھا۔ انہوں نے پیروکار گروہوں کے ساتھ بہمنی مملکت میں یا اس کے باغیوں کے یہاں خدمات انجام دیں اور اپنی خدمات کے عوض زمیندارانہ حقوق (وطن اور انعام) حاصل کیے۔ وطن عطیات، خدمات کے لیے موروثی نوعیت کے تھے جبکہ انعام سابقہ خدمات یا خصوصی قابلیت کی بنیاد پر دیے جاتے تھے۔ عسکری روایت کے نئے اصول اور اعلیٰ ترین طرز زندگی کو اپنانے کی وجہ سے وہ عام کسانوں سے ممتاز تھے۔ مراٹھوں کے ذریعہ آبادکاری سے زرعی پیداوار کے مختلف حصوں پر متعدد قسم کے حقوق وجود میں آئے، جیسے گاؤں کی سطح پر موروثی پاٹل حقوق اور پرگنہ سطح پر دیش مکھی حقوق وغیرہ۔ یہ مقامی اشراف گھرانے مالگزاری کی کل وصولی کا تقریباً 15 فیصد اپنے حصے کے طور پر لے لیا کرتے تھے۔ برہمن اشراف خاندانوں (کلکرنی اور دیش پانڈے) کو بھی گاؤں اور پرگنہ سطح پر ریکارڈ اور کھاتہ رکھنے کے لیے اپنا حصہ حاصل کرتے تھے۔ دیش مکھ مملکت کے مختلف علاقوں میں فوجیوں کی تربیت اور امن وامان کے قیام کے ذریعے فوجی خدمات فراہم کرتے تھے۔ وہ مختلف روایتی، فوجی، عدالتی اور معاشی حقوق سے استفادہ کرتے تھے۔ مراٹھاطاقت کا ابھرنا دراصل طاقتور زمینداروں کی اندر سے پھوٹنے والی بغاوت تھی، جو اقتدار اعلیٰ کے خواہش مند تھے اور زرعی فاضل پیداوار کی تقسیم نو کے حمایتی تھے جس سے مقامی زمیندار طبقے کو فائدہ پہنچتا تھا۔ چوتھ اور سردیش مکھی کی شکل (تشخیص شدہ مالگذاری کا علی الترتیب 25% اور تقریباً 10 تا 12.5) میں مراٹھوں کا زرعی پیداوار پر دعویٰ ایک قسم کا زمینداری دعویٰ تھا۔ یہ ایک طرح کا حفاظتی ٹیکس تھا جو انہوں نے اپنے قبضوں والے علاقوں میں نافذ کیا تھا۔

مغل حکمراں طبقے کے خلاف ہونے والی بغاوت کے عمل کے دوران مراٹھا ریاست کو عروج حاصل ہوا۔ یہ مقامی اعلیٰ طبقے کی سیاسی آرزوؤں کا اظہار کرتی ہیں جو مغل 'دباؤ' کے خلاف کاشتکار ذاتوں کی عام بغاوت کے نتیجے میں پیدا ہوئیں تھیں۔ بہت سے مراٹھا فوجی دکن ریاستوں میں بارگیروں (گھڑ سواروں) کے طور پر ملازم تھے جن کے پاس ذاتی گھوڑے اور ہتھیار نہیں ہوتے تھے۔ مقامی حکمراں طبقوں (گاؤں کے سطح پر پاٹل/ کلکرنی اور پرگنہ سطح پر دیش مکھ /دیش پانڈے) نے اپنی سیاسی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے اس فوجی روایت کا استعمال کیا۔ دیش مکھوں نے دیہاتوں میں فوجی دستے تیار کرنے کے ذریعہ فوجی خدمات فراہم کیں۔ حملہ آوروں کو پسپا کرنے، باغیوں کو غیر مسلح کرنے میں مدد کی اور جنگ کے زمانے میں لڑنے کے لیے افواج میں شامل ہوئے۔ شواجی نے ہلکے رسالے (light cavalry) کا استعمال کیا جنہیں پناہ گاہوں کے طور قلعوں کی مدد حاصل تھی اور بیجاپور کے حکمراں اور اس کے بعد مغلوں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ لیکن وہ دیہی اشرافی خاندانوں یا دیش مکھوں کی طاقت کو موثر طور پر ختم کرنے میں ناکام رہا۔ اس نے باغی دیش مکھوں کو سزا دی لیکن دوسروں کو اپنے مالگذاری انتظامیہ اور حکومت میں شامل کیا۔ وہ اس وقت محض سردیش مکھ (دیش مکھوں کے سربراہ) کے طور پر اپنی حیثیت کو تسلیم کرانا چاہ رہے تھے۔

آندرے ونک (André Wink) مراٹھا ریاست کی تشکیل میں 'فتنہ' کے کردار پر زور دیتا ہے۔ فتنہ ایک سیاسی میکانزم تھا

جس میں مراٹھاز میندار اور مغل طبقہ امراء علامتی اختلاف رائے (symbolic dissent) کی یکساں پالیسی پر عمل کرتے تھے۔ فتح کا عمل بنیادی طور پر فوجی کارروائی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ اسے بغاوت، اختلاف اور دشمن کی صفوں سے اپنے لیے وفاداریاں حاصل کرنے کے ذریعہ بد نظمی پیدا کر کے حاصل کیا جاتا تھا۔ فوجی قوت کا استعمال کم سے کم تھا۔ فتنہ سے مراد موجودہ مقامی سیاسی جھگڑوں یا مصالحانہ حرکتوں جیسے تحائف دینے اور حقوق عطا کرنے کے ذریعہ گروہ بندی پیدا کر کے فائدہ اٹھانا تھا۔ اقتدار کی ایک آزاد صوبائی بنیاد کے لیے جدوجہد کرتے مغل طبقہ امراء اور وسیع ہوتی ہوئی مراٹھا ریاست، دونوں ہی مقامی زمیندار طبقے کی وفاداریاں حاصل کرنے کی ہوڑ میں رہتے تھے اور مقامی لوگوں کی آپسی رقابتوں کا سیاسی فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔ لہٰذا ونک، مراٹھا طاقت اور اقتدار اعلیٰ کی توسیع کو مغل اقتدار کے تسلط کے خلاف بغاوت سے نہیں تعبیر کرتا بلکہ اسے خود مغل توسیع کا نتیجہ سمجھتا ہے۔

1.3.1 معیشت (Economy)

چت پاون (Chitpavan)، سرسوت (Saraswat) اور دیشستھ (Deshastha) جیسے برہمن گروہ، بیجاپور کی عادل شاہی انتظامیہ میں کافی نمایاں ہوئے۔ مراٹھا انتظامیہ میں خاص طور پر باجی راؤ کے پیشوا بننے کے بعد ان کی قوت میں کافی اضافہ ہوا۔ مراٹھا ریاست کو بینک کاری سہولیات اور مستقبل کی مالگذاری رسیدوں کے بدلے پیشگی رقم فراہم کر کے انہوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ پیشوا ایسے بہت سے مہاجن خاندانوں سے قرابت داری اور ازدواجی رشتوں کے ذریعہ وابستہ تھے۔ ضلع انتظامیہ کو مستحکم کرنے کے لیے پیشوا نے محصولات کی وصولی، جھگڑوں کے تصفیے اور زراعت کی ترقی کے لیے کام وشداروں (Kamvishdars) کی تقرری کی۔ وہ گاؤں اور پرگنہ سطح پر محاصل بندوبست اور وصولیابی کی دستاویزوں کا استعمال کرتے تھے۔ وہ رسدیا محاصل کے اگلے سال کی قسط (معاہدہ رقم کا ایک تہائی تا نصف) بھیجتے جس کے لیے پونا کے بینکنگ خاندانوں سے پیسہ حاصل کیا جاتا۔ بعد میں 2-1 فیصد ماہانہ سود کے ساتھ اصل رقم، کام ودشدار کے ضلع سے وصول کی جاتی تھی۔ کام وشدار کی تنخواہ رسد کا ایک چھوٹا سا حصہ تھی۔ چھوٹے چھاپہ مار ٹولے کو مراٹھا ریاست کی پیشہ ورانہ باقاعدہ فوج میں بدلنے کے لیے محکمہ مالیات کی تحویل میں زیادہ نقد کی ضرورت تھی تاکہ اتنی بڑی فوج کو خوراک اور رسد پہنچائی جاسکے۔ بینکنگ اور قرض کے قریبی تعاون کے ساتھ محصول انتظامیہ کے فروغ نے ریاست کو نقد اثاثے فراہم کیے۔

1.3.2 انتظامیہ (Administration)

علاقائی ریاستوں میں انتظامی مشینری جو کہ مغل ریاست کے زوال کے بعد ظہور میں آئی تھی، شکل اور ساخت کے اعتبار سے مغل انتظامیہ سے کافی ملتی جلتی تھی۔ تاہم، انتظامیہ کے بعض پہلوؤں کے لحاظ سے کافی واضح فرق بھی تھے۔ شواجی کے ذریعہ باضابطہ مقرر کیے گیے افسران جیسے پیشوا، مجومدار، سرنوبت، چتنس اور سرلشکر، ابتدائی بیجاپور اور احمد نگر کی انتظامیہ میں پہلے سے موجود تھے۔ ٹیکس وصولی کے میدان میں بھی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ شواجی آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے بندوبست پر انحصار کیا جس کی تکمیل 'ملک امبر کے بندوبست' میں ہوئی۔ فیصلے دینے کے لیے تنخواہ کی بنیاد پر مسلم قاضیوں کی تقرری بھی کی گئی۔ شواجی نے دیشکھ برہمنوں کی تقرری اپنی وسعت پذیر ذاتی

املاک کے کھاتوں کی دیکھ بھال کے لیے کی اور مرکزی افسر شاہی میں دکن سلطنت کے طور طریقوں کو اختیار کیا گیا۔ محصول انتظامیہ نمایاں طور پر مغلوں کے محصول انتظامیہ جیسا تھا۔ ٹیکسوں کا نام وہی تھے جو مغلوں کے ذریعہ استعمال کیا جاتا تھا۔ ٹیکسوں کی تشخیص مغل نمونے کی بنیاد پر کی جاتی تھی اور یہاں تک کہ ادائیگی بھی روایتی مہینوں میں کی جاتی تھی۔ دیہی پولیس افسروں کو فوجدار اور شہری پولیس افسروں کو کوتوال کہا جاتا تھا جو کہ عمل میں مغل اصطلاحات کے مشابہ تھا۔ تاہم مراٹھا نظام ریاست میں مغلوں جیسی عہدے اور ادائیگی کی متحدہ شہری اور فوجی ساخت نہیں تھی۔ چت پون، سرسوت اور دیشٹھ گروپوں جیسے برہمن ممتاز طبقے پر مرکزی افسر شاہی اور مقامی انتظامیہ کے کام انجام دیتے تھے۔ اس حیثیت میں انہیں کام وشدار کہا جاتا تھا جنہیں ٹیکس کی تشخیص اور وصولی کے وسیع اختیار حاصل تھے۔ وہ تنازعات کا فیصلہ کرتے اور مقامی صورت حال کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرتے اور ریکارڈ رکھتے تھے۔ بعد کے برطانوی ضلع کلکٹر کے عہدہ کو اس مراٹھا افسر کے نمونے پر مبنی عہدہ کہا جاسکتا ہے۔ انتظامیہ کا مغل نظام جو کہ محاصل اور پولیس سے متعلق کاموں پر مبنی تھا اسے مقامی سطح پر برقرار رکھا گیا۔ دیہی سطح پر برہمن کلکرنی حساب کتاب اور ریکارڈ رکھا کرتے تھے جبکہ غیر برہمن پاٹلوں کو قانونی اور پولیس سے متعلق اختیارات حاصل تھے۔ پرگنہ سطح پر دیش پانڈے اور دیش مکھ محاصل اور پولیس سے متعلق کاموں کو الگ الگ انجام دیتے تھے۔ پیشواؤں نے مالگذاری کے حصوں کی تقسیم نو کے ایک نئے نظام کو استعمال کیا جس کے تحت گاؤں یا اضلاع کی کل محصولات کو 3 تا 75 فیصد کے درمیان مختلف مال یا کسروں میں تقسیم کر لیا جاتا تھا۔ انہیں مختلف افراد کو الگ الگ تفویض یا منتقل کیا جاتا تھا۔

1.4 سکھ (The Sikhs)

پنجاب میں سکھوں یا سنگھوں نے قرابت داری تعلقات اور سکھ مذہبی عقیدے اور تعلیمات کے ترغیبی نظریات کا استعمال کرتے ہوئے مغلوں کے انتظامی ڈھانچے کو برخاست کر دیا۔ بندہ بہادر کی بغاوت (1709 تا 1714) پنجاب میں سکھوں کی بڑھتی عدوی قوت، ان کے پھیلتے مادی وسائل اور سماجی ادارے جیسے عوامی باورچی خانہ (لنگر)، گرودوارہ، تالاب، تخت اور سنگت (اجتماعی پوجا) کے قیام کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگرچہ بغاوت کو دبا دیا گیا لیکن اس سے سکھوں کی شناخت کو ٹھوس شکل دینے کی راہ ہموار ہوئی۔ 1770 کے دہے میں سنگھ رہنماؤں نے متعدد چھوٹی ریاستوں کی تشکیل میں سکھ شناخت کے تصور کو استعمال کیا۔ انہوں نے ایک نئے ادارہ جاتی ڈھانچے کو ترقی دی جو کہ راکھی (rakhi)، مثل (dal-khalsa)، دل خالصہ اور گرومت (gurmat) پر مرکوز تھا۔ سنگھ رہنماؤں نے تمام بیرونی لوگوں بشمول مغل عہدیداران کے خلاف کاشتکاروں کو تحفظ یا راکھی فراہم کرنے کی ذمہ داری اٹھائی جس کے بدلے میں انہوں نے صرف پیداوار کے پانچویں حصے پر دعویٰ کیا۔ انہوں نے ایک ساتھ حملوں اور دفاع اور علاقائی حصول کے لیے وسائل اکٹھا کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے مربوط سلسلوں (مثل) کی بنیاد کے طور پر رشتے داری تعلقات کا استعمال کیا۔ ایک منتخب رہنما کے ماتحت مل جل کر کام کرتے ہوتے مثلوں (Mists) کی ایک بڑی تعداد کے اتحاد نے دل خالصہ کی تشکیل کی۔ اس کے علاوہ سنگھوں کے کھلے اجلاس ہوتے تھے جس میں قراردادیں پاس کی جاتی تھیں اس سے عام اتفاق رائے کا پتہ چلتا ہے۔ گرو کی ان قراردادوں کو گرومت کے طور پر جانا جاتا تھا جو کہ اتحاد کی بنیاد تھے۔

سکھ ریاستوں میں جو کہ 1760 کے دہے اور 1770 کے دہے میں ابھری تھیں مغل سلطنت کا انتظامی ڈھانچہ قائم رہا۔ دیوانوں، تھانیداروں اور کارداروں کی تقرری کی گئی اور انہیں جاگیروں کے عطیات کے ذریعہ ادائیگی کی گئی۔ مقامی سطح پر محصولات کے انتظامیہ میں چودھری، مقدم، قانون گو اور پٹواریوں کے ذریعہ ان کے معمول کے مطابق کاموں کو انجام دینا جاری رہا۔ عدلیہ میں بھی قاضیوں کی بہت سی پرانی عدالتوں کو قائم رکھا گیا، اگرچہ زیادہ اہمیت پنچایتوں سے وابستہ کی گئیں۔ ان ریاستوں میں حکمراں طبقے کی اکثریت سنگھوں (سرداروں) پر مشتمل تھی، لیکن بہت سے غیر سکھ بھی انتظامیہ سے وابستہ تھے، جس سے سماجی حرکت پذیری کا اظہار ہوتا ہے اور ماضی کے ساتھ ادارہ جاتی تسلسل کا پتہ چلتا ہے۔ جب یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں ابتدائی انیسویں صدی میں سوکر چاکیا مسل کی رنجیت سنگھ کی سکھ ریاست میں مدغم ہوئیں تو انتظامی ڈھانچے میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی۔ 'کرداروں' کو اپنے کام انجام دینے میں کچھ مقامی چودھریوں، مقدموں، قانون گوؤں اور پٹواریوں سے مدد ملتی تھی اور یہ عہدہ مغل عاملوں سے مشابہ تھا۔

1.5 بنگال (Bengal)

مرشد قلی خاں 1700 سے بنگال کا دیوان تھا۔ اسے 1717 میں بنگال کی صوبیداری اور 1717 تا 1727 تک ناظم اور دیوان کا متحدہ عہدہ دیا گیا۔ وہ بنگال سے جگت سیٹھ (مارواڑی بینکر) کی ہنڈیوں (Bills of Exchange) کے ذریعہ تقریباً 1 کروڑ روپے سالانہ خراج بھیجتا رہا۔ مرشد قلی خاں نے مغل منصب داروں کی بہت سی جاگیریں بنگال سے اڑیسہ میں منتقل کیں۔ علی وردی خان ایک کامیاب انقلاب کی سازش رچ کر طاقت کے ذریعہ بنگال کا نواب بن بیٹھا۔ وہ بنگال کے لیے آزاد حیثیت حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہا۔ اس کے عہد حکومت میں بنگال کے وسائل، شاہی جاگیروں کی شکل میں دیے جانے بند ہو گئے اور مغل خزانے کو خراج کی ادائیگی میں کمی آگئی۔ 1743 اور 1758 کے درمیان صرف 50-40 لاکھ خراج کے طور پر بھیجے گئے تھے۔ علی وردی کے پاس ناظم اور دیوان کا متحدہ عہدہ ذاتی طور پر موجود تھا اور اس نے بہار اور اڑیسہ میں اپنے نائبین مقرر کیے، اگرچہ بعد میں اس نے بادشاہ سے رسمی منظوری حاصل کر لی تھی۔ اس نے اپنی ایک آزاد مستقل فوج بھی قائم کی۔

بنگال میں اگرچہ مغل افواج نے 17 ویں صدی کی ابتداء میں بارہ باغی سرداروں کو زیر کر لیا تھا، بنگال کا نسبتاً صرف چھوٹا سا حصہ جاگیروں کی حیثیت سے منصب داروں کو تفویض کیا گیا تھا۔ بنگال میں جاگیر کا تناسب سلطنت کے باقی حصوں میں جاگیروں کے طور پر تفویض کیے گئے محاصل کے 4/5 ویں کے مقابلے ایک تہائی تھا۔ موروثی سردار اور زمیندار جو اپنے ذاتی تعلقات پر مبنی اقتدار سے استفادہ کرتے تھے، دو تہائی تک محصولات وصول کرتے تھے۔ مرشد قلی خاں جس نے بنگال صوبہ کے خود مختاری کے عمل کی شروعات کی تھی، اس نے مغل منصب داروں کی طاقت پر بندش لگائی اور بعض زمینداروں کی طاقت کو مستحکم کیا۔ اس نے اپنی جاگیروں کو اڑیسہ منتقل کیا اور خود بادشاہ نے 1712 کے بعد شاہی منصب داروں کو بنگال بھیجنا بند کر دیا۔ اگرچہ مرشد قلی خاں نے ان زمینداروں کے ساتھ سختی کا رویہ اپنایا جو اپنی واجبات کو ادا کرنے میں ناکام تھے، تو دوسری طرف اس نے ان زمینداروں کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں فتح، خریداری اور تبادلہ کے ذریعہ

چھوٹی زمینداریوں کو جذب کرنے اور دیگر زمینوں کے تصرف کی منظوری دی جو اپنے واجبات کو تیزی سے ادا کرتے تھے۔ اس کام میں مغربی بنگال کو نمایاں کامیابی ملی۔ مرشد کے دور حکومت کے آخر میں 60 فیصد جمع (تشخیص شدہ محاصل) 15 بڑے زمینداروں سے حاصل ہوا۔ مالگزاری وصول کرنے کے حقوق کے ساتھ ان کے پاس بھی نمایاں عدالتی اور انتظامی ذمہ داریاں تھیں۔ بڑی زمینداریوں (13,000 مربع میل کے رقبے کے ساتھ راج شاہی زمینداری اور بردوان زمینداری جس میں 30,000 رضاکار فوجی ملازمت میں تھے) کو عہدیداروں کی ایک درجہ بندی کی ضرورت ہوتی تھی جو نیچے گاؤں کی سطح تک پہنچتی تھی۔ بہت سے معاملوں میں زمینداریوں کا ایک حصہ مالگزاری وصول کرنے والے ٹھیکیداروں یا اجارہ داروں کو ایک متعین رقم کے لیے دیا جاتا تھا۔ مرشد قلی خاں نے نئے سرے سے زمینداریوں کی جو ساخت قائم کی تھی وہ صرف 'نوابی' دور تک ہی جاری نہیں رہی بلکہ 'کمپنی' کے دور حکومت میں بھی برقرار رہی۔ ان بڑے زمینداروں کی تائید بنگال کے نظام حکومت کی خاص بنیاد تھی۔ دکن میں مراٹھوں جنوب میں پولی گاروں اور شمال میں جاٹوں کے برعکس بنگال کے زمینداروں کے پاس 'لگان' کی زبردست آمدنی اور سرپرستی کے باوجود خاص فوجی استعداد نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے اختیار میں مستقل اضافہ کیا اور نوابی ریاست کے تئیں وفادار بھی نہیں رہے۔ مثال کے لیے 1757 میں انگریزوں کے خلاف سراج الدولہ کے دفاع میں ان میں سے کوئی نہیں آیا۔

1.5.1 معیشت (Economy)

بنگال کے نوابوں کا مالگذاری نظام نہ صرف فاضل پیداوار کے لیے زراعت کی صلاحیت پر بلکہ زرعی اشیاء کے لیے ایک بازار اور تجارت کی روانی پر بھی منحصر تھا جس سے کہ دیہی علاقوں میں وصول کیے گئے نقد کو ان علاقوں میں لے جایا جاسکا جہاں کہ ریاست ان کی ضرورت تھی۔ متعدد سطحوں پر قرضوں کی دستیابی کے ذریعہ اسے تقویت دی گئی۔ نگر سیٹھ، زمینداروں اور نوابوں کو ترسیل زر اور پیشگی کی شکل میں قرض فراہم کرتے تھے۔

1.5.2 انتظامیہ (Administration)

نوابوں کے دور حکومت میں بنگال کے انتظامی اور مالگذاری انتظامیہ میں عملاً کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ امن وامان کا قیام اور دیگر انتظامی کاموں کی ذمہ داری سرکاری سطح پر فوجداروں اور پرگنہ سطح پر شقداروں کے ذریعہ انجام دی جاتی رہیں۔ ان عہدیداروں کو مجسٹریٹ اختیارات یافتہ کوتوالوں اور قاضیوں کی مدد ملتی تھی۔ قانون گوؤں کا موروثی طبقہ ریکارڈ رکھنے کے کاموں میں اہم کردار نبھاتا رہا۔ تاہم وسطی اور مغربی بنگال میں مغل فوجداری انتظامیہ تقریباً ختم ہی ہو چکا تھا کیوں کہ یہاں پر طاقتور مقامی زمینداروں نے محاصل وصول کرنے کے حقوق کے ساتھ ساتھ کافی حد تک عدالتی اور انتظامی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ متسدی (Mutaseddis) کے طور پر جانے جانے والے ہندو منتظمین (جو نواب کی املاک یا عاملوں یا مقامی دیوانوں کے طور پر خالصہ زمینوں کے انتظام و دیکھ بھال کرتے تھے) عام طور پر مرکزی خزانے میں کام کرتے تھے۔ دیگر علاقوں میں بڑے زمیندار اور اجارہ دار جن کے پیچھے بینک کاروں کی ضمانتیں تھیں وہ محاصل وصول کرنے کی بڑی ایجنسی بن گئے

1.6 اودھ (Oudh)

سادات خاں برہان الملک جو 1722 میں اودھ کا صوبیدار مقرر ہوا اس نے اودھ کے لیے خود مختاری حاصل کرنے کے عمل کی شروعات کی۔ اس نے اپنے داماد صفدر جنگ کو نائب صوبیدار مقرر کیا۔ اودھ کے علاقے میں متعدد سرکش اور باغی سرداروں، راجاؤں اور زمینداروں جیسے لکھنو کے شیخ زادوں، تلوئی کے راجا، غازی پور کے طاقتور زمیندار بھگوت سنگھ کھچر اور اشوتھر اور چندیل راجپوتوں کو زیر کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک پنجابی کھتری تاجر آتمارام کو اپنا دیوان مقرر کیا۔ تاہم اس نے دشمنوں کے خلاف مغلوں کو مدد دینا جاری رکھا اور 1737 میں مراٹھا سردار ملہار راؤ ہولکر کی فوج کی پسپائی میں اہم کردار نبھایا۔ نادر شاہ کے حملے کے دوران 50,000 فوجیوں کے دستے کے ساتھ مغلوں کی ڈھال بن کر سامنے آیا۔ جب سادات خاں نادر شاہ کے فوجیوں کا سامنا کرنے کے لیے آگے بڑھا تب اودھ کے خزانے سے تقریباً 2 کروڑ روپے خرچ کیے گئے تھے۔ بعد میں اس نے مغل بادشاہ اور نادر شاہ کے درمیان صلح کروائی۔

صفدر جنگ نے مزید 2 کروڑ روپے کی رقم، اودھ کی صوبیداری برقرار رکھنے کے لیے پیشکش (نذرانہ) کے طور پر مغل بادشاہ کو بھیجی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاہی خزانے میں باقاعدہ محصول بھیجنا، سادات خان کی حکومت میں روک دیا گیا ہوگا۔ اس نے باقاعدہ راجدھانی تعمیر نہیں کروائی لیکن ایودھیا کے قریب اپنے فوجوں کی ایک عارضی چھاونی میں قیام کرتا رہا۔ صفدر جنگ کے دور حکومت (54-1739) میں اودھ کے ذریعہ خود مختاری حاصل کرنے کی کوشش میں مزید تیزی پیدا ہوئی۔ اس نے مراٹھوں کے حملے کے دوران بنگال کے نواب علی وردی خان کی مدد کی۔ اسے مغل بادشاہ کی طرف سے 1743 میں میر آتش یعنی توپخانے کے سربراہ بنایا گیا اور کشمیر کی صوبیداری عطا کی گئی۔ 1748 میں اسے اجمیر کی صوبیداری دی گئی۔ اس نے افغان روہیلہ سردار بنگش نواب سے فرخ آباد کے آس پاس 33 پرگنے بھی حاصل کیے۔ صفدر جنگ بادشاہ کو صرف رسمی تحائف بھیجے اور پوری محصولات کو اپنی مرضی کے حساب سے استعمال کرتا تھا۔ صفدر جنگ کے بعد شجاع الدولہ (1775 تا 1754) نے اپنی صوبیداری کی توثیق مغل بادشاہ عالم گیر II سے کروائی لیکن عہدے داروں کی تقرری اس نے خود ہی کی۔ یہ عام مغل روایت سے انحراف کی علامت تھی۔ اس نے دہلی دربار کے بغیر کسی حوالے کے سفارتی اتحاد اور رشتے قائم کیے۔ تاہم، جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں ایک نئی طاقت نے مغل بادشاہ شاہ عالم، میر قاسم (بنگال کے نواب) اور شجاع الدولہ (اودھ کے نواب) کی متحدہ فوج کو 1764 میں بکسر میں شکست دی۔ اس کے بعد اودھ کی خود مختار حیثیت کا زوال شروع ہو گیا۔ 1768 میں اودھ کی فوج 10,000 تک اور زیادہ سے زیادہ 35,000 تک محدود رکھنے اور برطانوی افواج کی تربیت یافتہ اور ڈسپلن یافتہ فوج رکھنے کا تصفیہ ہوا جس سے فوجی معاملوں میں اودھ کے عملی اقتدار اعلیٰ کو محدود ہونا پڑا۔

اودھ میں جاگیر دار اور اجارہ داروں (محاصل کاشتکاروں) جیسے بہت سے زمرے تھے۔ مغل منصب داری نظام ختم کر دیا گیا اور سرکاری فوجی خدمات کے بدلے میں تنخواہ یا ادائیگی (جاگیروں کی شکل میں) کی جاتی تھی۔ اودھ کے نوابوں نے زمینداروں کی شورش کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن ایک نیا مقامی زمیندار طبقہ ابھر آیا۔ جن کا ابتدائی عمل فوجی خدمات نہیں بلکہ مالگزاری انتظامیہ کی دیکھ بھال تھا۔ اودھ

میں زیادہ تر زمینوں کو 1 سے 3 سال تک کے وصولی کے حقوق کے ساتھ نئے زمین دار طبقے کو تفویض کیا گیا۔ انہیں عامل کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔ حالانکہ عامل تنخواہ یافتہ تھے اور سابقہ مغل نظام میں مالگزاری کے منتظم رہے تھے لیکن اودھ کے نوابوں کے تحت وہ خزانے کو ایک مقررہ رقم ادا کرنے کے بدلے اجارہ، کرایہ یا ٹھیکے کے لیے بولی لگا سکتے تھے۔ دہلی کے سلطان مالگزاری وصول کرنے کے لیے اجارہ داری کے اسی طریقے کا استعمال کرتے تھے۔ شیر شاہ اور اکبر نے اسے ترک کر دیا تھا لیکن جہانگیر کے دور حکومت میں اسے پھر بحال کر دیا گیا تھا۔ 17 ویں اور 18 ویں صدی میں یہ طریقہ خوب اپنایا گیا اور کمپنی کے منتظمین کے ذریعہ بھی ابتدائی طور پر اس کا استعمال کیا گیا تھا۔ حالانکہ وقت کے ساتھ ساتھ اجارہ داروں میں اجارہ کو موروثی جائیداد بنانے کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔

1.6.1 معیشت (Economy)

1725 کے دہے کے درمیان اودھ میں دیوانی کے عہدے کو موثر طور پر ختم کر دیا گیا۔ ایک پنجابی کھتری تاجر، آتمارام نے مغل دربار سے علیحدہ طور پر اودھ میں مالگذاری بندوبست کیا۔ اس کے بیٹوں اور پوتوں نے بعد میں آنے والے نوابوں کے دیوان کی حیثیت اسے جاری رکھا۔ نقد لین دین کے تعلقات نے فوجی تنظیم کی نوعیت کو بھی تبدیل کر دیا۔ اودھ کی فوج کی ابتدائی پدری وراثتی، ذاتی اور نیم غیر رسمی درجہ بندی نے بھاڑے کے فوجیوں کی راہ ہموار کی۔ اودھ میں امانی (amani) کلکٹر کے مغل نظام جس میں وہ تنخواہ اور بھتہ وغیرہ کے علاوہ پوری مالگذاری بھیجتا تھا، کی جگہ اجارہ داری کے وسیع تر نظام نے لے لی جس پر مستاجروں یا ٹھیکے داروں کا غلبہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فاضل دولت نواب اور اس کے لواحقین تک محدود نہیں تھی۔ مقامی سرپرستی جال کے ذریعہ اس کی تقسیم ہوتی تھی اور بڑے پیمانے پر مستاجروں (اجارہ داروں) یا محاصل کاشتکاروں کے ذریعے اسے قابو کیا جاتا تھا۔

1.6.2 انتظامیہ (Administration)

مغلوں کی نئی جانشین ریاستوں کے عملی اقتدار اعلیٰ کے غیر مرکزی ڈھانچے میں مستاجروں یا اجارہ داروں جیسے مقامی اور علاقائی اشرافیہ طبقے کو شامل کر لیا گیا۔ اودھ میں انہیں عامل ہی کہا جاتا رہا لیکن یہ محاصل وصول کرنے والے منتظم نہیں تھے جیسا کہ کبھی مغلوں کے ماتحت ہوا کرتے تھے، بلکہ یہ غیر تنخواہ یافتہ تھے۔ اودھ ریاست میں منصب داری کے عددی نظام کو قائم رکھا گیا لیکن اب یہ آمدنی اور فوجی فرائض کی علامت نہیں رہا۔ فوجی تنظیم پدر واثتی، ذاتی اور نیم غیر رسمی گروپ پر ہی مبنی رہی۔ یہ فطرتاً ٹکڑوں میں بنٹی ہوئی تھی یعنی قسم قسم کے دستوں پر مشتمل تھی جو مختلف کمانڈروں کے ذریعہ مہیا کیے جاتے تھے اور اپنے قریبی آقاؤں سے ذاتی وفاداری رکھتے تھے۔ کوئی متحدہ کمان نہیں تھی اور فوج مختلف فوجی رہنماؤں کے ماتحت کرائے کے فوجیوں کی مختلف النوع اکائیوں پر مشتمل تھی۔ اودھ کے نوابوں نے فوجی اور انتظامی عہدوں پر ہندوؤں کی تقرری کی پالیسی (جسے مغلوں کے دور میں شروع کیا گیا تھا) جاری ہی نہیں رکھی بلکہ اس میں مزید توسیع کی۔

1.7 حیدرآباد اور میسور (Hyderabad, and Mysore)

حیدرآباد کی ریاست 1724 کے بعد ایک خود مختار طاقت کے طور پر ابھری۔ نظام الملک آصف جاہ نے دکن پر اپنا تسلط مستحکم کیا

اور 1720 تا 22 کے دوران (سید برادران کے زوال کے بعد) دکن کی اپنی صوبیداری کی تمام مخالفت کو کچل دیا۔ وہ 24 تا 1722 سلطنت کا وزیر تھا لیکن دکن واپس آ گیا اور ایک آزاد حکمراں کے طور پر کام کرنا شروع کیا۔ اس نے بادشاہ کے حوالے کے بغیر کئی جنگیں لڑیں، معاہدے کیے، خطبات سے نوازا، جاگیریں دیں اور تقرریاں کیں۔ مثال کے لیے مراٹھا سردار باجی راؤ کے ذریعہ پال کھیڈ (1728) میں اپنی شکست کے بعد اس نے منگی شیو گاؤں (Mungi-Shevgaon) میں ایک معاہدہ انجام دیا جس کے تحت اس نے مغل بادشاہ سے بغیر کوئی منظوری حاصل کیے ہوئے دکن میں مراٹھا حقوق کو تسلیم کیا۔ بعد کے نظاموں نے مغل بادشاہوں سے اپنی تخت نشینی کی توثیق اور خلعت حاصل کرنا جاری رکھی۔ انہوں نے بادشاہ کے تئیں رسمی ماتحتی کو بھی جاری رکھا اور بادشاہ کے نام پر سکے بھی جاری کیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے قرمزی رنگ کی چھتری استعمال کرنے سے احتراز کیا جو کہ شاہی اقتدار کی علامت تھی۔ لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نظام الملک نے اپنی عملداری کا ذکر ایک ریاست کے طور پر نہ کہ مغلوں کے ایک صوبے کے طور کیا ہے۔

میسور میں، حیدر علی (1761 تا 1782) نے بہت سے سرکش پولیگاروں (جنگجو زمیندار طبقہ) کو مغلوب کیا۔ انہیں بہر حال ہٹایا نہیں گیا۔ واجبات باقاعدگی کے ساتھ ادا کرنے کے ان کے اقرار اور اتفاق کے بعد ان کی جائیدادوں کی عام طور پر توثیق کر دی گئی۔ اس نے زیادہ سے زیادہ بولی لگانے والوں یا نئے زمیندار بارسوخ طبقے کو مالگزاریوں کی تفویض کا طریقہ استعمال کیا جو کافی بڑے علاقوں میں مالکانہ حقوق حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ درج بالا بیان مقامی طاقتور طبقے کے ذریعہ اپنے علاقوں میں اپنی مضبوطی کو مستحکم کرنے اور شاہی اقتدار کے ذریعہ منظوری حاصل کرنے یا محاصل کے کچھ مخصوص حصے کی ادائیگی کے وعدے پر شاہی حکمرانوں کے ذریعہ انہیں اختیار دیے جانے جیسے اعزازات حاصل کرنے کے دوطرفہ عمل کو ظاہر کرتا ہے۔

1.7.1 انتظامیہ (Administration)

18 ویں صدی کے حیدر آباد میں مالگذاری عطیہ کی تفویض موروثی بنیاد پر کی جانے لگی۔ اس سے زیادہ منظم زمیندار طبقہ پیدا ہوا جو حیدر آباد میں اپنے نمائندوں کے ذریعے اپنی محاصل اور فوجی ذمہ داریوں کو لے کر ریاست سے سودے بازی کرتا تھا۔ حیدر آباد میں نظام الملک نے انتظامیہ کی مغل شکل پرگنہ سطح تک قائم رکھی۔ اس انتظامی ڈھانچے میں بہر حال بعد کے نظاموں کے ذریعے ترمیم کی گئی۔ مقامی ہندو زمینداروں کا موثر طور پر مقابلہ کرنے کے لیے تعلقہ داروں کے ماتحت اجارہ داری کی شروعات کی گئی۔

میسور حکمرانوں کے محاصل لین دین میں بڑے پیمانے پر سودی کاروبار کا دخل تھا۔ محصولات کی تفویض اونچی بولی لگانے والوں کو کی جاتی تھیں۔ عامل دار (Amildars) ساہوکاروں سے حاصل ہنڈی کے ذریعہ انہیں بھیجتے تھے جو اس طرح قرض سہولیات فراہم کرنے کے لیے منافع اور سود کے ساتھ محصولات پر اختیار حاصل کر لیتے تھے۔ یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ سرنگاپٹنم صرف 50 فیصد محصولات پہنچتا تھا۔ بینک کاروں کے منافع کے علاوہ وصولی لاگت یا سب بندی (sibbandi) کے طور پر عہدیداروں کے ذریعہ کل وصولی کا تقریباً 10 فیصد لے لیا جاتا تھا۔

کرناٹک کے نواب کے دور حکومت میں اور میسور کے حکمرانوں کے تحت ہندو فوجی کمانڈروں یا پولیگاروں نے مغل شان و شوکت کی علامت والے خطابات اختیار کیے جب کہ مغل قاضی، کوتوال، مفتی، عاملوں یا عملداروں کی تقرری مغل نمونوں پر کی گئی۔ جنوبی ریاستوں نے مقامی ہندو حکمرانوں کے بعض انتظامی کارکنان یا عہدیداروں کے نام اختیار کیے۔ مثال کے طور پر ان کے متعلقہ گاؤں کے انتظامی سربراہوں کے طور پر گاؤں پٹیلوں کو اور محاسبوں کے طور پر شان بوگوں (shanbogs) کو اور بارہ آیگاروں (ayagars) کی روایتی تنظیم کے عناصر کو قائم رکھا۔ ایک ایم (ayyam) کا مطلب آمدنی ہے اور اس لیے یہ گاؤں کی آمدنی میں بارہ حصوں کی وضاحت کرتا ہے۔ اسے بارہ بلوتی (barabaluti) کے طور پر بھی جانا جاتا تھا۔ یعنی خصوصی خدمات کی ادائیگی کے لیے گاؤں کی آمدنی کے ذریعہ معاش کے حصوں کو ظاہر کرنے والا نظام۔

1.8 اٹھارویں صدی کی ریاستوں کی معاشی بنیاد

(Economic Foundation of the 18th Century States)

18ویں صدی میں نئی علاقائی ریاستوں کے قیام کے ساتھ ساتھ تجارتی منتظم کاروں (ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں) کا ظہور ہوا۔ خاص طور پر وہ جنہیں محاصل کاشتکار (Revenue Farmers) کہا جاتا تھا۔ قدیم طبقہ امراء اور اکثر و بیشتر مقامی شہزادوں کے ساتھ ان کے تعلقات تھے۔ حکمرانوں کے ساتھ ان کے رشتے معاہدے پر مبنی اور مالگذاری سے متعلق نوعیت کے ہوتے تھے کیونکہ ان پر وفاداری یا فوجی شعار یا اخلاقیات کی کوئی بندش نہیں تھی۔ روایتی ہندو کاروباری ذاتوں اور جینیوں میں اکثر ایسے تاجر ہوا کرتے تھے جو حکمرانوں اور امراء کو رقم ادھار دیا کرتے تھے۔ وہ ہندوستان کی پونجی بازاروں کے محور تھے اور ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں اپنی ہنڈیوں یا ساکھ کے رقعہ (Credit Notes) کے ذریعہ زر منتقل کرتے تھے۔ اس طرح کاروبار اور تجارت کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ تاہم زر کا استعمال سماجی تقاضوں اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے زیادہ ہوتا تھا۔ ان نئی ریاستوں میں حیثیتوں اور عہدوں کو اکثر پٹے یا اجارہ داری پر اور ذیلی ٹھیکے پر دیا جاتا تھا۔ یہ تاجر اور بینک کار محاصلی کاشتکاروں کو ان کی اراضی کی ضمانت پر پیشگیاں فراہم کرتے تھے اور 18ویں صدی میں ریاست کی تشکیل میں اہم سیاسی گروپ بندی وضع کر رہے تھے۔

1.9 خود مختاری کے اظہار کے طریقہ کار (Methods of Declaration of Autonomy)

علاقائی سطح پر بغاوت یا سرکشی کے ذریعہ مقتدر اعلیٰ حیثیت حاصل کرنے کی کوشش کے طور پر سماجی اور سیاسی طاقتوں کی جو تشکیل ہوئی وہ تقریباً سبھی خطوں میں ایک جیسی تھی۔ یہ طاقتیں، محاصل کاشتکار، تاجر، اہل قلم خاندان اور مقامی زمیندار لوگ تھے۔ کچھ علاقوں جیسے مغلوں کے سابقہ صوبوں یعنی بنگال، اودھ اور حیدر آباد میں آہستہ آہستہ تبدیلی واقع ہوئی اور یہ خود مختار ریاستیں بن گئیں۔ رچرڈ بی۔ ہارنیٹ (Richard B. Barnett) نے ان جانشین ریاستوں میں خود مختاری کی جانب بڑھتے اقدامات کی خاکہ کشی کی ہے۔ یہ اقدامات مندرجہ ذیل ہیں:

1. صوبے کے اعلیٰ ترین فوجی افسر کے طور پر صوبیدار یا ناظم نے اپنے خود کے دیوان یا مالگذاری افسران نامزد کرنے یا مکمل طور پر اس کی تقرری کی اہلیت حاصل کرلی۔ اس طرح شاہی مرکز سے سلطنت کے علاقوں تک طاقت کی منتقلی میں تیزی پیدا ہوئی۔
2. ابتدائی مراحل میں بادشاہ کی توثیق کو ملتوی رکھ کر، صوبیداروں کے ذریعہ اپنے خود کے جانشینوں کی تقرری کی گئی۔
3. محصولات روک لینا، جو پہلے مرکزی خزانے کو بھیجے جاتے تھا اب علاقے کے اندر ہی استعمال ہونے لگے۔ ان صوبوں سے ہونے والی مرکزی آمدنی زیادہ سے زیادہ رسمی تحائف اور کبھی کبھار تعاون کی شکل تک محدود رہ گئی۔
4. صوبیداروں کے ذریعہ آزادانہ سفارتی اور فوجی سرگرمیاں انجام دیں گئیں۔
5. علاقائی حکمراں خاندانوں نے اپنی رہائش مغل دربار کے قریب اختیار کرنے کے بجائے صوبائی راجدھانیوں میں قیام کرنا پسند کیا۔
6. سکوں کی ڈھلائی، کم سے کم سلطنت کے چاندی کے روپیوں کا ڈھالنا اگرچہ کم عام نہیں تھا لیکن علاقائی حکمراں زیادہ تر رسمی سونے کی مہریں ڈھالتے تھے۔
7. آزادی کا حتمی علامتی اعلانیہ، جمعہ کی اجتماعی نماز اور جامع مسجدوں کے خطبے میں علاقائی حکمراں کے نام کا خطبہ دیا جانے لگا۔

پہلے پانچ اقدامات مغل سلطنت کی تقریباً سبھی جانشین ریاستوں کے ذریعہ اٹھائے گئے۔ تاہم ان ریاستوں نے آخری دو اقدامات نہیں اختیار کیے۔ اس طرح آخر کار شاہی نظام کا علامتی اقتدار حتی کہ اس کے زوال کے بعد بھی باقی رہا۔

1.10 اقتدار کو جواز مہیا کرنا (Legitimisation of Authority)

اس طرح ہم نے دیکھا کہ کس طرح 18ویں صدی کی نئی ریاستیں بغاوت کے ذریعہ یا مرکزی اقتدار کی طاقت کو غصب کر لینے کے ذریعہ وجود میں آئیں اور اس طرح آزاد مقتدر اعلیٰ ریاستیں قائم ہوئیں۔ ریاست کی تشکیل کا عمل جو بھی رہا ہو یہ اہم تھا کہ اس کا جواز حاصل کیا جائے اور ان کی حکمرانی کو برحق ثابت کیا جائے۔ اسٹیورٹ گورڈن (Stewart Gordon) تین طریقے بیان کرتے ہیں جن کا استعمال ان حکمرانوں کے ذریعہ اپنی حکومت کو جائز ٹھہرانے اور اقتدار قائم کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔

- حکمراں لوگوں کا محافظ ہونا چاہیے، جس میں عوامی نظم وضبط قائم کرنے اور بیرونی حملے کو روکنے کی صلاحیت ہونی چاہئے۔
- ایک حکمراں کو درباری آداب ورسوم سے واقفیت، بہادری، مسلح تربیت، گروہی تنازعات کا تصفیہ کرنے کی اہلیت جیسی خوبیوں کا مالک ہونا چاہیے۔
- کسی مضبوط طاقت سے اسے 'سند' حاصل ہونی چاہیے۔

ان عناصر کے علاوہ، دیگر اہم جواز مہیا کرنے والی قوتوں میں، اس زمانے کے مذہبی نظریات، ریاست کی ساخت میں مقامی طاقتور طبقے کی شمولیت، ثقافتی عمل میں مطابقت کا استعمال اور زراعت اور تجارت کی توسیع شامل ہے۔ اگرچہ مراٹھوں اور سکھوں دونوں نے مغل حکمرانی کی مخالفت کی روایت اپنائی لیکن سکھوں نے اپنی نظریاتی سند گرو گرنتھ صاحب سے اخذ کی اور مراٹھوں نے بعض ماہرین کے مطابق

'برہمنوں، مقدس مویشی اور مقدس عبادت خانوں کے تحفظ پر مبنی [ایک طرح کی] ہندو حکومت' کو فروغ دیا۔ تاہم ہم پاتے ہیں کہ انہوں نے خود کو مغل بادشاہ کے نمائندوں کے طور پر ظاہر کیا اور ٹیپو سلطان کے علاوہ کسی حکمراں نے سلطان کا خطاب نہیں اختیار کیا۔ جب باجی راؤ اول کے ماتحت مراٹھوں نے مالوہ میں اپنے حقوق کو تسلیم کرانا چاہا تب محمد شاہ کے 1741 کے فرمان میں اسے محض نائب صوبیدار کا لقب دیا گیا تھا، ساتھ ہی اس کے تحت بادشاہ کو رسمی تحائف ادا کرنے کے فریضے کے علاوہ مالوہ میں مغل بادشاہ کے ذریعہ منظور شدہ مالگذاری سے متشنیٰ املاک برقرار رکھنے کی شرط لگائی گئی۔ تاہم ایلفنسٹون (Elphinstone) نے اپنی *History of India* میں مراٹھوں کو ایک 'قوم' (Nation) اور شواجی کی سرگرمیوں کو 'آزادی کی جنگ' بیان کیا تھا اور یہی خیال ایم۔ جی۔ راناڈے کی *Rise of Maratha Power* میں دہرایا گیا۔ حالانکہ دیگر دانشوروں کے مطابق مراٹھوں نے دکن میں صرف اپنے زمینداری حقوق یعنی سردیش مکھی وصول کرنے پر اصرار کیا تھا۔ کچھ ماہرین، بھکتی تحریک کو، جس میں خدا سے محبت، رسومات اور تیرتھ یاتراؤں میں ذات پات کی پابندی کو مسترد کرنے پر زور دیا گیا تھا، مراٹھا ریاست کی نظریاتی بنیاد کے طور پر مانتے ہیں۔ تاہم حقیقی طور پر برہمنی روایات کے لیے ایک خطرہ ثابت ہوا اور اس نے مسلم حکمرانی کے تئیں مزاحمت کی تبلیغ نہیں تھی۔ مراٹھا حکمراں طبقے نے پنڈارپور جیسے مندروں کی سرپرستی کی۔ شیواجی نے رواداری اور میل جول (مختلف عقائد کے درمیان ہم آہنگی) کی پالیسی اپنائی اور ہندو حکمرانوں جیسے کرناٹک کے نائکوں کے خلاف گولکنڈہ اور بیجاپور کی مسلم ریاستوں کے ساتھ اتحاد قائم کیا۔ شیواجی نے اپنے اقتدار کو برہمنوں کی منظوری اور طاقتور دیش مکھ خاندانوں سے توثیق حاصل کرنے کے ذریعہ جائز قرار دینے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی تاجپوشی نے ایک مسئلہ کھڑا کیا کیونکہ مقامی برہمن اس کی تاجپوشی اور اسے کشتریہ کے طور پر تسلیم کرنا نہیں چاہ رہے تھے۔ آخر کار بنارس کے گنگا بھٹ نام کے ایک مراٹھی برہمن نے راجپوتوں سے اس کے سلسلہ نسب کو ملایا اور اس کا شجرہ نسب تیار کیا اور تاجپوشی کے رسوم انجام دیے۔

مغل اقتدار اعلیٰ کی رسمی قبولیت کے باوجود نسل، مذہب یا ذات کی تفریق کے بغیر طاقتور مقامی اعلیٰ طبقہ کی شمولیت اور مالی مفادات، علاقائی ریاستوں اور ان کے عملی اقتدار اعلیٰ کے لیے ایک اور مضبوط ستون تھے۔ اودھ کے نوابوں نے ہندوؤں کو ممتاز فوجی اور انتظامی عہدوں سے نوازا۔ اودھ کی فوج میں طاقتور جنرلوں میں گوسائیں راہب (Gosain Monks)، ناگا سنیاسیوں کے رہنما اور شیوائت فرقے کے جنگجو شامل تھے جن کی شاندار حکمت عملی پر مبنی حرکت پذیری نے انہیں نوابوں کے لیے انتہائی اہم بنا دیا۔

اودھ میں بہت سے طاقتور اجارہ دار یا مستاجر، طاقتور پنجابی کھتری خاندانوں اور مقامی ہندو زمینداروں اور تاجروں سے آئے تھے۔ اودھ کی فوج کی دوسری منفرد خصوصیت خواجہ سراؤں کی فوجی افسروں کے طور پر تقرری تھی۔ بنگال کے نواب عقیدے کے اعتبار سے شیعہ تھے اور سنی مسلم فرقے کی کافی بڑی آبادی پر حکمرانی کرتے تھے۔ اگرچہ وہ رسمی طور پر شرعی قوانین نافذ کرنے کی کوشش کرتے تھے، ان کے سرکاری سرپرستی میں چلائے گئے مدرسے اسلامی تعلیمات کی اشاعت کرتے تھے، پھر بھی وہ مختلف طریقوں سے اپنی ہندو رعایا کو بھی بنیادی دھارے میں شامل کرتے تھے۔ مثلاً خالصہ زمینوں اور مرکزی خزانے کے منتظم متسدی اکثر ہندو تھے۔ طاقتور ہندو متسدیوں، زمینداروں اور جگت سیٹھوں کا تعاون بنگال کے حکمرانوں کے لیے لازمی سا بن گیا تھا۔

حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے مقامی محکمہ محصولات کے عہدیداروں کو حد میں رکھنے کی کوشش کی۔ اس نے کوشش کی کہ زراعت کی توسیع ہو اور ان عملداروں کو سزا دی جن کے اضلاع میں کسانوں کی بدحالی کی اطلاع موصول ہوئی۔ انہوں نے رعیت کو 5 تا 7 سال کا زمینوں کا پٹہ دیا اور ان کی فروخت اور رہن پر پابندی لگا دی۔ مراٹھوں نے بھی کسانوں کو اعتماد میں لینے کے لیے اس طرح کی پالیسی اپنائی۔ اگرچہ میسور کے حکمرانوں حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان کی تصویر کشی ایک کٹر مسلمان کے طور پر کی جاتی ہے، لیکن انہوں نے ہندوؤں کو ان کے عقائد کی بنیاد پر کبھی تنگ نہیں کیا۔ انہوں نے دیگر مذاہب کے تئیں ایک روادارانہ پالیسی اپنائی۔ مہدویوں کے ایک مسلم فرقے کو 1794 میں ٹیپو سلطان کے خلاف سازش کرنے پر نکال دیا گیا۔ ٹیپو نے پیرزادوں اور مسلم فقیروں کے ساتھ قریبی تعلق قائم کیا۔ پیروں کی درگاہ پر مسلمان اور ہندو دونوں تعظیم بجالاتے تھے۔ جنوبی ہندوستان میں بہت سے شیو سنت، محرم میں شرکت کرتے تھے۔ ٹیپو نے 1780 کے دہے میں کچھ ایسے اقدامات کیے جس سے اس کی حکمرانی کے جواز کو مزید تقویت ملی اور مغل بادشاہ سے وابستہ مبہم بندھن مزید ڈھیلا ہوا۔ ابتدائی طور پر حیدر علی نے جنوب میں مغل اقتدار کے نمائندے نظام سے سند حاصل کی تھی لیکن 1770 کے دہے تک اس نے نظام کے اقتدار کو چیلنج پیش کیا۔ اس نے اپنے خود کے سکے ڈھالنے شروع کیے۔ میسور کے حکمرانوں نے ابتدائی طور پر کسی حد تک وڈیار راجہ کی ماتحتی کا دکھاوا کیا۔ ان کے ابتدائی سکوں پر شو، پاروتی، وشنو کی تصویریں تھی، بعد کے سکوں میں ان کی جگہ شاہی نشان 'ہاتھی' نے لے لی۔ بعد میں ٹیپو نے ہندو شبیہوں کو ہٹا دیا اور اپنے سونے اور چاندی کے سکوں پر خلیفاؤں، فقیروں اور اماموں کے نام کندہ کیا گیا۔

1.11 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں آپ نے 18 ویں صدی کے بارے میں پڑھا کہ کس طرح نیم آزاد، نیم مقتدر اعلیٰ ریاستوں جیسے اودھ، بنگال، مراٹھا، حیدر آباد اور میسور مغل سلطنت کے زوال پذیر ہونے کے بعد ابھریں۔ مقامی طبقہ زمیندار خاص طور پر اجارہ دار اور تاجران علاقائی طاقتوں کے اہم ستون تھے جن کے تعاون کی بنیاد پر 18 ویں صدی کی ریاستیں ظہور میں آئیں۔ یہ ریاستیں مغل صوبیداروں کے ذریعہ یا سیاسی قوت حاصل کرنے کے متمنی نئے سماجی گروہوں کے ذریعے مغل سلطنت سے بغاوت کرنے کے دوران قائم کی گئیں۔ 18 ویں صدی کی ریاست کی تشکیل کے عمل میں قرض، سود خوری، بینکنگ اور مالگزاری کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی۔ اس میں مختلف علاقائی ریاستوں جیسے اودھ، بنگال، حیدر آباد، مراٹھا اور میسور کے ابھرنے کی سیاسی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ نئی اور جانشین ریاستوں کے انتظامی ڈھانچے میں تسلسل اور تبدیلی کے عناصر کا تجزیہ کیا گیا۔ آخر میں 18 ویں صدی کی ریاستوں کی نظریاتی بنیاد پر بحث کی گئی ہے۔ 18 ویں صدی میں ان ریاستوں کو برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی بڑھتی طاقت سے خطرہ محسوس ہوا۔ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ یورپی طرز کی فوجی تنظیم اور ساخت اختیار کرتیں۔ لہٰذا اودھ، میسور، حیدر آباد کے حکمرانوں اور مراٹھا سردار مہادجی سندھیا نے اگرچہ مقامی فوجی زمیندار طبقے کے ذریعہ بھرتی کیے گئے رنگروٹوں کا استعمال کیا لیکن، برطانوی تفنگ دار یا بندوقچیوں کی طرح عام بھرتی پر مبنی باقاعدہ مسلح و پیادہ فوج قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔

1.12 کلیدی الفاظ (Keywords)

چٹنی	:	سیکرٹری جو سفارتی خط و کتابت کرتا تھا اور شاہی خطوط لکھتا تھا۔
درگاہ	:	وہ جگہ جہاں صوفی بزرگ کا مقبرہ ہے۔
فرمان	:	شاہی فرمان
کھتری	:	شمالی ہندوستان میں ایک مصنف ہندو ذات کا زمرہ
خطبہ	:	تمام عالم اسلام کی مساجد میں نماز جمعہ کے اجتماع سے پہلے خطبہ
مفتی	:	ایک مسلمان عالم دین جو مذہبی معاملات پر رائے دینے کا حقدار ہے۔
مزمدار	:	ریکارڈ کیپر کے لیے ایک عام اصطلاح
پیشوا	:	وزیر اعظم، بعد میں مراٹھا سیاست کے سربراہ
پیر	:	مسلمان بزرگ
سرلشکر	:	افواج کا کمانڈر
سند	:	ایک معاہدہ جس میں حقوق اور ذمہ داریوں کی وضاحت ہوتی ہے۔
سرنوبت	:	ایک فارسی اصطلاح جس کا مطلب ہے بینڈ کا لیڈر
شیخ زادہ	:	ہندوستانی مسلمان

1.13 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

1.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. لفظ سند کا کیا معنی ہے۔
2. سرنوبت کس زبان کا لفظ ہے اور اس کا کیا معنی ہے؟
3. سادات خان برہان الملک اودھ کا صوبے دار کب مقرر ہوا؟
4. ایلفنسٹون کی کتاب کا نام کیا ہے؟
5. *Rise of Maratha Power* نامی کتاب کا مصنف کون ہے؟
6. چوتھ اور سردیش مکھی نامی ٹیکس کن علاقوں میں نافذ کیا گیا؟
7. مرشد قلی خان بنگال کا نواب کب بنا؟
8. نظام الملک آصف جاہ نے کس علاقائی ریاست کی بنیاد ڈالی؟

9. لفظ پیشوا کا استعمال کس ریاست میں استعمال کیا جاتا تھا۔
10. شجاع الدولہ کس ریاست کا نواب تھا۔

1.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. علاقائی ریاستوں کا عروج کیسے ہوا؟ اس پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. مراٹھا ریاست کی معیشت پہ ایک نوٹ لکھیے۔
3. ریاست بنگال کی انتظامیہ کے بارے میں لکھیے۔
4. اودھ کے انتظامیہ پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. ریاستی کے حکمراں خود مختاری کا اظہار کیسے کرتے تھے۔

1.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. علاقائی ریاستوں کا نظم و نسق کیسا تھا؟ اس پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. اودھ کی ریاست کا عروج کیسے ہوا؟ تفصیلی روشنی ڈالیے۔
3. حیدر آباد اور میسور کیسے خود مختار ریاستوں میں تبدیل ہوئیں؟ تفصیل سے تحریر کیجیے۔

1.14 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Alavi, Seema ed., *The Eighteenth Century in India*, Oxford University Press, New Delhi, 2002.
2. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2009.
3. Brittlebank, Kate, *Tiger*: *The Life of Tipu Sultan*, Juggernaut, New Delhi, 2016.
4. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
5. Dalrymple, William, *The Anarchy*: *The East India Company*, *Corporate Violence*, *and the Pillage of an Empire*, Bloomsbury Publishing, London, 2019.
6. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019.
7. Durant, Will, *The Case for India*, Standard Book Stall, Mumbai, 2007.
8. Gandhi, Rajmohan, *A History of Modern South India*: *A History from the 17th Century to Our Times*, Aleph book Company, New Delhi, 2018.

9. Gordon, Stewart, *The Marathas*, *1600–1818*: *The New Cambridge History of India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2005.
10. Habib, Irfan ed., *State and Diplomacy under Tipu Sultan*: *Documents and Essays*, Indian History Congress and Tulika, New Delhi, 2001.
11. Hasan, Mohibbul, *History of Tipu Sultan*, Aakar Books, Delhi, 2006 (first pub. 1951).
12. Metcalf, Barbara D. and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).
13. Shaik Ali, B., *Tipu Sultan*, National Book Trust, India, 1972.
14. Nair, Janaki, *Mysore Modern*: *Rethinking the Region under Princely Rule*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2012.
15. Subramanian, Lakshmi, *History of India*, *1707–1857*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.
16. Wilson, Jon, *India Conquered*: *Britain's Raj and the Chaos of Empire*, Simon and Schuster, London and New Delhi, 2017.

اکائی 2۔ یورپی نوآبادیاتی طاقتیں: برتری کی جدوجہد

(European Colonial Powers: Struggle for Hegemony)

اکائی کے اجزا

2.0		تمہید
2.1		مقاصد
2.2		پرتگالی نوآبادیت
	2.2.1	پرتگالی ہندوستان میں
	2.2.2	پرتگالی بحری سلطنت
	2.2.3	پرتگالی تجارتی سلطنت کے ذرائع
	2.2.4	پرتگالی تجارتی سلطنت کی نشوونما
2.3		ڈچ نوآبادیت
	2.3.1	ڈچ تجارت کی نوعیت
	2.3.2	ڈچ فیکٹریوں کا نظم ونسق
	2.3.3	ہندوستانی سماج اور ریاست پر ڈچ 'سلطنت' کا اثر
2.4		ہندوستان میں فرانسیسی
	2.4.1	فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی
	2.4.2	تجارتی سلطنت سے علاقائی سلطنت میں منتقلی
2.5		اکتسابی نتائج
2.6		کلیدی الفاظ
2.7		نمونہ امتحانی سوالات

2.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
2.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
2.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
2.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

2.0 تمہید (Introduction)

پندرہویں صدی میں مشرق وسطیٰ میں بدلتے سیاسی منظر اور تجارتی راستوں میں خلل نے یورپی تاجروں کو مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستان کے لیے نئے تجارتی راستے تلاش کریں۔ کافی کوششوں کے بعد یورپی تاجر پندرہویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے بحری ساحل پر پہلی بار وارد ہوئے۔ مئی 1498 میں واسکوڈگاما کا کالی کٹ پہنچنا، یورپ ایشیائی تجارت میں نئے دور کی ابتدا کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ سب سے پہلے پرتگالیوں نے ہی رأس امید (Cape of Good Hope) کے راستے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا تھا، اس لیے ابتدائی طور پر ہندوستان اور یورپ کے درمیان تجارتی سرگرمیوں پر ان کی ہی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ تاہم پرتگال کے پاس ایک طاقتور تاجر طبقہ موجود نہیں تھا اور پرتگالی سمندر پار تجارتی مہم جوئی کی مالی اور سیاسی مدد پرتگالی بادشاہ ہی سے حاصل ہوتی تھی۔ سولہویں صدی کے آخر میں ڈچ اور انگریز کارپوریٹ تجارتی کمپنیاں، مقابلے کے میدان میں داخل ہو گئیں اور اس سے پرتگالی اجارہ داری کو چنوتی ملنے کی شروعات ہوئی۔ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل 1600 میں ہوئی اور ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی 1602 میں وجود میں آئی۔ فرینچ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی 1664 میں اپنے قیام کے بعد اس دوڑ میں شامل ہو گئی۔ اگرچہ ان کے اپنے وطن میں بھی واحد بڑے تجارتی کارپوریشنوں کا غلبہ تھا لیکن نجی تاجروں نے بھی کسی حد تک یورپ ایشائی تجارت میں حصہ لیا۔ یہ تجارتی سلطنتیں اپنے ملکوں کی بحری برتری کے ذریعہ قائم رہیں اور تجارت پر اجارہ داری قائم کرنے کی کوششیں کرتی تھیں۔ ان کی سرگرمیاں ہندوستان کے ساحلی بندرگاہ شہروں تک محدود تھیں اور بڑی حد تک مقامی ریاستوں کے اقتدار اعلیٰ پر اثر انداز نہیں ہوئیں۔ انہوں نے حصولیابی اور تجارت کے مقامی نظام کے پہلے سے موجود نیٹ ورک سے استفادہ کیا۔ وہ عام طور پر ہندوستانی سامانوں کو چاندی سونے (Bullion) کے بدلے میں حاصل کرتی تھیں۔ اس سے غیر ملکی تجارت کا توازن ہندوستان کے حق میں ہو گیا اور یہ معاشی ترقی کا ذریعہ بن گیا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے لیے ہندوستانی حکمرانوں کا رویہ، نرمی اور رواداری پر مبنی تھا۔ تجارت اور بازار پر کنٹرول قائم کرنے سے جھگڑے بھی پیدا ہو جاتے تھے لیکن عموماً مسلح جنگی حکمت عملیوں سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ فرانسیسی وہ پہلے لوگ تھے جنہوں نے ہندوستان میں ایک طرح سے بڑے پیمانے پر علاقائی سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے بعد میں ان کی علاقائی توسیع کی پالیسی کو اپنایا، جس پر بعد میں ڈچوں نے بھی عمل کیا۔ تجارتی اجارہ داری اور علاقائی کنٹرول کے لیے ان یورپی طاقتوں کے درمیان جھگڑے بھی ہو جاتے تھے۔

2.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- کس طرح یورپی نوآبادیاتی طاقتیں، تاجروں کے طور پر ہندوستان پہنچی؟ اسے سمجھ سکیں گے۔
- یورپی تجارت کے ہندوستانی ریاست اور سماج پر پڑنے والے اثرات سے واقف ہو سکیں گے۔
- ابتدائی تجارتی سلطنتوں کے ذریعہ اپنائے گئے تسلط کے مختلف طریقوں کو جان سکیں گے۔
- ایشیا اور ہند یورپی تجارت میں یورپی تاجروں کے کردار اور ان کے انتظامی طریقہ کار کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- ان کے بحری تجارتی طاقتوں سے علاقائی طاقت بننے تک کے بارے میں پڑھیں گے۔
- ہندوستانی افواج میں یورپی فوجیوں کے کردار پر روشنی ڈال سکیں گے۔

2.2 پرتگالی نوآبادیت (Portuguese Colonisation)

2.2.1 پرتگالی ہندوستان میں (The Portuguese in India)

واسکوڈی گاما کی مہم جو رأس امید کا چکر لگانے کے بعد مئی 1948 میں کالی کٹ پہونچی، اسے کئی مقاصد کے ذریعہ ترغیب ملی تھی۔ پرتگالی بادشاہ ڈی۔ مینوئل (D. Manuel، 1495 تا 1521) کی خواہش تھی کہ ہندوستان تک سیدھا سمندری راستہ دریافت کیا جائے۔ یہ خواہش بنیادی طور پر تجارتی مقصد کے لیے تھی، اگرچہ کبھی کبھی یہ تبدیلی مذہب کے عیسائیت کے مشن کے بھیس میں چھپی ہوتی تھی۔ پرتگالیوں کا بنیادی مقصد ہند یورپی مسالوں کی تجارت (اس زمانے کی نفع بخش تجارت) پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے ذریعہ خود کو اور اپنی ریاست کو خوشحال بنانا تھا۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے فوجی طاقت کا بھی استعمال کرتے تھے اور کوچین (Cochin) اور کینور (Cannanore) میں قلعے بھی بنائے گئے۔ 1505 عیسوی میں پہنچنے والا پہلا پرتگالی وائسرائے، فرانسسکو ڈی المیڈا (Francisco d' Almeida) ہندوستان میں پرتگالیوں کے تجارتی اور علاقائی ڈھانچے کو مضبوط کرنے میں بہت زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ یہ الفانسو ڈی البقرق (Alfonso de Albuquerque) تھا جس نے (1509 تا 1515) پرتگالی علاقائی سیاسی ساخت کو ٹھوس شکل دی۔ اس نے ہندوستان میں متعدد بندرگاہ والے شہروں اور بحر ہند میں جزائر پر تیزی سے قبضہ کیا۔ 1510 میں گوا (Goa) پر اور اس کے بعد 1511 میں ملکا (Malacca) پر قبضہ کر لیا گیا۔ 1515 میں ہرمز (خلیج فارس کے دہانے) بھی پرتگالی قبضے میں چلا گیا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان قبضوں کے بعد پرتگالی نوآبادی میں کافی کم ہی علاقائی توسیع ہوئی لیکن ان کی دفاعی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ 1518ء میں سری لنکا میں کولمبو کا قلعہ تیار ہوا۔ 1530 میں 'گوا' ہندوستان میں پرتگالی تجارتی 'سلطنت' کی راجدھانی بنا۔ اس کے بعد سولہویں صدی میں اور بھی کئی علاقوں پر فتح حاصل کی گئی۔ پرتگالیوں نے دیو (Diu)، دمن (Daman) اور بیسین (Bassein) پر بھی قبضہ کر لیا، اس طرح گجرات سے ہونے والی تجارت پر ان کا تسلط قائم ہو گیا۔ انہوں نے مالابار سے تجارت پر کنٹرول کے لیے کونکن اور

مالا بار کے ساحل کو بھی اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔ سولہویں صدی کے آخر میں ان کے پاس تقریبا پچاس قلعوں اور سو جہازوں کا ایک طاقتور بحری بیڑہ تھا۔ تجارتی اور علاقائی 'سلطنت' کی تعمیر کے اس عمل میں بعض اوقات مقامی حکمرانوں نے بھی پرتگالیوں کی مدد کی۔ مثال کے طور پر، کوچین کا راجہ اپنے محض نام کے فرمانروا کالی کٹ کے زیمورین کے مقابلے اپنی طاقت بڑھانے کے چکر میں پرتگالیوں کی کٹھ پتلی بن گیا۔ اس پوری صدی میں پرتگالیوں کے تجارتی اور بحری جہازوں کو جزوی طور پر مقامی لوگوں سے بھرتی کیے گئے عملے اور سپاہیوں کے ذریعہ چلایا جاتا تھا۔

2.2.2 پرتگالی بحری سلطنت (The Portuguese Naval Empire, 1500-1640)

پرتگالیوں کی کوششوں سے بنائی گئی یہ سلطنت کوئی علاقائی سلطنت نہیں تھی، بلکہ ایشیا اور مشرقی افریقہ کے درمیان یہ ایک سمندری نیٹ ورک تھا جس کے اندر علاقے، ادارے، جہاز، افراد اور انتظامی بندوبست، پرتگالی حکمرانی کے تحت رکھے گئے تھے۔ لسبن (Lisbon) میں 'Casa da India' نامی ایک شاہی تجارتی فرم اس بحری 'سلطنت' کی سربراہی کرتی تھی۔ بادشاہ کے علاوہ، یورپ کے مختلف ملکوں کے تاجر، مہاجن اور بینک کار اس 'کاسا دا انڈیا' سے وابستہ تھے جو ایشیا سے واپسی پر تجارتی سامان کے حصول اور نقل و حمل میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ ایشیا میں کاروباری ادارہ جس انتظامی ساخت کے کنٹرول میں تھا اسے 'Estada da India' (ہندوستانی ریاست) کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اس کی سربراہی گوا کا وائسرائے کرتا تھا جو مشرقی افریقہ سے لے کر ملکا اور مکاؤ (Macao) تک پوری بحری سلطنت کی شہری اور فوجی حکومت کا سربراہ تھا اور صرف بادشاہ کو جواب دہ تھا۔ غیر رسمی کونسلیں جو وائسرائے کی خواہش پر طلب کی جاتی تھی، ان سے وائسرائے کی مدد کے لیے صرف مخصوص، عموماً فوجی امور پر صلاح حاصل کی جاتی تھی۔ ابتدائی طور پر کوئی مقررہ رکنیت یا معاملات کو انجام دینے کے لیے طریقہ عمل نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے یہ کونسلیں باقاعدہ اداروں میں تبدیل ہو گئیں۔ صدر کے طور پر وائسرائے کے علاوہ اس میں گوا کے آرک بشپ، محتسب اعلیٰ، گوا کے بعض اہم فڈالگو (fidalgos) یا معزز شہری، گوا شہر کے کپتان، ہائی کورٹ کے منصف اعلیٰ اور مالیاتی افسر اعلیٰ شامل ہوتے تھے۔ گوا کے نظم و نسق کے لیے ایک بلدیہ کونسل بھی تھی جس کا انتخاب پرتگالیوں اور یورپ ایشیائی آبادی کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ ماتحت قلعوں اور بستیوں میں گوا میں قائم انتظامی ساخت کی نقل کی گئی۔ قلعوں اور ان کے کپتان کا خاص مقصد یورپی مسالوں کی تجارت اور ایشیا میں مختلف مخصوص بندرگاہوں کے درمیان تجارت پر اجارہ داری (monopoly) کو یقینی بنانا تھا تاکہ اس کو محصول نظام کے تحت لایا جائے اور بحر ہند میں اس کے بہاؤ پر قابو رکھا جائے۔ کپتان اور دیگر پرتگالی باشندے اپنی خود کی ذاتی تجارت میں بھی مشغول رہتے تھے۔ ہندوستان میں پرتگالی بحری سلطنت مقامی تاجروں کی بحری تجارت کو کنٹرول کرنے اور محصول عائد کرنے کے ذریعہ قائم رہی۔ سولہویں صدی میں درحقیقت کل سلطنت میں درآمد برآمد پر چنگی سے حاصل ہونے والی آمدنی کل محاصل کی تقریباً 60 تا 65 فیصد تھی۔ ہم اس میں محصولات کی دیگر مدوں کو بھی شامل کر سکتے ہیں جو بحری تجارت پر نگرانی رکھنے کے ذریعہ مثلاً پکڑے گئے ایشیائی جہازوں سے مال غنیمت کے طور پر حاصل کی جاتی تھی۔

ایشیاء میں پرتگالیوں کے ذریعہ جو اہم اشیا حاصل کی جاتی تھیں وہ مسالے خاص طور پر کالی مرچ ہوا کرتی تھیں۔ پرتگالی بڑی تعداد میں

ان اشیا کو مالا بار علاقے سے اور بعد میں ہندوستان کے جنوب مغرب ساحل پر واقع کنارا سے حاصل کرتے تھے۔ پرتگال سے ہندوستان کو قیمتی دھاتوں کی تجارت اور ہندوستان سے پرتگال کو مسالے کی تجارت پر 1506 سے شاہی اجارہ داری قائم تھی۔ اجارہ داری والی اشیا میں نجی تجارت کی اجازت صرف بحری عہدیداروں اور شاہی لائسنس کے تحت مخصوص افراد کو ہوا کرتی تھی۔ شاہی گھرانے کو مالیات کی فراہمی کے ذریعہ نجی تاجر بالواسطہ طور پر اس میں شرکت کرتے تھے۔ ہندوستان میں پرتگالی ریاست ،ہندوستان سے کالی مرچ حاصل کرتی تھی اور سولہویں صدی کے وسط تک اسے انٹ ورپ اور اس کے بعد لزبن میں فروخت کرتی تھی۔ 1564 کے بعد بادشاہ کالی مرچ کی تجارت پر اپنی اجارہ داری برقرار نہیں رکھ سکا اور اسے نجی تجارتی فرموں کو اس میں شریک کرنا پڑا۔ 1575 میں کالی مرچ کی تجارت کی شاہی اجارہ داری ،آگسبرگ کے تاجر کو نراڈ روٹ(Konrad Rott) اور ملان کے تاجر رووالیسکا(Rovalesca) کو 32 کروزادوس (cruzados)فی کنٹل کی شرح پر سونپ دی گئی۔ اس کے بعد بادشاہ نے دیگر تاجر گھرانوں کو بھی اس میں شریک کیا ساتھ ہی اس نفع بخش تجارت میں اپنا بھی کچھ حصہ برقرار رکھا۔ اس معاہدے کا نظام 1598 تک چلا جب مسالے کی بحری تجارت میں برٹش اور ڈچ لوگوں سے ملنے والے زبردست چنوتی کے سبب کالی مرچ کے معاہدہ کاروں کے لیے تجارت غیر منفعت بخش ثابت ہونے لگی۔ 1628 میں پرتگالی انڈیا کمپنی کی تشکیل کا تجربہ بھی کامیاب نہیں ہوا اور 1633 میں یہ کمپنی بھی تحلیل کر دی گئی۔

کالی مرچ اور دیگر اشیاء کے حصول کے لیے پرتگال سے ایشیا بھیجے جانے والے سامان میں قیمتی دھاتیں (مغربی افریقی سونا اور امریکی چاندی کا ڈھلا ہوا ریال سکہ) غیر قیمتی دھاتیں جیسے تانبہ ، جستہ ، ٹن ، سیال پارہ (Quicksilver)، پارہ اور کچھ مقدار میں مونگا ، المونیم ، زیتون کا تیل اور شراب بھی شامل تھے۔ غیر قیمتی دھاتوں میں تانبہ کو کچھ عرصے کے لیے سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ پرتگالی بین ایشیائی تجارت میں بھی شامل تھے ،جو کہ قدر و قیمت کے لحاظ سے غالباً گوا اور لسبن کے درمیان تجارت کے مقابلے زیادہ بڑی اور منافع بخش تھی۔ حالانکہ نجی تاجروں نے اس بین ایشیائی تجارت سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ پرتگالی بین ایشائی تجارت کا ایک حصہ لزبن کو ملکائی مسالے کی برآمد کے ساتھ جاری رہا جو کہ ملکا کو خاص طور پر ہندوستانی کپڑے کی برآمد کے ذریعہ حاصل کیا جاتا تھا۔ ابتداء ہی سے یہ بادشاہ کی ایک ڈھیلی ڈھالی اجارہ داری تھی جس میں شاہی جہازوں کے عملے کو تجارت میں حصہ لینے کی اجازت تھی۔ منتخب ریاستی عہدیداروں کو بھی کسی حد تک اس میں شامل ہونے کی منظوری دی گئی تھی۔ وسائل کی قلت کے چلتے نجی تاجروں کو بھی اس میں شریک ہونے کی اجازت دی گئی۔ چونکہ جہاز کے کپتان اپنی خود کی تجارت کے لیے بھی شاہی جہازوں کا استعمال کرتے تھے ، لہٰذا بادشاہ کی شرکت سامان کی ترسیل سے متعلق خدمات کو فراہم کرنے تک محدود تھی اس طرح اس سے شاہی منافع کم ہو رہا تھا۔ 1540 اور 1550 کے دوران ، پرتگالی ریاستی مالیات کی حالت مزید ابتر ہو گئی اور بادشاہ نے بین ایشیائی تجارت میں شرکت جاری رکھنے کو غیر نفع بخش پایا۔ بادشاہ کے لیے اس کی اجارہ داری قائم رکھنا مشکل تھا کیونکہ شاہی گھرانے کے پاس اس کے تحفظ کے لیے ضروری مالی وسائل نہیں تھے۔

2.2.3 پرتگالی تجارتی سلطنت کے ذرائع (Sources of the Portugese Empire)

آپ جانتے کہ جیسے ہی پرتگالی ہندوستان پہنچے۔ انہوں نے کامیابی کے ساتھ مسالوں کی تجارت کو اپنی اجارہ داری بنانے کی کوشش

کی۔ پوری سولہویں صدی میں لسبن اور گوا سے ملے احکامات اور ہدایات کے سلسلے نے یہ بات واضح کر دی کہ مسالوں کی تجارت پر تگالی بادشاہ اور اس کے گماشتوں کے لیے محفوظ تھی۔ اس اجارہ داری کو سختی کے ساتھ نافذ کیا گیا اور پرتگالیوں کی بحری برتری نے اس میں اہم کردار نبھایا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بحری تجارت کی ضابطہ بندی اور کنٹرول ضروری تھا۔ بادشاہ نے اجارہ دارانہ بنیادوں پر ایشیا میں مخصوص مقامات کے لیے مہمات کا انتظام کیا۔ صرف نامزد جہاز ہی کسی مخصوص سال میں مقررہ سمندری سفر کر سکتے تھے۔ شاہی جہازوں کے مال تجارت کی جگہوں کو ابتدائی سولہویں صدی میں اونچی شرح پر نجی تاجروں کو فروخت کیا جاتا تھا۔ بادشاہ نے 1540 کے دہے کے بعد اس تجارتی مہم کو مہنگا پایا کیونکہ جہازوں کی تعمیر کافی مہنگی ہو چکی تھی۔ پرتگالی ریاست نے نجی تاجروں اور افراد کو لائسنس (اجازت نامہ) جاری کرنے کی شروعات کی، تاکہ اس طرح کی تجارتی مہموں کو جاری رکھا جائے۔ یہ لائسنس مختلف بنیادوں پر دیے جاتے تھے جیسے فوجی خدمات کے صلے کے طور پر، ممتاز لیکن مفلس میڈائکو کی بیٹیوں کے لیے جہیز کے طور پر کسی مخصوص عہدے کی مطلوبہ شرائط کے طور پر۔ لیکن اکثر ان لاسینسوں کو اونچی بولی لگانے والے کو دیا جاتا تھا اور اس طرح حاصل کرنے والوں کے لیے یہ نہایت منافع بخش ثابت ہو سکتا تھا۔

پرتگالیوں نے بحر ہند میں دیگر تاجروں کے ذریعہ انجام دی جانے والی تجارت پر کنٹرول کرنے اور ٹیکس عائد کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے خصوصی ذریعہ کرتاز (*Cartaz*) تھا۔ یہ ایک ایسا اجازت نامہ تھا جسے پرتگالی بحری بیڑے 'ارمدا' کی پشت پناہی حاصل تھی۔ ایشیا میں بحری تجارت کو قابو کرنے کی کوششوں کے لیے پرتگالیوں کا جواز سمندروں کے مالک ہونے کے دعوے پر مبنی تھا۔ ایشیا میں تمام جہازوں کو یہ اجازت نامہ یا کرتاز حاصل کرنے کی ضرورت تھی جسے پرتگالی حکام کے ذریعہ جاری کیا جاتا تھا۔ اس میں جہاز کے کپتان کی شناخت، جہاز کا سائز اور اس کو لے جانے والے عملے کی تفصیلات ہوتی تھیں۔ ہتھیار گولہ بارود یا سامان جنگ لے جانے کی اجازت انتہائی محدود تھی۔ جہاز کو اس کی منزل پر روانہ ہونے سے قبل پرتگالی قلعے پر تجارتی محصول دینا دینی پڑتا تھا۔ کوئی بھی جہاز اگر بغیر اجازت نامے کے ہوتا تو اسے ضبط کر لیا جاتا اور اس کے عملے کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ کرتاز جاری کرنے کے لیے بھی فیس عائد کی گئی تھی جو حالانکہ تھوڑی ہوتی تھی لیکن مجموعی لحاظ سے دیکھا جائے تو پرتگالی بے حد فائدہ میں تھے۔

بعد میں سولہویں صدی میں پرتگالیوں نے تجارت پر کنٹرول کا ایک نیا ذریعہ 'کیفیلا' (*Cafila*) ایجاد کیا۔ یہ چھوٹے مقامی تاجر جہازوں کا قافلہ تھا جس کی حفاظت پرتگالی بیڑے کیا کرتے تھے۔ کیفیلا اصول کی بنیاد دوہری تھی: ایک پرتگالی چنگی گھر کے لیے آمدنی اور دوسرے مقامی تاجروں کے لیے تحفظ۔ بعض کیفیلا، پرتگالی قلعوں اور بندرگاہوں کے لیے خوراک بھی لاتے تھے۔

2.2.4 پرتگالی تجارتی سلطنت کی نشوونما (Growth of the Portuguese Commercial Empire)

پرتگالی اجارہ داری کا ابتدائی خراب اثر سولہویں صدی کے پہلے نصف میں بحر احمر سے بحیرہ روم تک کی تجارت میں محسوس کیا گیا۔ سولہویں صدی کے دوسرے نصف میں اس تجارت میں اس وقت نئی جان پڑی جب پرتگالیوں کا تسلط ڈھیلا ہوا۔ سترہویں صدی میں پرتگالیوں کی اجارہ داری نے زیادہ بہتر ڈیچ اجارہ داری کا راستہ صاف کیا۔ مزید برآں، مسالے کی تجارت میں کتنا زیادہ منافع حقیقت میں تھا اس

پر غور کیا جانے لگا۔ پرتگال کا ریاستی مالی نظام سولہویں صدی کے دوسرے نصف میں ابتر ہو چکا تھا۔ قلعوں اور جنگی بیڑوں کی مرمت میں کافی رقم خرچ ہوتی تھی۔ ایشیائی تجارت کی اجارہ داری کو پروان چڑھانا اس طرح ایک مہنگا معاملہ ثابت ہو رہا تھا۔ دوسرے پرتگالی ریاست غیر ملکی تجارتی سرمایے، غیر ملکی مہارت اور غیر ملکی بازاروں پر منحصر تھی۔

پرتگالیوں کو ایشیائی تاجروں اور حکمرانوں کی مخالفت کے سبب مکمل طور پر اجارہ داری قائم کرنے میں مشکلیں پیش آئی۔ اس نظام میں کافی نقائص تھے۔ گجراتی تاجروں نے خلیج بنگال میں 1540 اور 1500 کے دہے میں کالی مرچ کی کافی مقدار اکٹھا کی اور پورے ایشیا میں اس کی تجارت کی۔ پرتگالی عدن پر قبضہ کرنے ناکام رہے جس پر حریف سلطنت عثمانیہ نے 1538 میں قبضہ کر لیا تھا۔ اس سے ان کی اجارہ داری کے ڈھانچے میں کافی بڑا خلا رہ گیا۔ پرتگالی فارس کی کھاڑی کے راستے ایشیائی تاجروں کی نجی تجارت کو بھی برداشت کرتے تھے کیونکہ وہ گھوڑوں کی فراہمی کے لیے ان تاجروں پر منحصر تھے۔ درحقیقت گجرات میں گھوڑے کی تجارت پر کنٹرول پرتگالیوں کے لیے بنیادی طور پر ایک غور طلب معاملہ تھا۔

کنارا اور مالابار میں بھی جو کہ کالی مرچ کی پیداوار کے علاقے تھے، پرتگالی موثر طور پر اجارہ داری قائم کرنے میں ناکام رہے۔ مالابار میں کالی کٹ کے زمورن نے پرتگالی نظام کی مخالفت کی کیونکہ کوچین کا راجہ جن پر پرتگالیوں کا بھروسہ تھا وہ کالی کٹ کا سابق ماتحت تھا۔ تجارتی طور پر اس مزاحمت نے وہ شکل اختیار کی کہ مقامی تاجر کالی مرچ میں تجارت کرتے رہے۔ ان علاقوں پر جہاں کالی مرچ اگائی جاتی تھی پرتگالی کنٹرول میں کمزوری کے سبب ان کا کام آسان ہو گیا۔ چونکہ پرتگالیوں کا تسلط ساحلی علاقوں پر تھا جہاں وہ کالی مرچ لگانے والوں کو کم قیمت ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے، جبکہ 'غیر قانونی' مقامی تاجروں اس سامان کو زیادہ قیمت دے کر آسانی سے حاصل کر لیتے تھے۔ وہ اسے خشکی کے راستے کورومنڈل بھیج سکتے تھے جو پرتگالی مداخلت سے آزاد تھا یا سمندر کے راستے گجرات بھیجتے جو کافی جوکھم بھرا تھا۔ مزید برآں پرتگالی عہدیداروں کی نجی تجارت کے سبب اس اجارہ دارانہ تجارت میں کافی خلا پیدا ہو گئے۔

پرتگالیوں نے عرب اور ایران کی گھوڑے کی تجارت کو گوا کے راستے مرکوز کر کے اس تجارت کی بھی اجارہ داری حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جنوبی عرب یا ہرمز سے گھوڑوں کے ساتھ آنے والے سبھی جہاز صرف گوا آسکتے تھے۔ سیاسی اسباب کی بنا پر مقامی حکمرانوں سے خیر سگالی حاصل کرنے کی ضرورت تھی لیکن اس نظام میں اس کی کمی موجود تھی۔ پرتگالی مقامی حکمرانوں سے رعایتیں حاصل کر سکتے تھے اگر وہ بغیر کسی رکاوٹوں کے انہیں گھوڑوں کی فراہمی ہونے دیتے یا ان کے دشمنوں کو گھوڑے فراہم کرنے سے منع کر دیتے۔ پرتگال میں جو چرچ تھا وہ بھی لامذہبوں کو گھوڑے کی فروخت کا تصور پسند نہیں کرتا تھا۔

مقامی حکمرانوں اور تاجروں کی خدمات کے سلسلے میں پرتگالیوں اور طبقہ امراء کے درمیان کبھی کبھی جھگڑے پیدا ہو جاتے۔ گجرات میں مقامی طاقتور گروہوں کا تجارتی مفادات کے سلسلے میں پرتگالیوں کے ساتھ اکثر جھگڑا ہو جاتا تھا۔ گجرات کے سلطان کے ایک غلام امیر نے ابتدائی سولہویں صدی میں، دیو میں پرتگالیوں کے حملے کی مزاحمت کی، لیکن پرتگالیوں کی بحری سلطنت کے ذریعہ ہندوستانی حکمرانوں اور

سلطنتوں کے معاشی وسائل کے لیے کبھی سنجیدہ خطرہ نہیں پیش آیا۔ ہندوستانی تاجروں کے جہاز جب کہ گوا میں چنگی کے واجبات ادا کرتے تھے ،وہ مقامی حکمرانوں کے زیر اہتمام بندرگاہوں پر درآمد برآمد محصول بھی ادا کیا کرتے تھے۔ بحری تجارت کے کنٹرول کو مقامی نظام حکومت کے ذریعہ ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا کیونکہ ان کا خشکی کے علاقوں پر پہلے ہی قبضہ تھا۔ زیادہ تر وہ کسانوں سے وصول کیے جانے والے محصولات پر منحصر رہتے تھے۔ لہٰذا یہ ان کے لیے پرتگالی تسلط کوئی مقامی چنوتی نہیں تھی۔ پرتگالیوں نے بحری تجارت اور سمندر پر اقتدار اعلیٰ کا اپنا تصور ایجاد کیا اور اپنی بحری برتری کے ساتھ اسے قائم رکھا۔ مقامی تاجر بھی پرتگالی تحفظ کے لیے تھوڑی رقم ادا کرنے کے خواہش مند تھے۔ ساتھ ہی جب بھی ممکن ہوا وہ ان کے کنٹرول سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔

پرتگالیوں کی بحری سلطنت ان علاقوں کے اعتبار سے بڑی تھی جس پر وہ کنٹرول کرنا چاہ رہے تھے۔ اس وسیع مہم کے لیے دستیاب مالیاتی اور انسانی وسائل نسبتاً بہت کم تھے۔ اتنی بڑی مہم کے لیے دستیاب یورپیوں اور یوریشیوں کی کل تعداد کبھی بھی 15000 افراد سے زیادہ نہیں تھی۔ پوری سلطنت میں فوجی خدمات کے اہل افراد کی کل تعداد تقریباً 10000 رہی ہوگی۔ پرتگالیوں کی بحری برتری کے باوجود اتنی قلیل افرادی قوت کے سبب پرتگالی تجارتی کنٹرول سے متعلق مناسب اقدامات میں ناکام رہے۔ اصلاً وہ صرف مقامی تاجروں سے خراج وصول کر رہے تھے۔ پرتگالیوں نے موجودہ طریقوں یا راستوں، اشیا یا تجارتی تکنیکیوں میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ ایک طرح سے وسائل کی از سر نو تقسیم تھی جہاں پرتگالی اپنے لیے دوسروں کی بحری تجارتی سرگرمیوں سے حاصل شدہ منافع کا کچھ حصہ لینا چاہتے تھے۔

2.3 ڈچ نوآبادیت (1600تا1680,Dutch Colonisation)

ڈچ جمہوریہ کی قومی مجلس انتظامیہ، اسٹیٹس جنرل نے 'Verenigde Oost-Indische Compagnie' نام سے ایک کمپنی قائم کی جسے عام طور ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کہا جاتا ہے۔ کچھ کمپنیوں کو ملا کر اس جوائنٹ کمپنی کی تشکیل کی گئی تھی۔ ایمسٹرڈم (Amsterdam)، روٹرڈم (Rotterdam) اور زی لینڈ (Zeeland) کے دولت مند تاجروں نے اس طرح کمپنی کے سرمایہ وسائل کی بنیاد میں اضافہ کیا۔ اسٹیٹس جنرل کے منشور میں کمپنی کو مشرق میں تجارت کے لیے 21 سال کی مدت کے اجارہ داری حقوق دیے گئے۔ اس کے بعد ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے کورومنڈل ساحل پر اپنی پہلی فیکٹری قائم کی۔ کورومنڈل، جنوب ایشیائی بازاروں بشمول مسالے کی پیداوار والے جزائر جیسے ملکا، باندا اور سیلیباس (Celebas) اور یورپی ممالک کو بھیجے جانے والے کپڑوں کا اہم مقام تھا۔ کورومنڈل ساحل پر کمپنی کی تجارت میں پوری سترہویں صدی کے دوران نمایاں اضافہ درج کیا گیا۔ اس کی خاص وجہ جنوبِ مشرقی ایشیائی بازاروں میں کپڑے کی مانگ میں اضافہ ہونا تھا۔ 1980 تک ڈچ اور انگریز کمپنیاں عملاً پوری تجارت پر چھا چکی تھیں۔ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اس تجارت پر غلبہ تھا جبکہ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی 1680 سے خاص طور پر یورپ ایشیائی بازاروں میں اس کی برابری کو پہنچ رہی تھی۔ تاہم ڈچوں نے بین ایشیائی تجارت میں بالخصوص کورومنڈل ساحل اور جنوب مشرقی ایشیائی منڈیوں کے درمیان اپنی مجموعی بالادستی برقرار رکھی، جبکہ پرتگالی بنیادی طور

پر سولہویں صدی میں ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل تک محدود تھے۔ڈچوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے جلد ہی اپنے تجارتی نیٹ ورک کی توسیع کی اور اب اس میں کور ومنڈل ساحل بنگال اور گجرات شامل ہو چکے تھے۔ یہ نئی نوآبادیاتی طاقتیں پہلے ہی ساحلی علاقوں تک محدود تھیں لیکن انہوں نے اندرونی علاقوں جیسے احمد آباد اور آگرہ میں بھی تجارتی مراکز قائم کیے۔

2.3.1 ڈچ تجارت کی نوعیت (Nature of the Dutch Trade)

حالانکہ سترہویں صدی میں ڈچوں کا عروج، بازار میں ان کی مسابقتی اہلیت پر مبنی تھا لیکن وہ پھر بھی مسالوں کے جزائر میں پیدا کاروں کو کم شرح پر ادائیگی کرنے میں اپنی اجارہ داری کا استعمال کرتے تھے۔ مقامی تاجروں سے مسابقت کو کم کرنے اور مخصوص اشیا اور بازاروں میں خصوصی حقوق حاصل کرنے کے لیے وہ طاقت اور تشدد کا استعمال بھی کرتے تھے۔ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پرتگالیوں کے ذریعہ فروغ دیے گئے کرتاز نظام سے اس لیے بھی فائدہ اٹھایا تاکہ ایشیائی مسابقت کاروں کو اجارہ دارانہ اشیاء کی تجارت سے باہر رکھا جاسکے۔ سترہویں صدی کے درمیان یورپ ایشیائی تجارت کے حجم اور قدر میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہوا۔اس تجارت کی ساخت میں بھی تنوع تھا۔ڈچ کمپنی کی بین ایشیائی تجارت میں اپنے کردار کے سبب ہندوستان ڈچوں کے لیے ایک اہم فراہم کار بنا رہا۔ کور ومنڈل اور گجرات سے کپڑوں کا انڈونیشیائی جزائر میں کالی مرچ اور دیگر مسالوں سے مبادلہ کیا جاتا تھا۔ کمپنی کچے ریشم اور افیون کو بنگال سے برآمد کرتی تھی۔ یورپ ہندوستانی تجارت کی ساخت تبدیل ہو چکی تھی۔ ہندوستان سے یورپ جانے والے اہم درآمدی مال کے طور پر کالی مرچ اور مسالے کی اہمیت کم ہو گئی تھی۔ کپڑے اور کچے ریشم کا حصہ سترہویں صدی کی ابتداء میں یورپ میں کل درآمد کے 16 فیصد سے بڑھ کر صدی کے آخر میں 55 فیصد ہو گیا۔ کور ومنڈل کے علاوہ بنگال جہاں کچے ریشم اور کپڑے کی پیداوار ہوا کرتی تھی وہ بھی ڈچوں کے لیے حصولیابی وفراہمی کا اہم مرکز بن چکا تھا۔

ہندوستان کے ساتھ ڈچ تجارت کی دوسری اہم خصوصیت ہندوستانی اشیاء کے لیے قیمتی دھاتوں میں ادائیگی، ڈچوں کے لیے لازمی تھی۔ یہ ایشیا میں یورپی اشیا کی ان قیمتوں پر فراہمی میں جن کی بنیاد پر مانگ پیدا کی جاسکتی تھی، یورپ کی نااہلیت ثابت کرتی ہے۔اس کا ایک اہم پہلو، یورپ ایشیائی تجارت کے لیے 'اشیا کے بدلے بلین (سونا چاندی) کا یورپی ماڈل' یہ تھا کہ تجارت سے ہونے والا منافع، ایشیا میں یورپی اشیا کی فروخت کے بجائے پوری طرح یورپ میں ایشیائی اشیا کی فروخت سے اخذ کیا جاتا تھا۔ بلین یا قیمتی دھاتوں کے علاوہ ڈچ ہندوستان کو اون، ریشم اور دیگر کپڑے بالخصوص جو لیڈن (Leiden) میں تیار ہوتے تھے اور شراب اور بیر کے علاوہ غیر قیمتی دھاتیں جیسے کہ سیسہ، لوہا اور پارہ برآمد کرتے تھے۔

1663 میں کوچین کے راجا نے ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدد سے پرتگالیوں کو اپنے علاقے سے باہر کرنے میں کامیابی حاصل کی اور پرتگالیوں کو اجارہ داری کی جو رعایتیں حاصل تھیں وہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کو مل گئیں۔ ابتدا میں ڈچ کمپنی نے انڈونیشیا کے جزایر میں حکام کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ مسالوں جیسے لونگ، جائفل اور جاوتری جیسے مسالوں کو حاصل کرنے کے لیے کمپنی کو اجارہ داری حقوق دینے کو منظوری

دیں۔ برصغیر ہند میں بھی ڈچ کمپنی اور مقامی حکمراں ارباب اقتدار نے ان رشتوں کو باہمی طور پر مفید پایا۔ مقامی حکام نے کمپنی کی تجارت کو اپنی آمدنی اور معاشی وسائل میں خالص اضافے کے طور پر دیکھا۔ اس کا فوری فائدہ چنگی محصولات تھے جو کہ مغل خزانے کے لیے وصول کی جانے والی مالگزاری میں اضافے کا سبب تھے۔ مزید برآں، کمپنی ہندوستان سے اشیا کے حصول کے لیے سونا چاندی یا قیمتی دھات لاتی تھی۔ ان دھاتوں کی مقامی گھریلو پیداوار برائے نام تھی اس لیے ہندوستانی نظام زر کے لیے قیمتی دھاتوں کا آتے رہنا ضروری تھا۔ عام طور پر مغل ارباب اقتدار اور دیگر علاقائی طاقتوں کے ذریعہ لگائے جانے والی درآمد برآمد محصولات وہی تھے جو ہندوستانی تاجروں سے حاصل کیے جاتے تھے۔ تاہم مغل انتظامیہ نے ڈچ اور انگلش کمپنیوں کو ہندوستانی عبوری (راہداری) محصول کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا تھا جس سے ان کو ہندوستانی تاجروں کے مقابلے تھوڑی برتری حاصل ہو گئی۔ اس کے علاوہ وہ علاقائی راہداری محصول ادا کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ڈچ اور انگریزی کمپنیاں ہندوستانی بازار میں ہندوستانی تاجروں کے دیگر گروہوں کی طرح عمل کرتی تھیں۔ ان کو نہ تو کوئی خاصی رعایت تھی اور نہ ہی ان کی سرگرمیوں پر کسی طرح کی بندش تھی۔

2.3.2 ڈچ فیکٹریوں کا نظم ونسق (Management of Dutch Factories)

ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی پہلی فیکٹری شمالی کورومنڈل ساحل پر پیتاپولی (Petapuli) میں 1606 میں قائم کی تھی۔ دوسری فیکٹری اسی سال مسولی پٹنم کی بندرگاہ پر قائم کی گئی تھی۔ 1610 میں پولی کٹ (Pulicat) میں ایک فیکٹری قائم کی گئی تھی جو کورومنڈل کے ڈچ انتظامیہ کا ہیڈ کوارٹر بھی بنا۔ 1613 میں پولی کٹ میں گیلڈریا (Geldria) قلعے کی تعمیر کی گئی تھی۔ کورومنڈل فیکٹریوں کا مجموعی کنٹرول گورنر کو دیا گیا تھا۔ مسولی پٹنم فیکٹری کا سربراہ انتظامیہ میں دوسرے درجے پر تھا اور اسے 1621 میں صدر بنایا گیا۔ 1690 میں کورومنڈل حکومت کا صدر مقام جنوبی کورومنڈل ساحل میں پولی کٹ سے ناگاپتنم (Nagapattinam) منتقل کر دیا گیا۔ 1680 میں کورومنڈل ساحل کے ان تجارتی اداروں میں صرف 441 افراد کا عملہ تھا جن میں سے مختلف کام انجام دے رہے 233 افراد ہندوستانی تھے۔ 208 یورپی کارکنان میں صرف 128 فوجی تھے جس میں ایک لفٹنٹ 5 سارجنٹ اور 7 کارپورل شامل تھے۔ ان میں سے زیادہ تر فورٹ گلیڈریا میں مقیم تھے۔ باقی شہری انتظامیہ کمپنی کے تجارتی کاموں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور یہ صدر کاروباری گماشتے، گماشتے، ماتحت گماشتے اور معاون کلرک پر مشتمل تھا۔ فصیل بند فیکٹری احاطہ لوگوں کے رہنے کے لیے کوارٹر اور قیمتی اشیا کے لیے اسٹور ہاؤس دونوں کا کام کرتا تھا۔ اسی طرح کے ادارے مالابار اور گجرات میں بھی قائم کئے گئے۔ بنگال اور گجرات میں فیکٹریوں کی نمایاں خصوصیت (بحیثیت ملازم) فوجی عملے کا نہ ہونا تھا۔ اسی لیے بنگال اور گجرات میں ڈچ اور یورپی عہدیدار تجارتی فرائض کو ہی زیادہ تر انجام دیتے تھے۔ حتیٰ کہ ہگلی میں قانون نافذ کرنے والے افسر (مالیات) کا خاص کام کمپنی کے گماشتوں کے ذریعہ غیر قانونی طور پر کی جانے والی نجی تجارت کو روکنا تھا۔ 1665 میں بنگال فیکٹریوں کو آزاد نظامت کے تحت منظم کیا گیا تھا جو کہ پولی کٹ حکومت کے کنٹرول سے آزاد تھی۔

ہگلی میں بنیادی فیکٹری بنگال کی ڈچ انتظامیہ کا صدر مقام بنی۔ اس فیکٹری میں خاص انتظامی کونسل تھی جس کا سربراہ گورنر یا ڈائرکٹر ہوا کرتا تھا۔ ہگلی کونسل میں ڈائرکٹر کے علاوہ، کمپنی کے حساب کتاب کے انچارج صدر فیکٹر (گماشتہ)، قانون نافذ کرنے والے افسر، فیکٹری

کے گوداموں کا انچارج فیکٹر اور بعض دیگر گماشتے یا عوامل پر شامل تھے۔ ایک کونسل جو کہ صدر فیکٹر کے ماتحت تھی ہر ماتحت فیکٹری کی نگراں تھی۔ صدر منتظم کا دفتر جو بٹاویہ (Batavia) بھیجے جانے سے قبل کورومنڈل ساحل پر سبھی فیکٹریوں کے حسابات کی دیکھ بھال کرتا تھا، وہ کورومنڈل کی فیکٹریوں کی نگرانی کرتا تھا۔ کورومنڈل ساحل کے لیے ایک عدالتی کونسل بھی تھی جس کو ساحل پر فیکٹریوں کے ڈچ ملازمین کا فیصلہ کرنے اور انہیں سزا دینے کا اختیار حاصل تھا۔ جاوا میں بٹاویہ کے مقام پر گورنر جنرل اور اس کی کونسل ایک بڑے ادارے کے ساتھ پوری تجارتی سلطنت کو منظم کرتی تھی۔ یہ کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس جسے *Heren XVII* کے طور پر جانا جاتا تھا اور ایشیا میں کمپنی کے مفاد کے درمیان وسطی انتظامی ادارہ تھا۔ ابتدائی طور پر یہ وسطی انتظامی ادارہ بانتم (Bantam) میں واقع تھا لیکن بعد میں 1619 میں بٹاویہ میں منتقل ہو گیا تھا۔ یہ کمپنی کا مشرقی ہیڈ کوارٹر بنا اور صدر فیکٹری اور بورڈ آف ڈائرکٹرس کے درمیان اہم کڑی بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ پورے ایشیا سے سامان ہالینڈ بھیجے جانے سے قبل بٹاویہ میں اکٹھا کیا جاتا تھا۔ بین ایشیائی تجارت میں ڈچ کمپنی کی وسیع طور پر شرکت (جو کہ اسے انگلش اور فرانسیسی کمپنیوں سے منفرد کرتی تھی) بٹاویہ سے دی جانے والی ہدایات کے ذریعہ ممکن ہوئی۔ ڈچ ایسٹ کمپنی نے اپنی بحری برتری کا استعمال کرتے ہوئے، ہندوستانی تجارت پر کنٹرول کرنے کے لیے پرتگالیوں کے ذریعہ فروغ دیے گئے ادارہ جاتی ذرائع جیسے کرتاز اور کیفیلا کو اختیار کیا۔ ہندوستانی جہاز جو اپنے تختوں کو صحیح جگہ پر گرفت میں رکھنے کے لیے رسی اور سخت چوبی کیل پر منحصر تھے، اس میں اندر سے بھاری توپ سے بمباری برداشت کرنے کی نہ تو مضبوطی تھی اور نہ ہی بڑی توپوں کے پیچھے کی طرف دھکے کو برداشت کرنے کی صلاحیت۔ اعلیٰ ترین بحری قوت کے باوجود ڈچ، اجازت نامہ یا پاس نظام کو موثر طور پر نافذ کرنے کے ہمیشہ اہل نہیں ہو پائے تھے۔ مثال کے طور پر ڈچ کمپنی نے 1641 میں ملکا کی اپنی فتح کے بعد ہندوستانی جہازوں کے ملکا کے شمال میں ٹن بندرگاہوں تک پہنچنے پر پابندی لگانے اور بعد میں جزیرہ نما ملایہ میں بنیادی ٹن پیداکار خطے کے ساتھ ایک اجارہ داری معاہدہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہندوستانی جہاز آسانی سے ڈچ کنٹرل سے بچ نکلتے تھے کیونکہ وہ شمالی سماترہ میں خلیج بنگال کی بندرگاہ آچیہ (Acheh) جو خطے کا بہت بڑا عبوری مال گودام تھا، تک آزادانہ رسائی رکھتے تھے۔ مزید برآں ڈچ کمپنی کو گجرات میں جوابی کارروائی کی شکل میں ہونے والے نتائج کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

2.3.3 ہندوستانی سماج اور ریاست پر ڈچ 'سلطنت' کا اثر

(Impact of Dutch 'Empire' on Indian Society and State)

ہندوستان کے مشرقی اور مغربی دونوں ساحلوں پر بندرگاہ شہروں کی بڑھتی تعداد، یورپی تجارتی کمپنیوں کی تجارتی سرگرمیوں کا نتیجہ تھی۔ ابتدائی دور میں، بندرگاہ، تاجروں اور اندرون ملک واقع مضافاتی علاقوں کی بحری تجارتی سرگرمیوں کے درمیان محض ایک کڑی تھے۔ یہ بندرگاہ یورپی کمپنیوں (اقتدار کے خود مختار مقامات) کے ماتحت آچکے تھے۔ چونکہ وہ ایک اجنبی ملک اور بھرپور مخالف ماحول میں کام کر رہے تھے اس لیے انہوں نے فوری طور پر دفاعی مورچہ بندی کی کوشش کی تاکہ وہ خود کا دفاع کر سکیں۔ پولی کٹ کی ڈچ بندرگاہ قلعہ گیلڈریہ میں بندوقوں کے ذریعہ تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ ڈچوں نے ہندوستان میں علاقائی سلطنت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی، تاہم انہوں نے جاوا اور مسالوں کے جزائر میں ایک مضبوط علاقائی بنیاد قائم کرنے کے ذریعہ فرانسیسی اور انگریز کمپنیوں کے لیے پہلے ہی مثال قائم

کردی تھی۔

بندرگاہ شہروں میں مختصر یورپی برادری، ہندوستان میں ریاست اور سماج کی ساخت پر کوئی خاص اثر نہیں ڈال سکی۔ کمپنیوں نے قابل برآمد اشیا حاصل کرنے کے لئے ہندوستان میں دستیاب پیداوار اور حصولیابی کے موجودہ نیٹ ورک کو ہی استعمال کیا، اگرچہ رفتہ رفتہ انہوں نے بعض مخصوص مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں کچھ اصلاحات بھی شروع کیں۔ یورپیوں نے دلالوں (یعنی وہ ہندوستان ملازم جو ہندوستانی تاجروں کے ساتھ معاملات میں مددگار اور مقامی بازاروں کی گہری معلومات رکھتے تھے) کی خدمات سے بھی استفادہ کیا۔ اگرچہ بعض مواقع پر ہندوستانی حکمرانوں اور ڈچ لوگوں کے درمیان جھگڑے بھی ہوئے لیکن ڈچ اس حیثیت میں نہیں تھے کہ وہ حکمرانوں کو اپنے تابعدار بناتے۔ ہندوستانی حکمرانوں نے ڈچ کمپنی کی تجارت کو فائدہ مند پایا۔ ہندوستان میں سونا اور چاندی درآمد ہونے سے سونا چاندی اور قیمتی دھاتوں کی فراہمی میں کافی اضافہ ہوا۔ معیشت میں بڑھتے زر کے چلن (monestisation) کے سبب زمینی محاصل کے نقد مطالبے سے لین دین میں بھی سہولت پیدا ہوئی۔ اس سے مبادلہ بازار اور تجارت میں مزید اضافہ ہوا۔ بینکنگ فرموں کے اضافے میں بھی مدد ملی جو کہ تجارت کے پھیلاؤ کے لئے نہایت اہم تھیں۔ اسی سیاق و سباق میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کو پولی کٹ میں فورٹ گیلڈریا میں ٹکسال چلانے کی اجازت ملی اور 1658 میں انہیں ناگاپٹنم کی ٹکسال سے پگوڈا جاری کرنے کی رعایت بھی حاصل ہوئی۔

2.4 فرانسیسی نوآبادیت (The French Colonisation)

فرانسیسیوں نے 1668 میں سورت کے مقام پر ہندوستان میں اپنی پہلی فیکٹری قائم کی۔ اس کے کچھ عرصے بعد فرانکوئس مارٹن (Francois Martin) نے 1674 میں پانڈیچری (Pondicherry) میں فیکٹری قائم کی جو ہندوستان میں فرانسیسیوں کے ہیڈ کوارٹر کے طور پر ابھری۔ دیگر یورپی تجارتی کمپنیوں کی طرح فرانس نے بھی بالاسور، مسولی پتنم، چندرناگور، تیلی چیری اور کالی کٹ میں دیگر فیکٹریاں قائم کیں۔ زیادہ تر تجارتی مراکز ستر ہویں اور اٹھارہویں صدی میں بہار اور بنگال میں قائم کیے گئے۔

2.4.1 فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی (The French East India Company)

فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی جس کا اصل نام 'Campaignie des Indes Orientales' تھا، ریاست کی مالی امداد سے 1664 میں شروع کی گئی تھی۔ کمپنی کی تشکیل میں بنیادی تحریک، فرانس کے تجارتی مفکر، جے۔ بی کولبرٹ کے خیالات سے حاصل ہوئی۔ 1644 میں اس کا سرمایہ ڈچ کمپنی کا صرف نصف ہی تھا۔ کمپنی کا ابتدائی سرمایہ 1665 میں 8 ملین لیورس (Livers) تھا جو کہ 1670 میں بڑھ کر 12 ملین لیورس ہو گیا۔ ریاستی مالیات اور انتظامیہ نے اس عمل میں اپنی جواب دہی اور ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبھایا۔ صرف 16 فیصد حصہ کے حاملین (stockholders) جہاز کے مالک تاجر اور 8 فیصد کے سرمایہ فراہم کار تھے جبکہ بقیہ حصے پر شاہی خاندان اور طبقہ امراء کا قبضہ تھا۔ کمپنی کی قسمت یورپی جنگوں کی غیر یقینی صورت حال پر منحصر تھی۔ 1675 کے بعد کمپنی بحیرہ ہند میں سال میں صرف چار جہاز چلایا کرتی تھی اور 1680 میں اس نے اپنے شیئر مالکوں کو منافع ادا کرنا بھی روک دیا۔ اس نے اب اپنے تجارتی حقوق کی

نمائندگی ایک نجی کاروباری ادارے 'Messieurs de saint Malo' کو سونپ رکھی تھی جس کے زیر انتظام اس نے پھر منافع کمانا شروع کیا۔ تاہم فرانسیسی ریاست نے اس کے تجارتی حقوق 1719 میں واپس لے لیے اور ایک نئی کمپنی 'Compaignie Perpetuelle des Orientales' قائم کی جس کے سرمایہ وسائل 300 ملین لیورس تھے۔ اس کمپنی نے 1769 تک کام کیا۔ اس کے بحری بیڑے کی طاقت 10 سے بڑھ کر 75 جہاز ہو گئی۔ نئی کمپنی نے بین ایشیائی تجارت میں بھی حصہ لیا، اگرچہ یورپ ایشیائی تجارت اب بھی اہم بنی رہی۔ فرانس کے ذریعہ ہندوستان سے برآمد کیے جانے والے اہم سامانوں میں سفید سوتی کپڑے، ململ، رنگین کپڑے، کالی مرچ، شورہ، سرخ لکڑی اور صدف (سیپی و کوڑی) شامل تھے۔ وہ ہندوستان میں الکوحل، شراب، مونگا، سونے کے دھاگے اور لوہے کی اشیا بھیجا کرتے تھے۔ ہندوستان سے برآمد کی جانے والی اشیا کی قیمت ہندوستان کو درآمد کی جانے والی اشیا کی قیمت سے کہیں زیادہ ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی یہ گھاٹا، درآمد کی گئی اشیا کے 75 فیصد تک پہنچ جاتا تھا۔ قیمتی دھاتوں کی ہندوستان درآمد سے اس گھاٹے کا بڑا حصہ ہوتی تھی۔ فرانسیسی کمپنی ہمسر ڈچ اور انگلش کمپنیوں کی طرح ہندوستانی تاجروں کی خدمات کا استعمال گماشتوں کی طرح کرتی تھی۔ وہ ہندوستانی دستکاروں سے اشیا کو حاصل کرنے کے لیے پیشگیوں کے نظام کا بھی استعمال کرتے تھے۔ فرانسیسی اپنے مالی بحران پر قابو پانے کے لیے کبھی کبھی ٹیکسوں کے نام پر ہندوستانی تاجروں سے خراج وصول کرتے تھے۔ چیٹی (Chetti)، مڈلیر (Mudaliar) اور پلئی (Pillai) ذاتوں کے ہندوستانی تاجر فرانسیسیوں کو ادھار دیتے تھے اور ادھار پر اشیا فراہم کرتے تھے۔ یہ ہندوستانی تاجر تنازع کی صورت میں مقامی حکمرانوں اور فرانسیسیوں کے درمیان صلح بھی کراتے تھے۔

2.4.2 تجارتی سلطنت سے علاقائی سلطنت میں منتقلی

(Transition from Commercial Empire to a Territorial Empire)

فرانسیسیوں کا ابتدائی قبضہ پرتگالیوں اور ڈچ جیسا ہی تھا۔ فرانسیسی کمپنی نے 1721 میں مالابار ساحل میں ماہے پر قبضہ کر لیا تھا اس کے بعد 1731 میں ینام اور 1758 میں کرائی کل پر قبضہ کر لیا۔ پانڈیچری فرانسیسیوں کا ہیڈ کوارٹر بنا جہاں 1700 تا 1707 میں فورٹ لوئس بھی تعمیر کر لیا گیا تھا۔ 1741 تک 1,20,000 کی آبادی کے ساتھ یہ ایک بڑا بندرگاہ شہر بن چکا تھا۔ یہ سبھی کوششیں کمپنی کے آسانی کے ساتھ کام کرنے کے لیے مطلوبہ تجارتی نیٹ ورک قائم کرنے کا حصہ تھیں۔ فرانسیسی گورنر ڈیومس (Dumas) اور جوسف فرکو نکوئس ڈپلیکس (Joseph Francois Dupleix) ہندوستان میں ایک علاقائی نوآبادی قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ اس طرح کی علاقائی سلطنت سے محصولات اکٹھا کیا جا سکے جس سے ہندوستان میں تجارتی اشیا خریدنے کے لیے قیمتی دھاتوں کو لانے کی ضرورت نہ رہے۔ تاہم، کمپنی کے فرانسیسی حصص مالکوں کو ایسی نوآبادیاتی مہم جوئی کے لیے بھاری لاگت ادا کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ فرانسیسیوں کے اس طرح کی سامراجی عزائم کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے مخالفت، ڈپلیکس کے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے میں ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ تاہم اس کے کمانڈروں کو اس وقت کچھ عارضی کامیابی ملی جب لابورڈونیس نے 1746 میں مدراس پر قبضہ کر لیا اور 1750 میں جنجی پر بسی نے فتح حاصل کی۔ مارکیس دی بسی (The Marquis de Bussy) جو ڈپلیکس کے ماتحت رہا تھا، دکن میں فرانسیسی عملداری قائم

کرنے میں زیادہ کامیاب تھا۔ نظام الملک کی موت کے بعد جانشینی کی جنگ نے دکن کی سیاست میں فرانسیسیوں کو مداخلت کرنے کا ایک موقع فراہم کر دیا۔ انہوں نے نظام کے دوسرے بیٹے ناصر جنگ جسے انگریزوں نے تسلیم کیا تھا، کے مقابلے نظام کے پوتے مظفر جنگ کی حمایت کی۔ مظفر جنگ امبور 1749 کی جنگ میں فاتح بن کر ابھرا اور کرشاندی کے جنوب کے سبھی علاقوں کے لئے اس نے ڈوپلیکس کو اپنا نائب مقرر کیا۔ اس نے فرانسیسیوں کے حمایت یافتہ چاند صاحب کو ارکاٹ کا حکمراں تسلیم کیا۔ مسولی پٹنم کی سرکار (Sarkar) کو فرانسیسیوں کو ہدیہ کر دیا گیا اور انہیں کرناٹک کے تمام مالگذاری وسائل عطا کئے گئے۔ فرانسیسی افواج کا ایک مستقل دستہ نئے نظام کے زیر انتظام رکھا گیا تھا۔ مظفر جنگ کی موت کے بعد صلابت خاں تخت نشین ہوا تب اس نے فرانسیسیوں کو کچھ مزید سرکاریں عطا کیں۔ اس سے تقریباً پورا کورومنڈل ساحل فرانسیسی عملداری کے تحت آگیا۔ فرانسیسی دستے کے نفری بڑھ کر 2000 ہوگئی۔ نظام کے دربار اور انتظامیہ میں بسی کو زبردست اختیارات حاصل تھے۔ فرانسیسی علاقائی سلطنت کے خواب کو پورا کرنے کے بالکل قریب ہی تھے۔ لیکن ڈپلیکس کو 1754 میں کرناٹک میں اس کے تباہ کن تجربے کے بعد بلالیا گیا۔ گوڈے ہیو (Godeheu)، اس کا جانشین تھا جو انگریزوں کے خلاف فرانسیسی موقف کے دفاع میں ناکام رہا۔ اگرچہ ہندوستان میں فرانسیسی فوجی مہم کے کمانڈر کومٹے ڈی لیلی (Comte de Lally) نے 1758 میں کڈالور پر عارضی طور پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن اس کے موقع ناشناس ہونے کے سبب پانڈیچیری اور چندرنا گور پر انگریزوں کا قبضے ہو گیا۔ فرانسیسیوں کو چندروتی اور ونڈی وش میں بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس طرح وہ علاقائی حکومت قائم رکھنے میں اہل نہیں ہو پائے، بلکہ پیرس معاہدہ (1763) کے اختتام کے بعد جس کے تحت برطانیہ اور فرانس کے درمیان سات سال کی جنگ ختم ہوئی تھی، فرانسیسی طاقت مغلوب ہو گئی۔

پیرس کے معاہدے (1763) کے بعد ہندوستان کے فوجی اور سیاسی معاملوں میں فرانسیسی جو اہم کردار ادا کرتے تھے اس سے دست بردار ہو گئے۔ تاہم فرانسیسیوں نے انگریزوں کو راستہ دکھا دیا کہ علاقائی سلطنت قائم کرنے کے طریقے اور ذرائع کیا تھے۔ فرانسیسی ایک معنی میں نوآبادیت کے پیش رو تھے۔ 1762 میں بیجاپور کے سلطان سے پانڈیچیری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اسے بندرگاہ شہر کے طور پر فروغ دیا۔ فرانسیسی کوارٹروں میں ہندوستانی تعمیراتی تکنیکوں کی بعض خصوصیات کو شامل کرتے ہوئے اونچی دیواروں اور علاحدہ باغیچوں کے ذریعہ انھوں نے اپنی انفرادیت قائم کی۔ بعد میں برطانوی نوآبادکاروں نے برادریوں اور مذہب کی علاحدگی کی بنیاد پر اپنی بستیوں کو فروغ دیا۔

2.4.3 ہندوستانی ریاستوں میں فرانسیسی پیشہ ور فوجیوں کا کردار

(Role of French Professional Soldiers in Indian States)

ہندوستانی حکمرانوں کی ملازمت میں پیشہ ور فوجیوں کے طور پر فرانسیسیوں کا کردار کافی اہم رہا تھا۔ ہندوستانی مسلح دستوں کی تنظیم اور کمان میں فرانسیسیوں کو مہارت حاصل تھی۔ ان فوجیوں کو فرانس میں اتنی تنخواہ نہیں دی جاتی تھی اور عام فوجی، افسران کے عہدے کی خواہش نہیں رکھ پاتے تھے کیونکہ اس پر طبقہ امراء کا غلبہ تھا۔ ہندوستانی حکمراں فرانسیسی سپاہیوں کو فراخدلانہ تنخواہ دینے کے لیے آمادہ تھے اور اگر کوئی فوجی باصلاحیت ہوتا تو اس کے لئے اس کی عہدے اور حیثیت میں ترقی کے بھی بھرپور مواقع تھے۔ لہٰذا، فرانسیسی کرائے کے فوجیوں یا

پیشہ ور سپاہیوں کی بڑی تعداد ہندوستانی حکمرانوں کی افواج میں کام کرتی تھی۔1764 کی بالکل ابتدا میں یوسف خاں نے مدورائی میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی اور فرانسیسی سپاہیوں اور افسروں کی مدد سے دو طویل محاصروں کے ساتھ مزاحمت کی۔ فرانسیسی تربیت یافتہ ہندوستانی فوجیوں نے ہندوستانی حکمرانوں کے سامنے کئی طرح سے اپنی برتری ثابت کی۔انہوں نے جنگ کے دوران کنٹرول قائم رکھنے کے لئے کمان کا نظام مراتب فراہم کیا۔ فوج کی نئی تنظیم میں حسب معمول ڈرل (مشق) کی ضرورت رہتی تھی اس طرح وہ صف آرائی یا لام بند ہونے کی ایک بڑی تربیت کے ساتھ بہتر طور پر بندوقوں (تفنگ) سے لیس ہوتے تھے اور ان کو پیچھے سے تیز فائر کرنے والی توپوں کا سہارا ملتا تھا جس سے وہ ہلاکت خیز اثر ڈال سکتے تھے۔اس سے گھڑ سواروں کے رسالے کے امدادی کردار اور حیثیت میں کمی آئی اور جنگوں میں پیادہ فوج خاص سہارا بن کر ابھری۔ لیکن ان کی صلاحیت اور ڈسپلن میں اضافے کے لئے باقاعدگی کے ساتھ ان کی تربیت ضروری بن گئی۔ ہندوستانی حکمراں اپنے فوجیوں کی از سر نو تنظیم، نئے سرے سے لیس کرنے اور تربیت دینے کے لئے فرانسیسیوں کی خدمات کا استعمال کرتے تھے۔ فرانسیسیوں نے فوجی انجینیرنگ جیسے قلعہ بندی اور بندوقوں کے استعمال سے متعلق معاملوں میں کافی مدد کی۔ سری رنگا پٹنم، پال گھاٹ، ادے گری اور علی گڑھ کی قلعہ بندی فرانسیسی فوجی تعمیر کی بعض اہم مثالیں ہیں۔

مائیکل جوکم میری ریمنڈ (Michel Joachim Marie Raymond) میسور فوج کی کمان سنبھالنے میں خود کی پہچان قائم کر لینے کے بعد 1786 میں نظام کی خدمت میں آیا۔ اس نے اپنے ماتحت فوجی دستے کارپس فرینکوئس ڈی ریمنڈ (Corps Francois de Raymond) کی تنظیم کی جس کی تعداد 11,000 تک پہنچ چکی تھی۔ وہ 'امین جنسی' (توپ خانے کا نگراں) بنا اور توپوں کو تیار کرنے کے لئے ایک بندوق کارگاہ قائم کی۔ نظام نے اسے بہت سے خطابات سے نوازا اور اس کے علاوہ سات لاکھ کی نجی جاگیر عطا کی۔ دوسرا ممتاز فرانسیسی کمانڈر ڈی بوئیگن (De Boigne) تھا جس نے مہادجی سندھیا کے ماتحت کام کیا، اس نے فرانسیسی نمونے پر فوجی دستوں کی تنظیم کی جن کی قوت 50,000 افراد تک پہنچ گئی تھی۔ اسے ہندوستان کے وائسرائے کا خطاب، کافی تنخواہ اور زرخیز جمنا دوآب میں اپنی افواج کی دیکھ بھال کے لئے جاگیر دی گئی۔ اس کے مشہور دستے کی ترکیب بعد کی برٹش انڈین فوج سے مشابہ تھی جس میں جاٹوں، سکھوں، افغانوں اور راجپوتوں وغیرہ سے فوجی بھرتی کیے جاتے تھے۔ اسی طرح استاچ ڈیلانوئے (Eustachius De Lannoy) ایک ادنی حیثیت سے تراونکور کے حکمراں رام ورما کی 50,000 مضبوط فوج کا کمانڈر بنا۔ اس نے ادے گری قلعہ کی قلعہ بندی کرائی اور ایک بندوق کارگاہ اور بارود کا کارخانہ بھی قائم کروایا۔ اگرچہ میسور کی فوجی تنظیم میں فرانسیسی افسروں کی کمان میں کوئی علاحدہ اکائی نہیں تھی لیکن فرانسیسی کمانڈر، سپاہیوں اور انجینیروں نے میسور فوج میں ایک اہم کردار نبھایا۔ اسی طرح الارڈ (Allard) اور وینٹورا (Ventura) نے رنجیت سنگھ کی خاص فوج کو منظم کیا جو کہ گھڑ سواروں کے دو دستوں، پیادہ فوج کی چار پلٹنوں اور اعلیٰ ترین فرانسیسی کمان کے تحت 24 توپوں کے توپخانے پر مشتمل سبھی بازوؤں کی مربوط تشکیل تھی۔ درحقیقت رنجیت سنگھ کی فوج کی تقریباً ایک تہائی فوج کی تربیت یورپی انداز سے ہوئی تھی اور قابلیت کی بنیاد پر ترقی کے اصول پر مبنی تھی۔ سماج میں یہ فوج ایک طرح کی بے قاعدگی پر مبنی تھی جہاں فرد کی حیثیت اور درجہ اس کی پیدائش پر منحصر تھا۔ فرانسیسیوں نے نہ صرف ایسے ہندوستانی نظام ریاست میں اپنی جاگیروں میں مالیاتی اور عدالتی

اختیارات استعمال کیے بلکہ انہوں نے ان میں نمایاں اثر ورسوخ بھی قائم کیا۔

2.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں آپ نے ابتدائی یورپی تجارتی کمپنیوں کی سرگرمیوں کے بارے میں پڑھا۔ یورپی تجارتی کمپنیوں نے بحری تجارت میں اجارہ داری قائم کرنے کے ذریعہ اپنی 'تجارتی سلطنتیں' قائم کیں۔ سمندر پر یورپیوں کی مکمل برتری اس طرح کی سلطنتوں کے قیام میں کافی اہم تھی۔ ان سلطنتوں کی سرگرمیاں اکثر برصغیر ہند کے ساحلی علاقوں تک محدود رہیں اور انہوں نے حصولیابی، تجارت اور مالیات کے موجودہ نیٹ ورک سے استفادہ کیا۔ یورپ اور ہندوستانی تجارت کا توازن، ہندوستان کے لئے موافق تھا اور ہندوستان اپنے برآمدات سے 'بلین' (سونا چاندی) کی کثیر مقدار کماتا تھا۔ اس طرح یورپی تجارتی کارپوریٹ گھرانوں کی غیر ملکی تجارت سے ہندوستانی معیشت کو کافی فائدہ پہنچا۔ اگرچہ یورپی کمپنیوں اور ہندوستانی حکمرانوں میں تجارت کے کنٹرول کو لے کر کبھی کبھی جھگڑے پیدا ہو جاتے تھے لیکن بڑے پیمانے پر طاقت کا استعمال کبھی نہیں ہوا۔ یورپی کمپنیوں کی دستیاب افرادی قوت محدود تھی اور وہ مقامی حکمرانوں کو چنوتی دینے کی حیثیت میں نہیں تھے۔ فرانسیسیوں نے نئے قسم کی پیشہ ورانہ تربیت یافتہ پیادہ فوج، جسے بڑے پیمانے پر مربوط حملوں کے لئے لام بند کیا جاسکتا تھا، کی طاقت کی بنیاد پر سب سے پہلے علاقائی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ فرانسیسی تجربہ ناکام ہوا لیکن بعد میں انگریزوں نے سلطنت کی تعمیر میں فرانسیسی نمونے کا کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔

2.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

بلین : سونا چاندی یا قیمتی دھات وغیرہ۔

کرتاز : پرتگالی بحری تجارتی اجازت نامہ یا لائسنس۔

راس امید : راس امید (Cape of Good Hope) جنوبی افریقہ کا ایک ساحلی شہر

کیفیلا : مقامی تجارتی جہاز۔

دلال : وہ ہندوستان ملازم جو ہندوستانی تاجروں کے ساتھ معاملات اور مقامی بازاروں کی گہری معلومات رکھتے تھے۔

پگوڈا : کرنسی کی اکائی تھی، سونے یا آدھے سونے سے بنا سکہ جو ہندوستانی خاندانوں کے ساتھ ساتھ برطانوی، فرانسیسی اور ڈچوں نے اپنایا تھا۔

لیور : 781 سے 1794 تک مملکت فرانس اور اس کی پیشرو ریاست مغربی فرانسیا کی کرنسی۔

2.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

2.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. واسکوڈی گاما کالی کٹ کب پہونچا؟
2. واسکوڈی گاما کس ملک کا رہنے والا تھا؟
3. پرتگالیوں نے گوا پر قبضہ کس سال کیا؟
4. ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کب وجود میں آئی؟
5. ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی پہلی فیکٹری کہاں قائم کی؟
6. کرتاز (*Cartaz*) کیا ہے؟
7. کیفیلا کیا ہے؟
8. راس امید (Cape of Good Hope) کس ملک میں ہے؟
9. فرینچ ایسٹ انڈیا کمپنی کب وجود میں آئی؟
10. فرانسیسیوں نے اپنی پہلی فیکٹری کہاں قائم کی؟

2.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. پرتگالیوں کے ہندوستان آمد پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. پرتگالیوں کے تجارتی ذرائع پر نوٹ لکھیے۔
3. ڈچ تجارت کی کیا نوعیت تھی ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
4. ہندوستانی سماج اور ریاست پر ڈچ سلطنت کا کیا اثر تھا نوٹ لکھیے۔
5. فرانسیسی کمپنی تجارتی کمپنی سے علاقائی سلطنت میں کیسے تبدیل ہوئی؟ ایک نوٹ لکھیے۔

2.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. پرتگالیوں نے تجارت کو کس طرح مضبوط کیا؟ تفصیل سے لکھیے۔
2. ڈچ فیکٹریوں کے نظم و نسق پر مفصل لکھیے۔
3. ہندوستانی ریاستوں میں فرانسیسی پیشہ ور فوجیوں کے کردار پہ روشنی ڈالیے۔

2.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
2. Dalrymple, William, *The Anarchy*: *The East India Company*, *Corporate Violence*, *and the Pillage of an Empire*, Bloomsbury Publishing, London, 2019.
3. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019.
4. Durant, Will, *The Case for India*, Standard Book Stall, Mumbai, 2007.
5. Freedman, Paul, *Out of the East*: *Spices and the Medieval Imagination*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2008.
6. Gandhi, Rajmohan, *A History of Modern South India*: *A History from the 17th Century to Our Times*, Aleph book Company, New Delhi, 2018.
7. Metcalf, Barbara D. and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).
8. Pearson, M.N., *The Portuguese in India*: *The New Cambridge History of India*, Cambridge University Press, Cambridge, 2006 (first pub. 1987).
9. Roy, Tirthankar, *The East India Company*: *The World's Most Powerful Corporation*, Allen Lane/ Penguin, New Delhi, 2012.
10. Subramanian, Lakshmi, *History of India*, *1707–1857*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.
11. Wilson, Jon, *India Conquered*: *Britain's Raj and the Chaos of Empire*, Simon and Schuster, London and New Delhi, 2017.

اکائی 3۔ برطانوی حکومت کا قیام

(Foundation of the British Rule)

اکائی کے اجزا

3.0		تمہید
3.1		مقاصد
3.2		برطانوی فتح کے وقت ہندوستان کی حالت
3.3		ایسٹ انڈیا کمپنی: عروج اور ارتقا
	3.3.1	کمپنی کی داخلی تنظیم
	3.3.2	ہندوستان میں کمپنی کی فیکٹریوں کی تنظیم
3.4		جنوبی ہند میں انگریزی فرانسیسی جدوجہد
3.5		بنگال پر انگریزوں کا قبضہ
	3.5.1	پلاسی کی جنگ
	3.5.2	بنگال کی معاشی لوٹ کھسوٹ
	3.5.3	بنگال میں دوعملی
3.6		اکتسابی نتائج
3.7		کلیدی الفاظ
3.8		نمونہ امتحانی سوالات
	3.8.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	3.8.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	3.8.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
3.9		مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

3.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان میں برطانوی راج کا قیام ہندوستانی تاریخ کا اہم ترین سنگ میل ہے۔اس نے ہندوستانی لوگوں کی زندگی کے ہر پہلو میں دور رس تبدیلیاں لائی ہیں۔اس امر کا مطالعہ انتہائی حیران کن اور بہت دلچسپ بھی ہوگا کہ کیسے ایک تجارتی کمپنی، جس نے پہلے پہل ہندوستانی حکمرانوں سے تجارتی سرگرمیاں شروع کرنے کی اجازت مانگی تھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ملک کی حکمران بن گئی۔کیسے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اتنی طاقتور ہوگئی؟اس طویل عمل میں کن عوامل نے کردار ادا کیا؟اس نے کیا طریقہ کار اپنایا؟اس نے کیسے ہندوستان کو انچ بہ انچ فتح کیا؟ہندوستان کی فتح میں اسے اپنے لیے کیا فوائد مضمر نظر آئے؟اور،اس نے ہندوستانی اداروں کو ایک ایک کر کے کیسے تباہ کیا؟یہ کچھ پہلو ہیں جنہیں ہم اس اکائی میں ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

3.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان آنے کو سمجھ سکیں گے۔
- کمپنی کی مختلف تجارتی سرگرمیوں کو سمجھ سکیں گے۔
- کمپنی کی سیاسی امنگوں کی وجوہات،اور ان کے حصول کے ذرائع کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- اٹھارویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی حالات کا اندازہ لگا سکیں گے۔
- ان دو فیصلہ کن لڑائیوں کو سمجھ سکیں گے جنہوں نے ہندوستانی تاریخ کا رخ بدل دیا۔
- بنگال میں کمپنی کی جابرانہ حکمرانی اور لوٹ کھسوٹ کو سمجھ سکیں گے۔

3.2 برطانوی فتح کے وقت ہندوستان کی حالت (India on the Eve of British Conquest)

ہندوستان کی فتح اور اس کے بعد کے دور میں انگریزوں نے خود کو ایک 'تہذیبی مشن' پر سمجھا،اور ہندوستان میں اپنی آمد اور حکمرانی کو 'خدائی انتظام' کہا۔انہوں نے یہ مفروضہ قائم کیا اور اسے دہرایا کہ ہندوستان ہمیشہ سے پسماندہ ملک رہا ہے، جہاں غیر مہذب لوگ آباد ہیں۔ یہ ایک جامد معاشرہ تھا جو برسوں سے ایسا ہی چلا آرہا تھا۔اس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی ممنوع تھی۔اس کے علاوہ ہندوستانی تہذیب میں کوئی بھی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔انہوں نے اپنی غیر ملکی حکمرانی کو قانونی حیثیت دینے کے لیے اس طرح کے متعصبانہ خیالات کو پھیلایا۔لیکن کیا ہندوستان ویسا ہی تھا جیسا کہ انگریزوں نے اسے سمجھا اور دنیا کے سامنے پیش کیا؟ بہت سے ماہرین نے ہندوستان کے بارے میں برطانوی متعصبانہ تصورات کو سختی سے مسترد کر دیا۔اپنی کتاب *India In Bondage : Her Right to Freedom* میں امریکی وزیر Jabez T. Sunderland نے پرزور طریقے سے کہا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جس ہندوستان کو فتح کیا وہ کوئی قدیم یا قبائلی ملک نہیں تھا بلکہ اس نے تہذیبی سطح پر بہت سی حیران کن کامیابیاں حاصل کی تھیں۔وہ لکھتا ہے:

ہر اس قسم کی مصنوعات جسے مہذب دنیا جانتی ہے، انسانی دماغ اور ہاتھ سے تخلیق کردہ تقریباً ہر قسم کی تخلیق، چاہے وہ کہیں بھی ہو اور چاہے وہ اپنی خوبصورتی کے لیے جانی جاتی ہو یا افادیت کے لیے، وہ طویل عرصہ سے ہندوستان میں تیار کی جاتی تھی۔ ہندوستان یورپ یا ایشیا میں کسی بھی دوسری ریاست سے کہیں زیادہ صنعتی اور مصنوعات کی تیاری کرنے والا ملک تھا۔ اس کی کپڑے کی مصنوعات سوتی، اون، کتان اور ریشم سے بنی اس کے کرگھوں کی عمدہ پیداوار پوری مہذب دنیا میں مشہور تھی۔ اسی طرح اس کے شاندار جاذب نظر زیورات اور اس کے قیمتی پتھر ہر خوبصورت شکل میں تراشے گئے تھے۔ اسی طرح اس کے مٹی کے برتن، چینی مٹی کے برتن، ہر قسم کے ظروف بہترین معیار، رنگ اور خوبصورت شکل کے تھے۔ یہی معاملہ لوہے، چاندی اور سونے سے بنی دھاتی اشیا کا تھا۔ ہندوستان شاندار فن تعمیر سے آراستہ تھا جس کی خوبصورتی دنیا کے کسی اور ملک سے کم نہیں تھی۔ اس کے پاس انجینئرنگ کے شاندار شاہکار تھے۔ عظیم سوداگر، بڑے تاجر، بہترین بینکر اور مہاجن بھی تھے۔ اسے نہ صرف بحری جہاز سازی میں مہارت حاصل تھی بلکہ اس کی تجارت اور کاروبار، زمینی اور بحری راستے سے تمام مشہور مہذب ممالک تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ وہ ہندوستان تھا جو انگریزوں نے آتے ہی پایا۔

1930 میں، امریکی تاریخ داں اور فلسفی، ول ڈیورنٹ، جو اپنی گیارہ جلدوں پر مشتمل کتاب *The Story of Civilisation* کے لیے مشہور ہیں، نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ انہوں نے 'دی کیس فار انڈیا' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو 1930 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے دیباچے 'اے نوٹ ٹو دی ریڈر' میں، ڈیورنٹ ہندوستانیوں کی غربت اور تکالیف کو دیکھ کر 'خوف زدہ' ہو گئے تھے جو 'زمین پر پائی جانے والی کسی بھی جگہ کے مقابلے بہت زیادہ تھی۔' وہ یہ جان کر حیران رہ گئے کہ 'وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی بھی حکومت اپنی رعایا کو اس طرح کے مصائب میں مبتلا کیسے کر سکتی ہے؟' ان کے مطابق انگلینڈ نے جان بوجھ کر 'ان ڈیڑھ صدیوں میں' ہندوستان کا خون بہایا۔ اور برطانوی راج 'پوری تاریخ کا سب سے گھناؤنا جرم' تھا۔ ہندوستان پر انگریزوں کی فتح کو مختصراً بیان کرتے ہوئے ول ڈیورنٹ نے کہا:

> ہندوستان پر برطانیہ کی جیت، ایک تجارتی کمپنی کی جانب سے مکمل طور پر بغیر کسی اصول یا عذر کے، تہذیب سے بے پرواہ اور فائدے کے لالچی لوگوں کی جانب سے، ایک بے بس اور لاچار ملک پر آگ اور تلوار کے بے جا استعمال، رشوت اور قتل و غارت گری، جوڑ توڑ اور غیر قانونی اور 'قانونی' لوٹ کھسوٹ کے ذریعے ایک اعلیٰ تہذیب کی تباہی تھی جو ایک سو تہتر سالوں سے بے رحمی سے جاری ہے، اور آج تک چل رہی ہے۔

3.3 ایسٹ انڈیا کمپنی: عروج اور ارتقا (Rise and Evolution of the East India Company)

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا بہت چھوٹی حیثیت سے آغاز ہوا ہوا۔ 1687 عیسوی تک ان کی تجارت کا مرکز سورت رہا۔ اس تمام عرصے میں مغل دربار میں ان کی حیثیت ایک سائل کی رہی۔ 1623ء تک انہوں نے سورت، بڑوچ، احمد آباد، آگرہ اور مچھلی پٹنم میں

فیکٹریاں قائم کرلیں۔انگریزی تجارتی کمپنی نے تجارت وسفارت کے دوش بدوش جنگ کااور جہاں ان کی فیکٹریاں تھی ان علاقوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کا سلسلہ ابتداہی سے جاری رکھا۔ مستقبل میں ہندوستان کے ساتھ انگریزوں کے تعلقات کی جو نوعیت تھی،اس کی بنیاد سر تھامس رو کا یہ مشورہ تھا جو انگریز ارباب اختیار کو اس نے دیا تھا: 'یقین جانو! 'میری دانست میں ان لوگوں کے ساتھ پیش آنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں عصائے نامہ بر'اس نے مزید اتنا اضافہ کیا کہ 'انگریزوں کو وہی روش اختیار کرنی چاہیے جس سے ہم نے آغاز کیا تھا اور جس کی بدولت ہم زندہ رہے،یعنی خوف وہراس پیدا کرنا۔'

1625ء میں کمپنی کے ارباب اختیار نے سورت کی فیکٹری کو قلعہ بند کرنے کی کوشش کی، لیکن اس وقت مغل حکومت طاقتور تھی۔اس لیے مقامی حکام نے کمپنی کے افسر اعلی کو گرفتار کرکے فوراپابہ زنجیر دہلی روانہ کردیا۔اسی طرح جب انگریزی کمپنی کے حریفوں نے مغل سلطنت کے جہازوں پر حملہ کیا تو مغل شہنشاہ نے سورت کی کمپنی کے صدر اور اس کی کونسل کے اراکین کو جوابی کارروائی کے طور پر قید کرلیا اور اٹھارہ ہزار پاؤنڈ سے جرمانے کی ادائیگی کے بعد ہی انہیں رہا کیا۔

جنوبی ہند کے حالات انگریزوں کے لیے زیادہ سازگار تھے، کیونکہ وہاں ان کو مضبوط ہندوستانی حکومت سے سابقہ نہیں پڑتا تھا۔ 1565ء میں وجے نگر کی عظیم سلطنت کی تباہ ہوگئی اور اس کی جگہ پر متعدد چھوٹی چھوٹی کمزور ریاستیں قائم ہوگئیں۔ان کی حرص کو آسودہ کرکے یا فوجی طاقت سے ڈرا دھمکا کر ان کو باآسانی قابو میں کیا جاسکتا تھا۔انگریزوں نے جنوبی ہند میں اپنی پہلی فیکٹری مچھلی پٹنم کے مقام پر 1611ء میں قائم کی۔ لیکن جلد ہی انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز مدراس کو بنایا جسے 1639ء میں مقامی راجہ سے انہوں نے پٹے پر حاصل کیا تھا۔اس وقت مدراس کی حیثیت ایک ساحلی پٹی کی سی تھی جس کی لمبائی چھ میل اور چوڑائی ایک میل تھی۔ راجہ نے اس شرط پر انگریزوں کو اسے قلعہ بند کرنے کا، وہاں کا نظم ونسق چلانے اور سکہ جاری کرنے کا اختیار دیا کہ ساحل کی چنگی کی آمدنی کا نصف حصہ اسے دیا جائے گا۔ یہاں انگریزوں نے فیکٹری کے قریب قلعہ سینٹ جارج کے نام سے ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کرلیا۔

سترہویں صدی کے آخری برسوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی، مدراس پر اپنی مکمل فرمانروائی کا دعوی کرتی تھی اور اپنے اس دعوے کے دفاع میں جنگ کرنے کے لیے تیار رہتی تھی۔ یہ بھی کم دلچسپ نہیں ہے کہ منافع کمانے والے تاجروں کی کمپنی ابتداہی سے اس پر تلی تھی کہ ملک کو فتح کیے جانے کے اخراجات بھی ہندوستانیوں ہی سے وصول کیے جائیں،مثلا کمپنی کے مجلس ناظمین(Court of Directors) نے اپنے مدراس کے اہلکاروں کو 1683ء میں لکھا:'ہم چاہتے ہیں کہ تم لوگ ہمارے قلعے (سینٹ جارج) اور شہر (مدراس) کو رفتہ رفتہ قلعہ بند کرلو،تاکہ کسی ہندوستانی راجہ کے یا ڈچوں کے لیے، یا کسی بھی ہندوستانی طاقت کے لیے اس پر حملہ کرنا مشکل ہو جائے لیکن تم سے ہم یہ توقع بھی کریں گے کہ اس کام کو تم اس طرح انجام دوگے (مگر بڑی نرمی کے ساتھ) کہ قلعہ بندی اور مرمت کے جملہ اخراجات وہاں کے باشندے ہی ادا کریں۔'

بمبئی کا جزیرہ کمپنی کو پرتگالیوں سے 1668ء میں ملا۔ کمپنی نے فوراً اس کی قلعہ بندی کی۔ بمبئی انگریزوں کے لیے ایک وسیع

بندر گاہ ثابت ہوئی، جس کا آسانی سے دفاع کیا جا سکتا تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ بڑھتے ہوئے مراٹھا اقتدار سے پیدا ہونے والے خطرے کے پیش نظر مغربی ساحل پر کمپنی کے ہیڈ کوارٹر کی حیثیت سے بمبئی نے سورت پر فوقیت حاصل کر لی۔

مشرقی ہند میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی پہلی فیکٹری 1633ء میں اڑیسہ میں قائم کی۔ 1651ء میں اسے بنگال میں ہگلی کے مقام پر تجارت کرنے کی اجازت دی گئی لیکن جلد ہی اس نے پٹنہ، بالاسور، ڈھاکہ اور بنگال و بہار کے دوسرے مقامات پر فیکٹریاں قائم کر لیں۔ اب اس کی یہ خواہش تھی کہ بنگال میں بھی اسے خود مختار نوآبادی کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ مزید برآں تجارت میں کامیابی اور مدراس و بمبئی میں خود مختار نوآبادیوں کے قیام کی وجہ سے، نیز مراٹھوں کے خلاف اورنگزیب کے دکن میں پھنسے ہونے کی وجہ سے، انگریزوں نے سائلانہ انداز ترک کر دیا تھا۔ اب ہندوستان میں ایک ایسے سیاسی اقتدار کی تعمیر کا خواب وہ دیکھ رہے تھے، جس کے بل پر مغل حکومت کو وہ مجبور کر سکیں گے کہ انہیں تجارت کی مکمل آزادی دی جائے۔ تاکہ ہندوستانیوں سے کم سے کم دام پر مال خریدیں اور زیادہ سے زیادہ دام پر اپنا مال ان کے ہاتھ فروخت کریں، یورپ کے حریف تاجروں کو ہندوستان میں قدم نہ رکھنے دے اور اپنی تجارت کو ہندوستانی طاقتوں کی پالیسیوں سے آزاد رکھیں۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ سیاسی اقتدار حاصل ہو جانے کے بعد یہ بہ آسانی ہندوستانی محاصل پر قابض ہو سکیں گے اور پھر اسی رقم سے ملک کو فتح کر سکیں گے۔ اس طرح کے منصوبے ابتدا ہی میں واضح طور پر تیار کر لیے گئے تھے۔ بمبئی کے گورنر جیرالڈ اونگیر (Gerald Aungier) نے کمپنی کے ڈائریکٹروں کو لندن لکھا تھا کہ 'وقت آگیا ہے کہ اپنی جنرل کمیٹی کو آپ اس کے لیے آمادہ کریں کہ اب تلوار اٹھائے۔' 1687ء میں ڈائریکٹروں نے گورنر مدراس کو مشورہ دیا: دیوانی اور فوجی اقتدار کی ایسی پالیسی اختیار کرو کے وسیع محاصل کے وسائل پیدا ہوں، محصولات وصول ہوں اور اسی آمدنی سے دیوانی اور فوجی دونوں اخراجات پورے ہو سکیں اور ایک عظیم، مستحکم اور محفوظ انگریزی سلطنت کی بنیاد رکھی جا سکے جو ہمیشہ قائم رہے۔ 1689ء میں انہوں نے اعلان کیا کہ: 'اپنے محاصل میں اضافے کی ہمیں اتنی ہی فکر ہے، جتنی اپنی تجارت کی۔ جبکہ بیسیوں حادثات ہماری تجارت کی راہ میں حائل ہوں گے، اسی سے ہمارے فوجی اخراجات پورے ہو سکیں گے اور اسی سے ہندوستان میں ہم ایک قوم بن سکیں گے۔'

انگریزوں اور مغل شہنشاہ میں پہلی جنگ 1686ء میں اس وقت ہوئی جب انگریزوں نے ہگلی کو تاخت و تاراج کیا اور شہنشاہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ مگر انگریزوں نے صورت حال اور مغلوں کی قوت کا بہت غلط اندازہ لگایا تھا۔ اورنگزیب عالمگیر کے عہد حکومت میں مغل سلطنت کی فوج، ایسٹ انڈیا کمپنی کی بے حقیقت فوجوں کے مقابلے میں بہت طاقتور تھی۔ انگریزوں کے لیے یہ لڑائی تباہ کن ثابت ہوئی۔ ان کی بنگال کی فیکٹریوں سے انہیں باہر نکال دیا گیا اور گنگا کے دہانے پر ایک بخار زدہ جزیرے میں انہیں پناہ لینی پڑی۔ سورت، مچھلی پٹنم اور وشاکھا پٹنم کی فیکٹریوں پر قبضہ کر لیا گیا اور بمبئی کے قلعہ کا بھی محاصرہ کر لیا گیا۔ یہ محسوس کرنے کے بعد کہ ابھی مغل اقتدار سے لوہا لینا ان کے لیے ممکن نہیں ہے انگریزوں نے پھر ناچیز درخواست گزاروں کا روپ دھار لیا اور انہوں نے التجا کی کہ 'جو خطائیں ان سے سرزد ہوئی ہیں، انہیں معاف کیا جائے'۔ ہندوستانی حکمرانوں کے زیر حفاظت تجارت کرنے پر بھی انہوں نے آمادگی ظاہر کی۔ ظاہر ہے، انہیں سبق مل گیا تھا۔ مغل شہنشاہ سے مراعاتیں حاصل کرنے کے لیے ایک بار پھر انہوں نے چاپلوسی اور عاجزی کی روش اختیار کر لی۔

مغل حکمرانوں نے انگریزوں کی خطائیں بخش دیں، کیونکہ اس بات کے معلوم کر لینے کا ان کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا کہ معصوم سے نظر آنے والے غیر ملکی تاجر ایک دن ملک کے لیے شدید خطرہ بن جائیں گے۔ اس کے برعکس وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ کمپنی کی وساطت سے ہونے والی غیر ملکی تجارت سے ہندوستانی صنعت کاروں اور تاجروں کو فائدہ پہنچتا ہے اور اس سے بالواسطہ سرکاری خزانے میں اضافہ ہوتا ہے۔ مزید برآں، انگریزوں کی زمینی فوج اگرچہ کمزور تھی، تاہم سمندر پر انہیں بالادستی حاصل تھی اور ہندوستان کا سامان تجارت وہ باآسانی ایران، مشرقی و مغربی ایشیا، شمالی و مشرقی افریقہ تک لے جانے کے اہل تھے۔ اسی بنا پر اورنگزیب نے ڈیڑھ لاکھ روپے بطور تاوان وصول کر کے انگریزوں کو پھر سے تجارت کی آزادی دے دی۔ 1691ء میں تین ہزار روپے سالانہ کے بدلے کمپنی کو بنگال میں چنگی معاف کر دی گئی۔ 1698ء میں کمپنی نے ست نتی، کالی گتا اور گوبند پور دیہاتوں کی زمینداری حاصل کر لی اور وہیں اپنی فیکٹری کے ساتھ ساتھ فورٹ ولیم قلعہ تعمیر کیا۔ ان تینوں دیہاتوں نے جلد ہی شہر کی شکل اختیار کر لی اور کلکتہ کے نام سے مشہور ہوا۔ 1717ء میں کمپنی نے شہنشاہ فرخ سیر سے ایک فرمان حاصل کیا، جس میں ان مراعاتوں کی توثیق کی گئی تھی جو کمپنی کو 1691ء میں عطا کیے گئے تھے اور ان مراعاتوں کا دائرہ گجرات اور دکن تک وسیع کر دیا گیا تھا۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں بنگال میں مرشد قلی خان اور علی وردی خان جیسے طاقتور نوابوں کی حکمرانی تھی۔ انگریز تاجروں کو انہوں نے سختی سے قابو میں رکھا اور مراعاتوں کے غلط استعمال سے روکا۔ اس کے علاوہ کلکتہ کی قلعہ بندی کو مستحکم کرنے اور شہر پر آزادانہ حکومت کرنے سے بھی باز رکھا۔ اس جگہ انگریزوں کی حیثیت نواب کے ایک زمیندار سے زیادہ نہ تھی۔

کمپنی اپنے سیاسی عزائم کے حصول میں تو ناکام رہی، لیکن تجارت میں اسے جو کامیابی حاصل ہوئی، وہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ہندوستان سے انگلینڈ میں درآمد کرنے والی تجارت جو 1708ء میں پانچ لاکھ پاؤنڈ تھی، 1740ء میں بڑھ کر سترہ لاکھ پچانوے ہزار پونڈ ہو گئی اور یہ اضافہ اس حالت میں ہوا تھا جب کہ انگلینڈ کی حکومت نے کپڑے کی انگریزی صنعت کو بچانے اور انگلینڈ سے بلین (سونا چاندی) باہر جانے سے روکنے کے لیے انگلینڈ میں ہندوستانی سوتی اور ریشمی کپڑوں کا استعمال ممنوع قرار دیا تھا۔ اس طرح سے ایک ایسے وقت میں جب انگریز ہندوستان میں آزاد تجارت کا مطالبہ کر رہے تھے خود اپنے ملک میں آزاد تجارت اور ہندوستانی مصنوعات کی درآمد کو روک رہے تھے۔ مدراس بمبئی اور کلکتہ کی برطانوی بستیاں، ترقی پذیر شہری زندگی کا مرکز بن گئیں۔ کثیر تعداد میں ہندوستانی تاجر اور مہاجر ان شہروں میں آنے لگے۔ اس کی کچھ وجہ تو یہ تھی کہ ان شہروں میں نئے تجارتی مواقع موجود تھے اور کچھ وجہ وہ غیر یقینی حالات تھے جو ان شہروں کے باہر مغل حکومت کے انتشار سے پیدا ہو گئے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط تک مدراس کی آبادی بڑھ کر تین لاکھ، کلکتہ کی دو لاکھ اور بمبئی کی ستر ہزار ہو گئی تھی۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان تینوں شہروں میں قلعہ بند انگریزی نوآبادیاں تھیں، وہاں ساحل سمندر تک باآسانی پہنچا جا سکتا تھا جہاں انگریزی بحری طاقت موجود تھی، جو ہندوستانی بحری طاقت کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور تھی۔ یہ شہر انگریزوں کو اس بات کے بھی بہت عمدہ مواقع فراہم کرتے تھے کہ ملک میں جب سیاسی انتشار پیدا ہو تو اس کا فائدہ اٹھا کر ملک پر تسلط حاصل کر لیں۔

3.3.1 کمپنی کی داخلی تنظیم (Internal Organisation of the Company)

ایسٹ انڈیا کمپنی کو مشرق کے ساتھ راس امید (Cape of Good Hope) کے راستے پندرہ سال کے لیے تجارت کرنے

کا منشور (Charter) عطا کیا گیا تھا۔ منشور کے مطابق کمپنی کا انتظام ایک مجلس (Committee) کے سپرد تھا، جو ایک گورنر، ایک نائب گورنر اور چوبیس اراکین (Members) پر مشتمل تھی۔ جن اراکین نے کمپنی قائم کی تھی وہی اراکین کا انتخاب کرتے تھے۔ آگے چل کر اس مجلس کو 'کورٹ آف ڈائریکٹرس' اور اس کے اراکین کو 'ڈائریکٹر' کہا جانے لگا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی جلد ہی انگلینڈ کی سب سے بڑی تجارتی کمپنی بن گئی۔ 1601ء سے 1612ء تک کی درمیانی مدت میں کمپنی کو بیس فی صدی سالانہ منافع حاصل ہوا۔ یہ منافع تجارت اور بحری قزاقی دونوں ذرائع سے حاصل ہوا تھا۔ اس وقت ان دونوں وسائل میں واضح خط فاصل قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔ 1612ء میں دو لاکھ کے سرمائے پر کمپنی کو دس لاکھ پاؤنڈ کا منافع ہوا۔ سترہویں صدی میں بھی منافع کی شرح بہت زیادہ رہی۔

یہ کمپنی ایک محدود کارپوریشن، یا اجارہ داری تھی۔ غیر لوگوں کو نہ تو مشرق کے ساتھ تجارت کرنے کی اور نہ منافع میں حصہ لگانے کی اجازت تھی۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی جیسی تجارتی کمپنیوں کو شاہی منشور کے ذریعہ تجارتی اجارہ داری عطا کیے جانے کے خلاف انگریز صنعتکاروں نے اور تجارت میں حصہ نہ پا سکنے والے تاجروں نے زبردست تحریک چھیڑ رکھی تھی۔ لیکن حکام اور سیاسی رہنماؤں نے اپنا سارا اثر ورسوخ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے وقف کر دیا تھا، کیونکہ اس نے انہیں بھاری رشوتیں دے رکھی تھیں۔ 1609ء سے 1676ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے چارلس دوم کو ایک لاکھ ستر ہزار پونڈ بطور قرض دیے تھے۔ اس کے معاوضے میں چارلس دوم نے کمپنی کو متعدد منشور عطا کیے، جن کی رو سے کمپنی کو سابقہ مراعاتیں حاصل رہیں۔ وہ قلعے کی تعمیر کر سکتی تھی، فوج بھرتی کر سکتی تھی اور مشرق کے حکمرانوں سے جنگ اور صلح کر سکتی تھی۔ ان منشوروں نے کمپنی کے اہلکاروں کو اس کا بھی مجاز قرار دیا کہ ان نوآبادیوں میں رہنے والے انگریزوں اور دوسرے لوگوں کے مقدمات بھی فیصل کریں۔ اس طرح سے کمپنی کو وسیع فوجی وعدالتی اختیارات بھی حاصل ہو گئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارتی اجارہ داری حاصل ہو جانے کے بعد بھی بہت سے انگریز تاجر، ایشیائی ملکوں میں تجارت کرتے رہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو 'آزاد تاجر' کہتے تھے اور کمپنی ان لوگوں کو 'غیر قانونی تاجر' کا نام دیتی تھی لیکن آگے چل کر کمپنی ان غیر قانونی تاجروں کو اپنا حصہ دار بنانے پر مجبور ہو گئی۔ 1688ء میں قسمت نے ایک اور پلٹا کھایا اور 1688ء کے انقلاب نے اسٹوارٹ خاندان کے بادشاہ کو معزول کر کے ولیم سوم اور اس کی بیوی میری کو برطانیہ کا مشترکہ فرمانروا بنا دیا اور اس کے ساتھ ہی پارلیمنٹ کو اقتدار اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ آزاد تاجروں نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے اب عوام اور پارلیمنٹ، دونوں پر زور دینا شروع کر دیا۔ کمپنی نے اپنے دفاع کے لیے بادشاہ، اس کے وزراء اور پارلیمنٹ کے اراکین کو بھاری رشوتیں دی۔ صرف ایک سال میں اس نے اسی ہزار پونڈ رشوت میں دیے جس میں دس ہزار پونڈ بادشاہ کو دیے گئے تھے۔ بالآخر 1693ء میں کمپنی کو ایک نیا منشور عطا کر دیا گیا۔

لیکن وقت کمپنی کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس کی کامیاب زندگی مختصر ثابت ہوئی۔ برطانوی پارلیمنٹ 'ہاؤس آف کامنز' نے 1694ء میں یہ قرارداد منظور کی کہ 'انگلینڈ کے ہر باشندے کو اس وقت تک ایسٹ انڈیز (ہندوستان اور بحر ہند کے جزائر) کے ساتھ تجارت

کرنے کا حق حاصل ہے، جب تک کہ پارلیمنٹ کا قانون اسے ممنوع قرار نہ دے۔ 'ایسٹ انڈیا کمپنی کے حریفوں نے 'نیو کمپنی' کے نام سے ایک نئی تجارتی کمپنی قائم کرلی۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی، برطانوی حکومت کو صرف سات لاکھ پونڈ قرض دینے پر تیار ہوئی، تو نیو کمپنی نے 20 لاکھ پونڈ پیش کر دیے۔ چنانچہ پارلیمنٹ نے نیو کمپنی کو مشرق کے ساتھ تجارت کرنے کا منشور عطا کر دیا۔ لیکن پرانی کمپنی اپنی منافع بخش تجارت سے ہاتھ دھونے پر آسانی سے تیار ہونے والی نہیں تھی۔ نیو کمپنی کے پالیسیوں پر اثرانداز ہونے کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کے بہت سے حصے خرید لیے۔ دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکاروں نے نیو کمپنی کے نمائندوں کو ہندوستان میں داخل ہونے ہی نہیں دیا۔ بالآخر 1702ء میں دونوں کمپنیاں متحد ہو گئیں۔ 1708 میں ایسٹ انڈیز میں تجارت کرنے والی ایک متحدہ کمپنی، انگریزی تاجروں کی متحدہ کمپنی (United Company of the Merchants of England) کے نام سے وجود میں آئی۔

3.3.2 ہندوستان میں کمپنی کی فیکٹریوں کی تنظیم

(Organisation of the Company's Factories in India)

ایسٹ انڈیا کمپنی نے جیسے جیسے اقتدار حاصل کیا اور ہندوستان میں اسے علاقائی ریاست کی حیثیت حاصل ہونے لگی، اس کی فیکٹریوں نے ترقی کرنا اور رنگ ڈھنگ بدلنا شروع کر دیا۔ کمپنی کی فیکٹریاں بالعموم قلعہ بند ہوتی تھیں، جن میں گودام، دفتر اور کمپنی کے ملازمین کی رہائش گاہیں ہوتی تھیں۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ان فیکٹریوں میں کوئی بھی سامان قطعاً تیار نہیں کیا جاتا تھا۔

کمپنی کے ملازمین تین عہدوں میں منقسم تھے۔ منشی (Writers) گماشتے (Factors) اور تاجر (Merchants)۔ یہ سب ایک ساتھ رہتے اور کھاتے پیتے تھے۔ ان کی زندگی ہاسٹل کی سی زندگی تھی۔ ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کے اخراجات کمپنی برداشت کرتی تھی۔ منشی کو سالانہ دس پونڈ (سو روپے)، گماشتے کو بیس سے چالیس پونڈ (دو سو سے چار سو روپے) اور تاجر کو چالیس پونڈ (چار سو روپے) ملتے تھے۔ اس حساب سے ان لوگوں کو بہت کم تنخواہ ملتی تھیں۔ لیکن کمپنی کی ملازمت میں داخل ہونے کے لیے لوگ اس لیے بیتاب رہتے تھے کہ کمپنی اپنے ملازمین کو اندرون ملک میں نجی تجارت کرنے کی اجازت دیتی تھی۔ حالانکہ ہندوستان اور یورپ کے درمیان ہونے والی تجارت پر کمپنی کی مکمل اجارہ داری تھی۔ فیکٹری اور اس کی تجارت گورنر یا کونسل کے زیر انتظام ہوتی تھی۔ گورنر صرف کونسل کا صدر ہوتا تھا اور اس کے کوئی اختیارات نہیں تھے۔ سارے اختیارات کونسل کو حاصل تھے جو ووٹ کی اکثریت پر فیصلے کرتی تھی۔ کونسل کمپنی کے بڑے تاجروں پر مشتمل ہوتی تھی۔

3.4 جنوبی ہند میں انگریزی فرانسیسی جدوجہد (Anglo-French Struggle in South India)

ہندوستان میں علاقائی فتوحات حاصل کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے منصوبوں کو اورنگزیب نے سترہویں صدی کے اواخر میں ناکام بنا دیا تھا، لیکن مغل سلطنت کے زوال پذیر ہوتے ہی کمپنی نے اٹھارہویں صدی کی پانچویں دہائی میں دوبارہ کوششیں شروع کر دیں۔ نادر شاہ کے حملے نے مرکزی اقتدار کے زوال کو ظاہر کر دیا۔ مغربی ہند میں کسی غیر ملکی اقتدار کے قدم جمانے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ وہاں طاقتور

مراٹھوں کا اقتدار قائم ہو گیا تھا اور مشرقی ہند میں علی وردی خان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ لیکن جنوبی ہند کے حالات رفتہ رفتہ غیر ملکی قسمت آزماؤں کے لیے سازگار ہوتے جا رہے تھے۔ اورنگ زیب کے بعد دکن سے مرکزی اقتدار غائب ہو چکا تھا۔ 1748ء میں نظام الملک آصف جاہ کے انتقال کے ساتھ دکن سے ایک مضبوط ہاتھ اٹھ گیا۔ مزید برآں مراٹھوں نے دکن سے چوتھ وصول کرنے کے لیے حیدر آباد پر مسلسل حملے شروع کیے۔ ان حملوں نے سیاسی عدم استحکام اور بد نظمی پیدا کر دی۔ کرناٹک باہمی جنگ میں مبتلا ہو گیا۔

ان حالات میں غیر ملکیوں کو اس کا موقع مل گیا کہ اپنے توسیعی عزائم کو عملی جامہ پہنائیں اور جنوبی ہند کی ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کر سکیں۔ صرف انگریز ہی تجارتی اور سیاسی اقتدار کے دعویدار نہیں تھے۔ انہوں نے سترہویں صدی میں اگرچہ پرتگالی اور ڈچ حریفوں کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ تاہم اب ایک نیا حریف، فرانس میدان میں آ گیا تھا۔ 1744ء سے 1763ء کے درمیان تقریباً بیس سال تک ہندوستان کی تجارت، دولت اور علاقوں پر تسلط حاصل کرنے کے لیے انگریز اور فرانسیسی مسلسل لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔

فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی 1664ء میں قائم ہو گئی تھی۔ 1720ء میں اسے باضابطہ تسلیم کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی تیزی سے اس نے ترقی شروع کی اور جلد ہی وہ انگریزی کمپنی کی ہمسری کرنے لگی۔ اس نے کلکتہ کے قریب چندر نگر اور مشرقی ساحل پر پانڈیچری میں مضبوطی سے قدم جما لیے۔ پانڈیچری کو انھوں نے مکمل طور پر قلعہ بند کر دیا تھا۔ ان دونوں مقامات کے علاوہ مشرقی اور مغربی ساحل پر متعدد بندرگاہوں پر بھی ان کی فیکٹریاں قائم ہو گئیں۔ بحر ہند کے جزیروں 'ماریشس' اور 'ری یونین' پر بھی فرانسیسیوں نے تسلط حاصل کر لیا تھا۔

فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کا زیادہ تر انحصار، فرانسیسی حکومت پر تھا جو اسے عطیہ، امداد، قرض اور دوسری شکل میں سرکاری خزانے سے رقمیں فراہم کرتی تھی۔ چنانچہ اس پر بڑی حد تک حکومت کا کنٹرول تھا، جو 1723ء کے بعد کمپنی کے ڈائریکٹروں کا بھی تقرر کرنے لگی تھی۔ مزید برآں کمپنی کے بڑے حصہ دار امرا اور صاحب املاک لوگ تھے جنہیں کمپنی کو پائیدار تجارتی ادارہ بنانے سے زیادہ جلد سے جلد منافع حاصل کرنے سے ہی دلچسپی تھی۔ سرکاری قرضوں اور امدادی رقموں سے ڈائریکٹر جب تک حصے داروں کے منافع کا اعلان کرتے رہے، اس وقت تک حصے داروں کو اس تجارتی مہم کی کامیابی اور استحکام سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ریاست کے زیر اقتدار ہونے سے کمپنی کو ایک اور نقصان بھی پہنچا۔ اس وقت فرانسیسی حکومت مطلق العنان، نیم جاگیر دارانہ اور غیر مقبول تھی۔ رشوت ستانی، نااہلی اور عدم استحکام کا دور دورہ تھا۔ دور اندیش ہونے کی جگہ پر حکومت زوال پذیر اور روایت پرست ہونے کے علاوہ وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہل بھی نہیں تھی۔ کمپنی پر اس طرح کی حکومت کا اقتدار اس کے حق میں مضر ثابت ہوا۔

1742ء میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان یورپ میں جنگ شروع ہو گئی۔ جنگ کی بڑی وجہ امریکی نوآبادیوں پر تسلط حاصل کرنے کی ہوڑ تھی۔ دوسری وجہ ہندوستانی تجارت کی رقابت تھی۔ اس احساس نے آتشِ رقابت کو تیز کر دیا تھا کہ مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرنے والا ہے اور ماضی کے مقابلے میں اب تجارت اور علاقوں کی شکل میں مزید بڑے فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کا ٹکراؤ بیس سال تک جاری رہا اور بالآخر ہندوستان میں انگریزی اقتدار کی فتح اور استحکام پر اس کا خاتمہ ہوا۔ ان دونوں

کمپنیوں میں، تجارتی برتری کے اعتبار سے انگریزی کمپنی زیادہ دولت مند تھی اور اسے ہی بحری برتری بھی حاصل تھی۔ مزید برآں اس کے ہندوستانی مقبوضات، زیادہ قدیم، زیادہ قلعہ بند اور زیادہ خوشحال تھے۔ اس لیے مادی اعتبار سے انگریز کافی بہتر حالت میں تھے۔

یورپ میں فرانس اور انگلینڈ کے درمیان جو جنگ شروع ہوئی تھی، اس نے جلد ہی ہندوستان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور دونوں ایسٹ انڈیا کمپنیاں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں۔ 1745ء میں انگریزی بحریہ نے ہندوستان کے جنوب مشرقی ساحل پر فرانسیسی جہازوں کو پکڑ لیا اور پانڈیچری پر بھی ان کی نظریں پڑنے لگیں۔ اس وقت پانڈیچری کا فرانسیسی گورنر جنرل 'ڈوپلے' (Dupleix) نہایت ذہین، مدبر اور دور اندیش تھا۔ اس کی قیادت میں فرانسیسیوں نے جوابی کارروائی کے طور پر 1746ء میں مدراس پر قبضہ کر لیا۔ یہ اقدام جنگ کا اہم ترین واقعہ ثابت ہوا۔ مدراس چونکہ کرناٹک کے علاقے میں واقع تھا اس لیے انگریزوں نے اپنی نوآبادی کو بچانے کے لیے نواب سے اپیل کی۔ نواب چونکہ غیر ملکی تاجروں کو یہ جتانا چاہتا تھا کہ وہی اس علاقے کا اصلی مالک ہے، اس لیے وہ مداخلت کے لیے آمادہ ہو گیا۔ اس نے فرانسیسیوں کے مقابلے کے لیے ایک فوج روانہ کی، تاکہ غیر ملکی تجارتی کمپنیوں کو اس کے علاقے میں جنگ کرنے سے روکا جائے۔ نواب کی مضبوط فوج، جو دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی، مختصر سی فرانسیسی فوج کے خلاف صف آراء ہو گئی۔ جو 230 یوروپی اور سات سو ہندوستانی سپاہیوں پر مشتمل تھی جنہیں مغربی طرز پر تربیت دی گئی تھی۔ دریائے ادیار کے کنارے سینٹ تھامس کے مقام پر دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا جس میں نواب کو بری طرح شکست ہوئی۔ اس جنگ نے ہندوستانی فوجوں پر مغربی فوجوں کی برتری کو ثابت کر دیا، کیونکہ وہ بہتر طور پر مسلح ہوتی تھیں اور ان کی تنظیم بھی بہتر اصولوں پر ہوتی تھی۔ نہ تو ہندوستانی نیزہ بردار، مغربی دستی بندوقوں اور سنگینوں کا مقابلہ کر سکتے تھے اور نہ ہی ہندوستانی گھوڑ سوار دستے مغربی توپخانوں کے مقابلے میں ٹھہر سکتے تھے۔ نظم و ضبط سے عاری بڑی سے بڑی ڈھیلی ڈھالی ہندوستانی فوج چھوٹی سے چھوٹی بہتر منظم مغربی فوج کا مقابلہ کرنے کی اہل نہیں تھی۔

1748ء میں انگلینڈ اور فرانس کی جنگ کا یورپ میں خاتمہ ہوا اور اس کے نتیجے میں جو صلح نامہ ہوا اس کے مطابق مدراس انگریزوں کو واپس مل گیا۔ جنگ اگرچہ ختم ہو گئی تھی، تاہم تجارت اور ہندوستانی مقبوضات کے لیے رقابت جاری رہی، جس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی رہ گیا تھا۔ مزید برآں جنگ نے ہندوستانی حکومت اور اس کی فوجوں کی کمزوری عیاں کر دی، جس کی وجہ سے ہندوستان میں دونوں کمپنیوں کی توسیعی ہوس تیز تر ہو گئی۔

کرناٹک کے نواب کے ساتھ حالیہ جنگ میں ڈوپلے کو جو تجربہ ہوا تھا، اس سے وہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے ہندوستانی حکمرانوں کے باہمی جھگڑوں میں منظم اور جدید طرز کی فرانسیسی فوج کو استعمال کرنے کا طریق کار اختیار کیا۔ کسی ایک فریق کا ساتھ دے کر فاتح سے وہ نقد اور تجارتی و علاقائی مراعات حاصل کرتا رہا۔ اس نے مقامی راجاؤں، نوابوں اور سرداروں کے وسائل اور ان کی فوجوں کو فرانسیسی مفاد کے لیے استعمال کر کے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کا منصوبہ بنایا۔ فرانسیسیوں کے منصوبے کی کامیابی میں صرف یہی بات حائل ہو سکتی تھی کہ ہندوستانی حکمراں اپنے جھگڑوں میں انہیں مداخلت کی اجازت نہ دیں۔ لیکن ہندوستانی حکمراں ایک متحدہ ہندوستانی قوم کے تصور سے انجان

تھے اور محدود شخصی عزائم اور فائدے حاصل کرنا ہی ان کا بنیادی مقصد تھا۔ اپنے داخلی حریف کو شکست دینے کے لیے غیر ملکی قوت کو مداخلت کی دعوت دینے میں ان کو بہت کم تردد ہوتا تھا۔

1748ء میں کرناٹک اور حیدر آباد میں ایسے حالات پیدا ہوئے، جنہوں نے ڈوپلے کو اپنی اہلیت کے مظاہرے کا پورا موقع دے دیا۔ کرناٹک میں چندا صاحب نے نواب انور الدین کے خلاف سازش شروع کی اور حیدر آباد میں نظام الملک آصف جاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ناصر جنگ اور پوتے مظفر جنگ میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر ڈوپلے نے اپنی بہترین تربیت یافتہ فرانسیسی اور ہندوستانی فوجوں سے چندا صاحب اور مظفر جنگ کی مدد کرنے کا خفیہ معاہدہ کر لیا۔ 1749ء میں تینوں فوجوں نے امبور کی جنگ میں انور الدین کو شکست دے کر قتل کر ڈالا۔ اس کے بیٹے محمد علی نے بھاگ کر ترچناپلی میں پناہ لی اور کرناٹک کا باقی حصہ چندا صاحب کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کے انعام میں اس نے پانڈیچری کے نواح کے اسّی گاؤں فرانسیسیوں کو دے ڈالے۔

حیدر آباد میں بھی فرانسیسیوں کو کامیابی ہوئی ناصر جنگ مارا گیا اور مظفر جنگ، نظام، یا دکن کا وائسرائے بن گیا۔ اس نئے نظام نے بھی پانڈیچری کے قریب کا کچھ علاقہ اور مچھلی پٹنم فرانسیسیوں کے حوالے کر دیا۔ اس نے پانچ لاکھ روپے فرانسیسی کمپنی کو اور اتنی ہی رقم فوج کو دی۔ ڈوپلے کو 20 لاکھ روپے نقد اور ایک لاکھ روپے سالانہ آمدنی کی جاگیر ملی۔ اس کے علاوہ ڈوپلے کو دریائے کرشنا سے لے کر کنیا کماری تک کے مغل علاقے کا اعزازی گورنر مقرر کیا گیا۔ یہ علاقہ مشرقی ساحل پر واقع تھا۔ ڈوپلے نے اپنے بہترین افسر 'بسی' (Bussy) کو فرانسیسی فوج کے ساتھ حیدر آباد میں متعین کیا۔ اس کا بظاہر مقصد تو نظام کو اس کے دشمنوں سے بچانا تھا، لیکن حقیقی مقصد حیدر آباد کے دربار میں فرانسیسی اثر و رسوخ کو برقرار رکھنا تھا۔ اپنی راجدھانی کی طرف لوٹتے وقت ایک اتفاقی حادثے میں مظفر جنگ مر گیا۔ بسی نے فوراً اس کے تیسرے بیٹے صلابت جنگ کو نظام کی گدی پر بٹھا دیا۔ اس کے صلے میں نئے نظام نے فرانسیسیوں کو آندھرا کا وہ علاقہ دے ڈالا جسے شمالی سرکار کہا جاتا تھا اور جو مصطفی نگر، ایلورو، راجہ مندری اور سکاکول کے چار اضلاع پر مشتمل تھا۔ جنوبی ہند میں فرانسیسی طاقت اب اپنے عروج پر تھی۔ ڈوپلے کا منصوبہ اس کے خوابوں سے بہت زیادہ بہتر ثابت ہو رہا تھا۔ فرانسیسیوں نے ہندوستانی ریاستوں کو دوست بنانے سے اپنے کام کا آغاز کیا تھا، لیکن آخر میں ہندوستانی ریاستوں کو انہوں نے اپنا موکل یا طفیلی بنا دیا۔

انگریز بھی اپنے حریف کی کامیابیوں کے خاموش تماشائی نہیں رہے۔ فرانسیسیوں کے اثر و رسوخ کو ختم کرنے اور خود اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے کے لیے انہوں نے ناصر جنگ اور محمد علی سے ساز باز کی۔ 1750ء میں انہوں نے محمد علی کے لیے اپنی ساری قوت لگا دینے کا فیصلہ کیا۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک نوجوان کلرک، رابرٹ کلائیو (Robert Clive) نے یہ تجویز پیش کی کہ محمد علی جو ترچناپلی میں محصور ہے، اس پر سے فرانسیسیوں کا دباؤ کم کرنے کے لیے کرناٹک کی راجدھانی آرکاٹ پر حملہ کر دیا جائے۔ یہ تجویز قبول کر لی گئی اور کلائیو نے دو سو انگریز اور تین سو ہندوستانی سپاہیوں کو لے کر آرکاٹ پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ حسب توقع چندا صاحب اور فرانسیسی ترچناپلی سے محاصرہ اٹھانے اور آرکاٹ واپس آنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد کی جنگ میں چندا صاحب اور فرانسیسیوں نے شکست کھائی۔ چندا

صاحب جلد ہی گرفتار ہوااور مارا گیا۔اب فرانسیسیوں کی قسمت پلٹا کھا رہی تھی، کیونکہ ان کے جنرل اور ان کی فوج اپنے انگریز حریف کے مقابلے میں بہت کم تر ثابت ہوئی تھی۔

ڈوپلے نے فرانسیسیوں کی بد قسمتی کے طوفان کو روکنے کی جان توڑ کوشش کی۔ لیکن اس کام میں فرانسیسی حکومت، بلکہ فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعلیٰ افسروں کی بھی،اسے بہت کم حمایت حاصل ہو سکی۔اس کے علاوہ اعلی فرانسیسی افسر اور بری اور بحری کمانڈر آپس میں اور ڈوپلے سے بھی مسلسل لڑتے جھگڑتے رہے۔ بالآخر فرانسیسی حکومت نے ہندوستانی جنگ کے بھاری اخراجات سے تنگ آکر اور امریکی نوآبادیوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے خطرے کے پیش نظر صلح کی بات چیت شروع کی۔1754ء میں ڈوپلے کو ہندوستان سے واپس بلا لینے کے انگریزی مطالبے کو فرانسیسیوں نے قبول کر لیا۔فرانسیسی کمپنی کی قسمت کو اس سے ہندوستان میں شدید دھکا لگا۔

1756ء میں جب انگلینڈ اور فرانس کے مابین جنگ کا دوبارہ آغاز ہوا، تو دونوں کمپنیوں کی عارضی صلح کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ جنگ کے ابتدائی دور میں ہی انگریزوں کا بنگال پر قبضہ ہو گیا۔ بہر کیف اس واقعے کے بعد فرانسیسیوں کی کامیابی کا امکان بہت کم باقی رہا تھا۔بنگال کے بیش قیمت وسائل نے کامیابی کا پلہ قطعی طور پر انگریزوں کے حق میں جھکا دیا تھا۔فرانسیسی حکومت نے اس موقع پر انگریزوں کو ہندوستان سے خارج کرنے کی اگر چہ پوری کوشش کی اور کاؤنٹ ڈی لیلی کی قیادت میں ایک زبردست فوج بھی بھیجی۔تاہم یہ کوشش بھی بے سود ثابت ہوئی۔ فرانسیسی بحری بیڑے کو ہندوستان کے سمندر سے نکال باہر کیا گیااور اور کرناٹک میں فرانسیسی فوج کو شکست کھانی پڑی۔ مزید برآں حیدر آباد میں نظام کے محافظ کا درجہ فرانسیسیوں کی جگہ پر انگریزوں کو مل گیااور مچھلی پٹنم نیز شمالی سرکار بھی انگریزوں کی طرف منتقل ہو گئے۔ 22 جنوری1760ء کو وندی واش کے مقام پر فیصلہ کن جنگ ہوئی، جس میں انگریز جنرل،آیر کوٹ نے لیلی کو شکست دی۔اس کے بعد سال بھر ہی کے اندر فرانسیسیوں کے تمام ہندوستانی مقبوضات ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔1763ء میں صلح نامہ پیرس پر دستخط کیے گئے اور جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔فرانسیسیوں کو ان کی فیکٹریاں تو بحال کر دی گئی، لیکن اب وہ نہ تو انہیں قلعہ بند کر سکتے تھے اور نہ ہی زیادہ حفاظتی فوج ہی رکھ سکتے تھے۔ان فیکٹریوں کی حیثیت اب صرف تجارتی مرکز کی تھی اور فرانسیسی باشندے انگریزوں کے زیر حفاظت تھے۔ ہندوستان میں سلطنت قائم کرنے کا فرانسیسیوں کا خواب پورا نہ ہو سکا۔اس کے برعکس بحر ہند پر انگریزوں کی مکمل حکمرانی قائم ہو گئی۔ تمام یورپی حریفوں سے نجات حاصل کر لینے کے بعد اب وہ ہندوستان کو فتح کرنے کی طرف توجہ دے سکتے تھے۔

فرانسیسیوں اور ان کے ہندوستانی حلیفوں کے ساتھ جنگ میں انگریزوں نے بعض اہم اور قابل قدر سبق سیکھے تھے۔ایک تو یہ کہ ملک میں قوم پرستی کا کوئی وجود نہیں ہے اور ہندوستانی حکمرانوں کے باہمی جھگڑوں سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے سیاسی منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ دوسرے انہیں یہ تجربہ بھی ہوا کے مغربی وضع کی تربیت یافتہ پیدل فوج، خواہ یورپی ہو یا ہندوستانی، اگر جدید اسلحہ سے لیس ہو اور اس کی پشت پر توپخانہ بھی ہو، تو قدیم وضع کی ہندوستانی فوجوں کو بڑی سے بڑی جنگ میں بہ آسانی شکست دے سکتی ہے۔ تیسری بات یہ ان پر ثابت ہو گئی کہ ہندوستانی سپاہیوں کو اگر مغربی وضع کی فوجی تربیت دی جائے اور یورپ کے جدید اسلحہ سے انہیں مسلح کیا جائے تو وہ بھی یورپی سپاہیوں

جیسے ہو سکتے ہیں اور ہندوستانی سپاہیوں میں چوں کہ قوم پرستی کی کمی ہے اس لیے جو بھی انہیں اچھی تنخواہ دے، کرائے کی سپاہی کی طرح بھرتی کر کے ان سے کام لے سکتا ہے۔ چنانچہ انگریزوں نے ہندوستانی سپاہیوں کی ایک عظیم فوج تیار کی، جنہیں سیپوئے یا سپاہی کہا جاتا تھا۔ ان کے افسر سب انگریز تھے۔ اس فوج کو اپنا آلہ کار بنا کر اور ہندوستان کے تجارتی و علاقائی وسائل پر قابو حاصل کر کے انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے جنگیں کی اور علاقائی توسیع کی شروعات کی۔

3.5 بنگال پر انگریزوں کا قبضہ (British Occupation of Bengal)

3.5.1 پلاسی کی جنگ (The Battle of Plassey)

1757ء کی پلاسی کی جنگ کو ہندوستان میں برطانوی سیاسی اقتدار کا نقطہ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس جنگ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کے نواب سراج الدولہ کو شکست دی۔ اس سے قبل انگریزوں نے جنوبی ہند میں جو لڑائیاں فرانسیسیوں سے لڑی تھیں، وہ دراصل ڈرل یا مشق کے لیے تھیں۔ ان جنگوں کے تجربات کو انہوں نے پلاسی کی جنگ میں کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔

بنگال ہندوستان کا زرخیز ترین اور انتہائی متمول صوبہ تھا۔ اس کی صنعت و تجارت بھی ترقی پر تھی۔ اس کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس صوبے میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے ملازمین بڑی پُر منافع تجارت کر رہے تھے۔ کمپنی نے 1717ء میں مغل شہنشاہ سے ایک فرمان حاصل کیا، جس کی رو سے کمپنی کو متعدد کارآمد مراعاتیں حاصل ہو گئیں۔ مثلاً وہ اپنا اسبابِ تجارت بلا چنگی ادا کیے ہوئے بنگال میں درآمد و برآمد کر سکتی تھی۔ سامان کے لانے لے جانے کا پروانہ، جسے دستک (*Dastak*) کہتے تھے، کمپنی کے حکام خود جاری کرتے تھے۔ اگرچہ فرمان میں اس کا ذکر نہیں تھا، تاہم کمپنی کے ملازمین کو بھی نجی طور پر تجارت کرنے کی اجازت تھی، لیکن کمپنی کے ملازمین کو اسباب تجارت پر ہندوستانی تاجروں کی طرح چنگی ادا کرنی پڑتی تھی۔ یہ فرمان بنگال کے نواب اور کمپنی کے درمیان مسلسل تنازع کا سبب بنا رہا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس فرمان سے بنگال کی حکومت چنگی کی آمدنی سے محروم ہو جاتی تھی۔ لیکن دوسری اور ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ دستک کی مراعات جو صرف کمپنی ہی کے لیے تھی، کمپنی کے ملازمین اس کا غلط استعمال کرتے تھے۔ یہ لوگ چنگی سے بچنے کے لیے اپنے نجی اسبابِ تجارت کے لیے بھی دستک استعمال کیا کرتے تھے۔ بہر کیف اس فرمان کی جو تشریح و تعبیر کمپنی کرتی تھی اس سے مرشد قلی خان سے لیکر علی وردی خان تک تمام نوابان بنگال کو اختلاف رہا۔ انہوں نے کمپنی کو مجبور کیا کہ وہ ان کے خزانے میں ایک تاوانی رقم داخل کرے۔ دستک کے بیجا استعمال کو بھی سختی سے انہوں نے روکا۔ اس معاملے میں نواب کے اختیارات کو تسلیم کرنے پر کمپنی کو اگرچہ مجبور ہونا پڑا تھا، تاہم کمپنی کے ملازمین نواب کے احکام کو نظر انداز کرنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

1756ء میں نوجوان سراج الدولہ جب بنگال کا نواب بنا تو معاملات انتہا کو پہنچ گئے۔ اس نے کمپنی سے مطالبہ کیا کہ وہ انہیں شرطوں پر تجارت کرے، جن شرطوں پر مرشد قلی خان کے وقت میں تجارت کرتی تھی۔ کمپنی نے اس صورتحال کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ جنوبی ہند میں فرانسیسیوں کو شکست دینے کے بعد اس کو اپنی قوت کا احساس ہو گیا تھا۔ ہندوستانی ریاستوں کی سیاسی اور فوجی کمزوری

بھی اس پر ظاہر ہو گئی تھی۔ اپنے مال پر نواب کو چنگی ادا کرنے کی بجائے کمپنی نے کلکتہ آنے والے ہندوستانی مال پر بھاری چنگی عاید کر دی، کیونکہ کلکتہ ان کے زیر انتظام تھا۔ اس اقدام نے نوجوان نواب کو مشتعل کر دیا۔ نواب کو یہ بھی گمان تھا کہ کمپنی اس کی مخالف ہے اور اس کے حریف کی حمایت کر رہی ہے، جو بنگال کی حکومت کا دعویدار ہے۔ حالات انتہا کو اس وقت پہنچے جب نواب کی اجازت کے بغیر کمپنی نے کلکتہ کو قلعہ بند کرنا چاہا۔ دراصل کمپنی کو فرانسیسی حملے کا خطرہ اس وجہ سے لاحق ہو گیا تھا کہ فرانسیسی فوجوں نے چندر نگر میں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ سراج الدولہ نے کمپنی کے اقدام کو اپنے اقتدار اعلیٰ پر حملہ تصور کیا اور اس میں وہ حق بجانب تھا۔ کوئی بھی خود مختار حکومت، تاجروں کی کسی نجی کمپنی کو اپنی قلمرو میں قلعے بنانے کی نہ تو اجازت دے سکتی ہے اور نہ ہی اپنی سرزمین پر نجی جنگ کرنے کی اجازت دے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ سراج الدولہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کو اس نے اگر بنگال کی سرزمین پر جنگ کرنے دی تو اس کا بھی حشر کرناٹک کے نوابوں جیسا ہو گا۔ دوسرے الفاظ میں سراج الدولہ اہل یورپ کو آقا کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف تاجر ہی کی حیثیت سے رہنے کی اجازت دینا چاہتا تھا۔ اس نے انگریزوں اور فرانسیسیوں دونوں کو ہدایت کی کے کلکتہ اور چندر نگر کی قلعہ بندیاں ڈھا دی جائیں اور دونوں باہم جنگ نہ کریں۔ فرانسیسیوں نے تو اس حکم کی تعمیل کی لیکن انگریزوں نے اس حکم کی بجاآوری سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ان کے حوصلے بہت بلند ہو چکے تھے اور کرناٹک کی فتوحات نے ان کے اعتماد کو بے حد طاقتور کر دیا تھا۔ اب وہ بنگال میں نواب کی مرضی کے خلاف بھی رہنے پر اور اپنی شرطوں پر وہاں تجارت کرنے پر تلے تھے۔ کمپنی نے اپنی سرگرمیوں پر برطانوی پارلیمنٹ کے اختیارات کو تو تسلیم کر لیا تھا اور کمپنی کے انگلینڈ میں تجارت کرنے پر برطانوی حکومت کی عاید کردہ پابندی کے سامنے تو اس نے فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا تھا، نیز 1693ء میں جب پارلیمنٹ نے مشرق میں تجارت کرنے کے اس کے منشور کو واپس لیا تھا تو بادشاہ کو، پارلیمنٹ کے اراکین اور سیاسی لیڈروں کو اس نے بھاری رشوتیں دی (صرف ایک سال میں اسّی ہزار پونڈ رشوت کی مد میں دیے گئے تھے)۔ تاہم بنگال میں نواب کے احکام کو نظر انداز کر کے وہ بنگال میں آزاد تجارت کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اس کا یہ طرز عمل نواب کے اقتدار اعلی کے خلاف ایک براہ راست چیلنج کے مترادف تھا۔ سراج الدولہ کی سیاسی بصیرت نے انگریزوں کے طویل المیعاد منصوبوں کو سمجھ لیا تھا، چنانچہ ان سے ملک کے قوانین کی پابندی کرانے کا اس نے تہیہ کر لیا۔

سراج الدولہ نے غیر معمولی سرعت، مگر غیر ضروری جلد بازی اور ناکافی تیاری کے ساتھ کاروائی کی۔ قاسم بازار کی انگریزی فیکٹری پر قبضہ کرنے کے بعد وہ کلکتہ کی طرف بڑھا اور 20 جون 1756ء کو اس نے فورٹ ولیم پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اپنی فتح کا جشن منانے کے لیے وہ کلکتہ سے واپس لوٹ گیا اور انگریزوں کو اپنے جہازوں کے ساتھ بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی، کیونکہ دشمن کی طاقت کا اس نے غلط اندازہ کیا تھا۔ انگریزوں نے سمندر کے قریب ایک جزیرے میں پناہ لی جہاں ان کی طاقتور بحریہ نے ان کی حفاظت کی۔ یہاں ایک طرف انہوں نے مدراس سے کمک آنے کا انتظار کیا اور دوسری طرف نواب کے درباریوں کے ساتھ سازش اور غداری کا جال بچھایا۔ سازش کے خاص سرغنہ تھے میر بخشی میر جعفر، کلکتہ کا افسر اعلیٰ مانک چند، ایک بڑا تاجر امی چند، بنگال کا سب سے بڑا مہاجن جگت سیٹھ اور نواب کی فوج کا کمانڈر خادم خان۔ مدراس کے امیر البحر واٹسن اور کرنل کلائیو کی سرکردگی میں مدراس سے ایک مضبوط بحری اور بری فوج پہنچ گئی۔ 1757ء کے اوائل میں کلائیو نے کلکتہ دوبارہ فتح کر لیا اور نواب کو انگریزوں کے مطالبات قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

انگریز اسی پر مطمئن نہیں ہوئے، کیونکہ ان کے عزائم بلند تھے۔ سراج الدولہ کی جگہ پر وہ کسی اطاعت گذار شخص کو بنگال کا حکمراں بنانا چاہتے تھے۔ نواب کے مخالفوں کے ساتھ مل کر، جو میر جعفر کو بنگال کا حکمران بنانا چاہتے تھے، انگریزوں نے سازش کی۔ انہوں نے نواب کے سامنے ایسے مطالبات پیش کیے جو ناقابل قبول تھے۔ فریقین محسوس کر رہے تھے کہ زندگی اور موت کا ایک آخری معرکہ ابھی باقی ہے۔ 23 جون 1757ء کو مرشد آباد سے بیس میل کے فاصلے پر پلاسی کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ یہ ایک برائے نام جنگ تھی۔ انگریزوں کے صرف 29 سپاہی مارے گئے اور نواب کے تقریباً 500 سپاہی کام آئے۔ نواب کی فوج کے اس بڑے حصے نے لڑائی میں کوئی حصہ نہیں لیا، جس کی کمان غدار میر جعفر اور رائے درلبھ کے ہاتھ میں تھی۔ نواب کی فوج کے چھوٹے سے حصے نے میر مدن اور موہن لال کی قیادت میں داد شجاعت دی اور بڑی بہادری سے لڑا۔ نواب کو میدان جنگ سے بھاگنا پڑا اور میر قاسم کے بیٹے میرن نے اسے قتل کر دیا۔

پلاسی کی لڑائی، بنگالی شاعر نبین چندر سین (Nabinchandra Sen) کے الفاظ میں 'ہندوستان کے لیے ابدی تاریکی کی رات تھی۔' انگریزوں نے میر جعفر کو بنگال کا نواب بنایا اور کمپنی پر انعام واکرام کی بارش ہونے لگی۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ میں کمپنی کو آزادانہ تجارت کے جملہ حقوق حاصل ہو گئے۔ کلکتہ کے مضافات میں چوبیس پرگنہ کی زمینداری بھی اسے دے دی گئی۔ میر جعفر نے کلکتہ پر حملے کے تاوان کے طور پر ایک کروڑ ستر لاکھ روپے کمپنی اور تاجروں کو ادا کیے۔ وہ بھاری رقمیں اس کے علاوہ تھیں جو تحفے یا رشوت میں کمپنی کے اعلیٰ افسروں کو دی گئی تھیں۔ کلائیو کو بیس لاکھ روپے سے زائد اور واٹسن کو دس لاکھ سے زائد ملے۔ کلائیو کے تخمینے کے مطابق کمپنی اور اس کے ملازمین نے بنگال کے کٹھ پتلی نواب سے تین کروڑ روپے سے زیادہ وصول کر لیے تھے۔ ان سب کے علاوہ یہ بھی منوالیا گیا تھا کہ برطانوی تاجروں اور کمپنی کے ملازموں کو ان کی نجی تجارت پر کوئی چنگی ادا نہیں کرنی پڑے گی۔

پلاسی کی لڑائی عظیم تاریخی اہمیت کی حامل تھی۔ اس نے بنگال پر اور پھر سارے ہندوستان پر برطانوی تسلط کے قیام کی راہیں ہموار کیں۔ اس سے انگریزوں کے وقار میں اضافہ ہوا اور وہ ہندوستان کی سلطنت کے بڑے دعوے داروں میں شمار کیے جانے لگے۔ بنگال کے بیش بہا محاصل کی آمدنی سے انہوں نے بہت بڑی فوج تیار کر لی۔ بنگال پر کمپنی کے تسلط نے انگریزی فرانسیسی جدوجہد میں بھی فیصلہ کن کردار ادا کیا اور سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ بنگال کے بے یار و مددگار عوام کو لوٹ کر کمپنی اور اس کے ملازمین نے بے اندازہ دولت جمع کر لی۔ برطانوی مصنفین ایڈورڈ تھامپسن (Edward Thompson) اور جی، ٹی، گریٹ نے لکھا ہے کہ:

> انقلاب برپا کر دینا دنیا کا سب سے زیادہ منافع بخش کھیل ہے۔ عہد کورٹیز اور پیزر کے اہل ہسپانیہ پر دولت کی ہوس کی جو دیوانگی طاری ہوئی تھی، پھر اس کے بعد دنیا کی کوئی قوم بھی اس دیوانگی میں اس درجہ مبتلا نہ ہوئی، جس درجہ انگریزی دل و دماغ ہوا تھا۔ خصوصاً بنگال کو تو امن کی شکل ہی اس وقت تک نظر نہ آئی جب تک کہ اس کا سارا خون چوس نہ لیا گیا۔

3.5.2 بنگال کی معاشی لوٹ کھسوٹ (The Plunder of Bengal)

میر جعفر کی نوابی اگرچہ کمپنی ہی کی مرہون منت تھی، تاہم اسے بھی جلد ہی اس سودے پر افسوس کرنا پڑا۔ کمپنی کے افسروں کے

تحائف اور رشوت کے مطالبات نے اس کا خزانہ خالی کر دیا، جس کی مثال خود کلائیو نے قائم کی تھی۔ کرنل میلسن کے بیان کے مطابق کمپنی کے افسروں کا واحد مقصد یہ تھا کہ جتنا کچھ بھی مل سکے، وہ لے لیں۔ میر جعفر کو انہوں نے دولت کی بہتی گنگا سمجھ لیا تھا، جس میں جب بھی وہ چاہیں ہاتھ دھو لیں۔ خود کمپنی ناقابل بیان حرص و ہوس کا شکار تھی۔ یہ سمجھ کر کہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی ان کے ہاتھ آگئی ہے اور بنگال میں لاانتہا دولت ہے، کمپنی کے ڈائریکٹروں نے حکم دیا کہ بمبئی اور مدراس کی پریسیڈنسیوں کے اخراجات بھی بنگال ہی برداشت کرے اور ہندوستان سے کمپنی کی برآمدات کی قیمت بھی بنگال ہی کے محاصل سے ادا کی جائے۔ کمپنی کو اب ہندوستان کے ساتھ صرف تجارت ہی نہیں کرنی تھی، بلکہ بنگال کے نواب پر اسے جو اقتدار حاصل ہو گیا تھا، اس سے کام لے کر بنگال کی ساری دولت لوٹ لینا بھی اس کے فرائض میں داخل تھا۔

میر جعفر کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ کمپنی اور اس کے افسروں کے تمام مطالبات پورے کرنا ممکن نہیں ہے۔ دوسری طرف کمپنی اور اس کے اہلکاروں کو شکایت تھی کہ نواب ان کی توقعات کو پورا کرنے کا اہل نہیں ثابت ہو رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکتوبر 1760ء میں ان لوگوں نے میر جعفر کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے داماد، میر قاسم کے حق میں حکومت سے دست کش ہو جائے۔ اس کے معاوضے میں میر قاسم نے اپنے محسنوں کو انعام و اکرام سے نوازا۔ کمپنی کو بردوان، میدناپور اور چٹگام کے اضلاع کی زمینداری ملی اور انگریز افسروں کو انیتس لاکھ روپے کی مالیت کے بیش بہا تحائف دیے گئے۔

لیکن میر قاسم بھی انگریزوں کی امیدوں کے برعکس نکلا، اور بنگال میں ان کے عزائم اور ان کے منصوبوں کے لیے جلد ہی وہ بھی خطرہ بن گیا۔ وہ قابل، باصلاحیت اور مضبوط حکمران تھا اور غیر ملکی اقتدار سے اپنے آپ کو آزاد کرنے پر تلا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کو بنگال کا حکمران بنانے کی جو خدمت کمپنی اور اس کے اہل کاروں نے انجام دی ہے، اس کا انہیں وہ معقول معاوضہ دے چکا ہے اور اب بنگال پر حکومت کرنے کے لیے کمپنی کو اسے تنہا چھوڑ دینا چاہیے۔ اس نے بدامنی کو روکنے، محکمہ مال کی رشوت خوری کا تدارک کر کے آمدنی میں اضافہ کرنے کی اور یورپی طرز کی تربیت یافتہ فوج تیار کرنے کی کوشش کی۔ یہ باتیں انگریزوں کو پسند نہ آئیں۔ سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ کمپنی کے ملازمین 1717ء کے فرمان کا جو بیجا استعمال کرتے تھے، نواب نے اس کے سد باب کی بھی کوشش کی۔ کمپنی کا مطالبہ یہ تھا کہ ان کا تمام مال خواہ وہ برآمد کے لیے ہو یا اندرون ملک کی منڈیوں کے لیے، چنگی محصول سے آزاد ہو۔ اس کا اثر ہندوستانی تاجروں پر پڑتا تھا، کیونکہ انہیں اسی مال پر چنگی دینی پڑتی تھی، جس پر کمپنی کے لیے چنگی معاف ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ کمپنی کے ملازمین اپنے ہندوستانی دوست تاجروں کے ہاتھ 'دستک' یا چنگی معافی کا پروانہ، فروخت کر دیتے اور اس طرح تجارت کے مال پر چنگی ادا کرنے سے بچ جاتے تھے۔ اس بے ایمانی سے ایک طرف تو ایماندار ہندوستانی تاجروں کو غیر منصفانہ مقابلے کا سامنا کرنا پڑتا اور دوسری طرف نواب کی آمدنی میں بھی کمی آجاتی تھی۔ مزید برآں نئے حاصل شدہ اقتدار اور مزید دولت کے حصول کی توقع نے کمپنی اور اس کے ملازمین کے دماغ خراب کر دیے اور انہوں نے مزید دولت حاصل کرنے کے لیے نواب کے افسروں اور بنگال کے غریب عوام کے ساتھ بدسلوکی اور ظلم و جبر شروع کر دیا۔ وہ ہندوستانی افسروں اور زمینداروں کو رشوت اور تحائف دینے پر مجبور کرنے لگے۔ ہندوستانی صنعت کار، کسانوں اور تاجروں کو اپنا مال سستے داموں فروخت کرنے اور

ان کا مال زیادہ قیمت پر خریدنے کے لیے مجبور کیا جانے لگا اور جو لوگ انکار کرتے انہیں اکثر کوڑے مارے جاتے یا قید کر دیا جاتا۔ ایک جدید برطانوی مورخ پرسیول اسپیئر (Percival Spear) کے الفاظ میں 'یہ کھلی ہوئی اور بیباک لوٹ مار کا عہد' تھا حقیقت یہ ہے کہ جس خوشحالی کے لیے بنگال مشہور تھا وہ آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔

میر قاسم نے یہ محسوس کیا اگر بدعنوانیاں اسی طرح جاری رہیں تو بنگال کو طاقتور بنانے کی نہ تو اس کی توقع ہی پوری ہو سکے گی اور نہ کمپنی کے تسلط سے ہی وہ آزاد ہو سکے گا۔ چنانچہ اس نے ایک زبردست قدم اٹھایا اور داخلی تجارت پر چنگی سرے سے معاف کر دی۔ اس طرح سے جو مراعات انگریزوں نے طاقت کے بل پر حاصل کی تھی، اسے اپنی رعایا کو اس نے خود ہی عطا کر دیا۔ لیکن غیر ملکی تاجر اپنے اور ہندوستانیوں کے درمیان برابری برداشت کرنے پر تیار نہیں تھے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ہندوستانی تاجروں پر چنگی دوبارہ عائد کی جائے۔ کشمکش سے پھر سے شروع ہونے والی تھی۔ حقیقت یہ تھیں کہ بنگال میں دو طاقتیں بیک وقت حکمرانی نہیں کر سکتی تھیں۔ میر قاسم اپنے آپ کو ایک آزاد حکمران تصور کرتا تھا۔ دوسری طرف انگریز یہ سمجھتے تھے کہ انہی کی بدولت چونکہ نواب کو اقتدار حاصل ہوا ہے، اس لیے اسے کٹھ پتلی بن کر ان کے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔

1763ء میں میر قاسم کو متعدد جنگوں میں شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر اودھ چلا گیا، جہاں اس نے نواب شجاع الدولہ اور مفرور مغل شہنشاہ شاہ عالم ثانی سے اتحاد کر لیا۔ 22 اکتوبر 1764ء کو تینوں حلیفوں نے بکسر کے مقام پر کمپنی کی فوجوں سے مقابلہ کیا لیکن انہیں مکمل شکست ہوئی۔ ہندوستان کی تاریخ کی یہ ایک انتہائی فیصلہ کن جنگ تھی، کیونکہ اس نے دو بڑی ہندوستانی طاقتوں کی متحدہ فوج پر برطانوی فوج کی برتری ثابت کر دی تھی۔ اس شکست نے انگریزوں کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کا حکمران بنا دیا اور اودھ کو بھی ان کے رحم و کرم پر انحصار کرنا پڑا۔

کلائیو نے، جو 1765ء میں گورنر بن کر بنگال واپس آ گیا تھا، موقع سے فائدہ اٹھانے کا اور رفتہ رفتہ بنگال کا اقتدار نواب سے نکال کر کمپنی کی طرف منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ 1763ء میں انگریزوں نے میر جعفر کو نواب کی حیثیت سے بحال کر دیا تھا، اس کے معاوضہ میں کمپنی اور اس کے افسروں کو بھاری رقمیں حاصل ہوئی تھیں۔ میر جعفر کی موت کے بعد اس کے دوسرے بیٹے نظام الدولہ کو بنگال کا نواب بنایا گیا اور اس کے معاوضہ میں اسے ایک نئے معاہدے پر دستخط کے لیے 20 فروری 1765ء کو کمپنی نے مجبور کیا۔ اس معاہدہ کی شرطیں یہ تھیں: نواب اپنی فوج کے بڑے حصے کو برخاست کر دے اور بنگال کے نظم و نسق کے لیے ایک نائب صوبیدار مقرر کرے، جو کمپنی کا نامزد کردہ ہو اور جسے کمپنی کی منظوری کے بغیر برخاست نہ کیا جائے۔ اس طرح سے کمپنی نے بنگال کے نظم و نسق (نظامت) پر مکمل اقتدار حاصل کر لیا۔ اس موقع پر بھی کمپنی کی بنگال کونسل نے نواب سے پندرہ لاکھ روپے کی رقم حاصل کی۔ مغل سلطنت کے برائے نام سربراہ شاہ عالم ثانی سے کمپنی نے بنگال کی دیوانی اور بنگال بہار اور اڑیسہ میں دیوانی حقوق حاصل کر لیے۔ اس طرح سے بنگال پر کمپنی کے اقتدار کو قانونی حیثیت حاصل ہو گئی اور ہندوستان کے ایک خوشحال ترین صوبے کی آمدنی پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ بنگال کی دیوانی کے معاوضے میں کمپنی نے شاہ عالم ثانی کو چھبیس لاکھ روپے کی امدادی رقم دینی منظور کی۔ لیکن کڑہ اور الہ آباد کے اضلاع بھی کمپنی نے حاصل کر لیے۔ مغل شہنشاہ رچھ سال تک کمپنی کے قیدی کی

طرح الٰہ آباد کے قلعے میں مقیم رہا۔

اودھ کے نواب شجاع الدولہ نے تاوان جنگ کے طور پر پچاس لاکھ روپے ادا کیے اور اسے ماتحت امدادی معاہدہ بھی کرنا پڑا، جس کے مطابق بیرونی حملے کی حالت میں کمپنی نے اس شرط پر اس کی حفاظت کا وعدہ کیا کہ امدادی فوج کے اخراجات نواب کو برداشت کرنے ہونگے۔ اس معاہدے کے بعد نواب کی حیثیت کمپنی کے ایک ماتحت کی سی ہوگئی۔ نواب نے اس غلط فہمی کی بناپر اس معاہدہ اتحاد کو خوش آمدید کہا تھا کہ کمپنی بنیادی طور پر ایک تجارتی ادارہ ہے، جس کا اقتدار وقتی ہے۔ اصل دشمن تو مراٹھا اور افغان ہیں۔ یہ وہ غلطی تھی جس کی اودھ کو اور سارے ملک کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ دوسری طرف انگریزوں نے بڑی دانشمندی سے بنگال میں اپنی فتوحات کو مستحکم کرنے کا فیصلہ کیا اور اودھ کو اپنے مقبوضات اور مراٹھوں کے درمیان وسطی ریاست کی حیثیت سے استعمال کیا۔

3.5.3 بنگال میں دوہری حکومت (Dual Government in Bengal)

ایسٹ انڈیا کمپنی کم از کم 1765ء سے بنگال کی حقیقی حکمران بن گئی۔ دفاع کی مکمل ذمہ داری اس کی فوج پر تھی اور سیاسی اقتدار بھی اسی کے ہاتھ میں تھا۔ اپنے داخلی اور بیرونی تحفظ کے لیے بھی نواب کا انحصار کمپنی ہی پر تھا۔ دیوان کی حیثیت سے وہ براہ راست محاصل وصول کرتی اور نائب صوبیدار کو نامزد کرنے کا حق بھی اسے حاصل تھا، لیکن اس نے پوری حکومت پولیس اور عدالتی نظام کو ابھی اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔ اسی نظام کو علم تاریخ کی اصطلاح میں دو عملی یا دوہری حکومت کہا جاتا ہے۔ اس میں انگریزوں کا بڑا فائدہ تھا، کیونکہ ان کو اختیارات سارے حاصل تھے لیکن ان کی ذمہ داری کچھ بھی نہیں تھی۔ فوج اور صوبے کی مالیات پر ان کا براہ راست اور نظم ونسق پر بالواسطہ قبضہ تھا۔ نواب اور اس کے افسروں کے ہاتھ میں نظم ونسق ضرور تھا، لیکن نظم ونسق چلانے کے اختیارات انہیں حاصل نہیں تھے۔ حکومت کی کمزوری کی ذمہ داری ہندوستانیوں کے سر تھوپ دی جاتی تھی۔ اس کے نتائج بنگالی عوام کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے، کیونکہ کمپنی کو توان کی فلاح وبہبود کی فکر ہی نہیں تھی اور نہ نواب اس سلسلے میں کچھ کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نواب اور اس کے افسروں کو وہ اختیارات حاصل ہی نہیں تھے، جن سے عوام کو کمپنی اور اس کے ملازمین کی حرص وغارت گری سے وہ بچا سکتے۔ دوسری طرف کمپنی کے ملازمین بھی اپنی افسرانہ حیثیت سے جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے میں لگے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں خود کلائیو کا یہ اقتباس پیش کیا جاسکتا ہے:

> میں تو کہوں گا کہ نراج، افراتفری، رشوت ستانی، بدنظمی اور جبری استحصال کے ایسے منظر بنگال کے علاوہ اور کسی ملک میں نہ تو دیکھے گئے نہ سنے گئے اور نہ اس درجہ غیر منصفانہ اور قزاقانہ انداز میں اتنی دولت کہیں جمع کی گئی ہوگئی۔ میر جعفر کی صوبہ داری کے وقت سے بنگال، بہار اور اڑیسہ تینوں صوبوں کے محاصل پر، جن کی مجموعی آمدنی واضح طور پر تیس لاکھ پونڈ سالانہ تھی، کمپنی کے ملازمین کو مکمل اختیارات حاصل تھے۔ دیوانی اور فوجی دونوں نظام ان ہی کے ہاتھ میں تھے۔ نواب سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے زمیندار تک، جو بھی صاحب ثروت نظر آتا، اس پر وہ من مانی محصول عائد کرتے اور وصول بھی کر لیتے۔

کمپنی کے ارباب اختیار زر و جواہر جمع کرنے اور بنگال کی ساری دولت کھینچ لینے پر تلے ہوئے تھے۔ ہندوستانی مال کی خریداری کے لیے بھی انگلینڈ سے رقم بھیجنی بند کر دی گئی تھی۔ بنگال کے محاصل کی آمدنی سے اسباب تجارت خرید کر باہر کے ملکوں میں فروخت کیا جاتا۔ اس آمدنی کو کمپنی کا منافع کہا جاتا اور سرمایہ کاری کا نام دیا جاتا۔ سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ برطانوی حکومت بھی اس لوٹ مار میں اپنا حصہ لگاتی۔ 1767ء میں اس نے کمپنی کو چار لاکھ پونڈ سالانہ ادا کرنے کا حکم دیا تھا۔ صرف 68-67-1766ء کے تین برسوں میں تقریباً ستاون لاکھ پونڈ کی رقم بنگال سے کھینچ لی گئی تھی۔ دو عملی کے نقصانات اور دولت کی نکاسی (Drain of Wealth) نے اس بدنصیب صوبے کو مفلس و قلاش بنا دیا۔ 1770ء میں بنگال میں اتنا شدید اور بھیانک قحط پڑا کہ انسانی تاریخ میں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ لاکھوں آدمی مر گئے اور بنگال کی ایک تہائی آبادی اس قحط کی تباہ کاریوں کا شکار ہوئی۔ اگرچہ یہ قحط بارش کی کمی سے رونما ہوا تھا، لیکن کمپنی کی پالیسیوں نے اس کی شدت میں اضافہ کر دیا تھا۔

3.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تاجروں کی شکل میں آنے والی ایک برطانوی کمپنی کس طرح ایک غالب علاقائی طاقت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دوسرے یورپی تاجروں کی طرح برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقصد بھی ایشیائی تجارت سے فائدہ اٹھانا تھا۔ اس سلسلے میں اسے اپنی حریف تجارتی کمپنیوں، پرتگالی، ڈچ، فرانسیسیوں سے بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ سمندر میں انہیں اپنی مضبوط بحری طاقت کا فائدہ حاصل تھا لیکن خشکی میں انہیں مقامی طاقتوں سے مصالحانہ رویہ اپنانا پڑا۔ مغلوں کے دور عروج میں انہوں نے علاقائی اجارہ داری حقوق پر زور دینے کی جو کوشش کی تھی وہ بری طرح ناکام ہوئی اور انہیں مغل شہنشاہ اورنگزیب سے معافی طلب کرنی پڑی۔ مغل سلطنت کے زوال سے انہیں اپنے اقتدار کی توسیع کا موقع فراہم ہوا۔ فرانسیسیوں نے انگریزوں علاقائی فتوحات کی راہ دکھائی اور کرناٹک جنگوں میں مقامی ہندوستانی فوج کی کمزوریاں صاف ظاہر ہو گئیں۔ اس سے حوصلہ پا کر انہوں نے بنگال میں منمانی کرنی شروع کر دی اور نواب کے احکام کی حکم عدولی کی۔ نتیجتاً پلاسی کی جنگ ہوئی جس نے بنگال کو عملاً کمپنی کے کنٹرول میں دے دیا۔ بنگال کے وسیع وسائل سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے مقامی سپاہیوں پر مشتمل اپنی افواج منظم کیں اور مزید فتوحات کی راہ ہموار کی۔ بکسر کی جنگ میں اس باقاعدہ اظہار ہوا، کیونکہ پلاسی کی جنگ تو غداری اور دھوکہ دہی کے بل پر جیتی گئی، لیکن بکسر کی جنگ ایک باقاعدہ آمنے سامنے کی جنگ تھی جس میں قلیل تعداد میں برطانوی فوج نے اپنے سے کئی گنا زیادہ تعداد والی فوج کو دھول چٹا دی۔ اس جنگ کے بعد بنگال، بہار اور اڑیسہ کے دیوانی حقوق کمپنی کو منتقل ہو گئے۔ اودھ کو ماتحت امدادی معاہدہ کرنا پڑا اور مغل شہنشاہ پہلے سے زیادہ انگریزوں پر منحصر ہو گیا۔

3.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

چارٹر : منشور

راس امید : راس امید (Cape of Good Hope)، براعظم افریقہ کا انتہائی جنوبی سرا

ڈچ : ہالینڈ کے باشندے

3.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

3.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. امریکی وزیر Jabez T. Sunderland کی کتاب کا نام بتائیے۔
2. کتاب *The Story of Civilisation* کے مصنف کون ہیں؟
3. 1687ء تک انگریزوں کی تجارت کا مرکز کہاں رہا؟
4. کس سال میں کمپنی کے ارباب اختیار نے سورت کی فیکٹری کو قلعہ بند کرنے کی کوشش کی؟
5. بمبئی کا جزیرہ کمپنی کو 1668ء میں کس سے حاصل ہوا؟
6. انگریزوں اور مغل شہنشاہ میں پہلی جنگ کس سال میں ہوئی؟
7. ایسٹ انڈیا کمپنی کو مشرق کے ساتھ کس راستے سے پندرہ سال کے لیے تجارت کرنے کا منشور عطا کیا گیا تھا؟
8. منشور کے مطابق کمپنی کا انتظام کس کے سپرد تھا؟
9. فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کس سال میں قائم کی گئی تھی؟
10. ہندوستان میں فرانسیسی علاقائی سلطنت کی بنیاد کس نے ڈالی؟

3.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. برطانوی فتح کے وقت ہندوستان کی حالت پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔
2. کمپنی کی داخلی تنظیم پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. ہندوستان میں کمپنی کی فیکٹریوں کی تنظیم پر روشنی ڈالیے۔
4. بنگال کی معاشی لوٹ کھسوٹ پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔
5. بنگال میں دوہری حکومت پر ایک نوٹ لکھیے۔

3.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ایسٹ انڈیا کمپنی کے عروج وارتقا پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. جنوبی ہند میں انگریزی فرانسیسی جدوجہد پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے فرانسیسیوں کے ناکامی کے اسباب بیان کیجیے۔
3. پلاسی کی جنگ کے اسباب ونتائج پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔

3.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
2. Dalrymple, William, *The Anarchy*: *The East India Company*, *Corporate Violence*, *and the Pillage of an Empire*, Bloomsbury Publishing, London, 2019.
3. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019.
4. Durant, Will, *The Case for India*, Standard Book Stall, Mumbai, 2007.
5. Freedman, Paul, *Out of the East*: *Spices and the Medieval Imagination*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2008.
6. Gandhi, Rajmohan, *A History of Modern South India*: *A History from the 17th Century to Our Times*, Aleph book Company, New Delhi, 2018.
7. Metcalf, Barbara D. and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).
8. Pearson, M.N., *The Portuguese in India*: *The New Cambridge History of India*, Cambridge University Press, Cambridge, 2006 (first pub. 1987).
9. Roy, Tirthankar, *The East India Company*: *The World's Most Powerful Corporation*, Allen Lane/ Penguin, New Delhi, 2012.
10. Subramanian, Lakshmi, *History of India*, *1707–1857*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.
11. Wilson, Jon, *India Conquered*: *Britain's Raj and the Chaos of Empire*, Simon and Schuster, London and New Delhi, 2017.

اکائی 4۔ آزاد خیالی اور سامراج: استشراقیت، افادیت پسندی اور مقامی رد عمل

(Liberalism and the Empire: Orientalism, Utilitarianism, and Native Responce)

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی سیاست

4.3 ابتدائی نظریہ

4.4 نئے سماجی اور سیاسی نظریات

4.4.1 آزاد خیالی

4.4.2 استشراقیت

4.4.3 اناجیلی روایت پرستی

4.4.4 افادیت پسندی

4.4.5 رومانیت

4.5 مقامی رد عمل

4.6 اکتسابی نتائج

4.7 کلیدی الفاظ

4.8 نمونہ امتحانی سوالات

4.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

4.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

4.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

4.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

4.0 تمہید (Introduction)

اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف اور انیسویں صدی کے پہلے نصف میں، سلطنت کے بارے میں نئے نظریات منظر عام پر آئے جنہوں نے تہذیبی ترقی کے مختلف مرحلوں کے حوالے سے ہندوستان میں برطانوی حکومت کو جواز دینے کی کوشش کی۔ نئے یورپی نظریات جیسے عدم مداخلت (Laissez-faire) ، استشراقیت (Orientalism)، افادیت پسندی (Utilitarianism)، انسان دوستی (Humanism) اناجیلی عقائد پرستی (Evangelicalism) وغیرہ کو ہندوستان میں سامراجی نوآبادیات کی تعمیر اور سماجی اصلاح کے مشن کے تصورات کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ ان میں سے بیشتر نظریات نے اٹھارہویں صدی ہی سے ہندوستان میں برطانوی انتظامیہ کو متاثر کرنا شروع کیا جس وقت تک انہوں نے بالآخر اپنی حکمرانی قائم کرلی تھی۔ اس لیے یہ لازمی ہے کہ پہلے ہندوستان میں اس دور کی سیاسی صورتحال کو جان لیا جائے تاکہ یہ سمجھا جاسکے کہ ان نظریات نے برطانوی پالیسیوں کو کس طرح تشکیل دیا۔

4.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- یورپ میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ابھرنے والے نئے سیاسی نظریات جیسے آزاد خیالی، استشراقیت، افادیت پسندی، انسان دوستی وغیرہ سے واقف ہوسکیں گے
- ہندوستان پر ان نئے نظریات کے اثرات سے واقف ہوسکیں گے
- اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان کے بارے میں برطانوی نقطہ نظر کی تشکیل کی وضاحت کرسکیں گے۔
- انیسویں صدی میں نئے سیاسی نظریات کی روشنی میں برطانوی انتظامیہ میں تبدیلیاں کو نشان زد کرسکیں گے۔
- انتظامیہ میں ان نئی تبدیلیوں پر ہندوستانیوں کے ردعمل کی جانکاری حاصل کرسکیں گے۔

4.2 اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی سیاست (Indian Politics in the Eighteenth Century)

مغلوں کا زوال اٹھارہویں صدی کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک تھا۔ مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ، اٹھارہویں صدی کا دوسرا بڑا موضوع علاقائی ریاستوں کا ظہور تھا۔ موٹے طور پر تین قسم کی ریاستیں نمودار ہوئیں۔

- جانشین ریاستیں: یہ وہ ریاستیں تھیں جو مغل سلطنت سے الگ ہوئیں جیسے حیدرآباد، بنگال اور اودھ وغیرہ۔
- باغی ریاستیں: یہ وہ ریاستیں تھیں جو مغلوں کے مخالفین نے قائم کیں جیسے مراٹھا، سکھ، جاٹ اور روہیلے وغیرہ۔
- آزاد ریاستیں: یہ وہ ریاستیں تھیں جو یا پہلے سے موجود تھیں یا بعد میں آزادانہ طور پر قائم کیں گئیں جیسے میسور، راجپوت ریاستیں اور تراونکور وغیرہ۔

یہ ریاستیں اتنی طاقتور تو تھیں کہ مغل اقتدار کو تباہ کر سکتی تھیں لیکن کوئی بھی ایک مضبوط حکومت قائم کر کے اسے کل ہند سطح پر تبدیل کرنے کے قابل نہیں تھا۔ علاقائی طاقتیں مغلوں کی جگہ لینے کے قابل نہیں تھیں۔ اگرچہ کچھ ریاستیں بہت خوشحال تھیں، اور کچھ نے خاطر خواہ فوجی کامیابیاں حاصل کیں، تاہم، کوئی بھی کل ہند پالیسی کو برقرار رکھنے کے لیے وسائل اور طاقت حاصل نہیں کر سکا۔ جدید کاری کی کوششیں محدود تھیں۔ پسماندہ علاقائی ریاستیں اعلیٰ برطانوی نظام کے سامنے آسانی سے جھک گئیں۔

اٹھارہویں صدی کی سیاست کی تیسری اور سب سے اہم خصوصیت ہندوستان میں برطانوی اقتدار کا عروج اور توسیع تھی۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر نے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک تجارتی کمپنی سے سیاسی طاقت میں بدلتے دیکھا۔ برطانوی حکمرانی کا باقاعدہ آغاز 1757 میں اس وقت ہوا جب انگریزوں نے پلاسی کی جنگ میں بنگال کے نواب کو شکست دی۔ حالانکہ اس فتح کی بنیاد بہت پہلے جنوبی ہندوستان میں ڈالی جا چکی تھی جہاں برطانوی فوجی طاقت اور سفارتی حکمت عملی نے اپنے حریف فرانسیسیوں کو شکست دے کر اپنی تجارتی اجارہ داری قائم کر لی۔ کرناٹک کی جنگوں میں کمپنی کو اپنی طاقت اور مقامی حکمرانوں کی کمزوری کا احساس ہوا۔ اپنی اعلیٰ ترین قوت کے احساس اور کمپنی کی مزید آمدنی کی ضرورت اور خواہش نے اسے ہندوستان کے علاقوں پر سیاسی تسلط حاصل کرنے اور اپنی سلطنت قائم کرنے کی ترغیب دی۔ کمپنی کو اپنی تجارت کو برقرار رکھنے اور اپنے فوجیوں کو ادائیگی کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ علاقوں کو فتح کرنے میں کمپنی کی دلچسپی دو وجوہات کی بنا پر تھی، ا۔ سیاسی غلبے سے مسابقت کا خاتمہ ۲۔ زمینی مالگذاری کی شکل میں سرمایے کا حصول۔

4.3 ابتدائی نظریہ (Early Theory)

برطانوی ذہن میں ہندوستان کا ابتدائی تصور ان کے اپنے مغربی تجربے اور دنیا کو دریافت کرنے کی ان کی عظیم بحری مہمات کے لحاظ سے تھا۔ ہندوستان پہنچنے والے ان کے ابتدائی سیاحوں ، ایڈورڈ ٹیری (Edward Terry) اور جان اوونگٹن (John Ovington) نے 1689 میں مغل حکومت کو 'مسلم استبداد (Muslim Tyranny) کی ایک مثال' قرار دیا۔ ابتدائی انگریزوں نے، جنہوں نے عظیم سیاح برنیئر کی تحریروں میں عثمانی اور فارسی سلطنتوں کے بارے میں پڑھا تھا، شاید محسوس کیا کہ مغلوں کا گہرا مطالعہ کر کے بھی انہیں کوئی ایسی معلومات نہیں مل سکتی تھی جو وہ پہلے سے نہ جانتے ہوں۔ سر ولیم ٹیمپل (Sir William Temple) جیسے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ کلاسیکی دور میں لیکورگوس (Lycurgus) اور فیثاغورث (Pythagoras) کو ہندوستانیوں نے تعلیم دی تھی۔

تاہم، عام تاثر یہ تھا کہ 17 ویں صدی میں ہندوستان میں تعلیمی روایت باقی نہیں رہی۔ ٹیری کہتا ہے کہ برہمن جو قدیم علم کے مخزن تھے، زوال پذیر ہو چکے ہیں۔ اس زوال کی دیگر علامات کا پتہ انگریزوں نے ہندوستان کے مغربی ساحل کی برادریوں کے ساتھ رابطے میں پایا۔ یہ دلیل دی گئی کہ وہ 'سخت کوش، مطیع، کفایت شعار اور بزدل لوگ تھے' جو ذہنی لحاظ سے غیر لچکدار تھے۔ ذات پات کے نظام کو اکثر ان کے غیر لچکدار ذہن کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ بڑے پیمانے پر ان کی یہ شبیہ بنی رہی۔ تاہم، مزید مستقل نوآبادیات کے قیام کے ساتھ، انگریزوں کو مزید ہندوستانی حقائق کا سامنا کرنا پڑا۔

4.4 نئے سماجی اور سیاسی نظریات (New Social and Political Theories)

1773 سے 1857 کے بعد کی دہائیوں میں، جب نو آبادیاتی طاقت کو ادارہ جاتی بنایا گیا اور مستحکم کیا گیا، ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکار فلاحی سرگرمیوں میں مشغول تھے اور نو آبادیاتی حکام نے کمپنی کے ان فلاحی امور کو 'عوامی افادیت کے کام' کے طور پر پیش کیا اور اس بات کا اظہار کیا کہ وہ توہم پرستانہ اور بے مقصد ہندوستانی سماجی روایت کے خلاف ہیں۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں ایک حکمران قوت کے طور پر اپنی ذمہ داریاں سنبھالنا شروع کیں تو اس نے ایک اصلاحی مشن کی ذمہ داری سنبھالی جس میں متعدد سماجی مسائل جیسے ستی، بیوگی، طفل کشی، بچپن کی شادی وغیرہ شامل تھے۔ مختصراً، سامراجی مغربی نظریات کو بہتری، ترقی اور جدیدیت کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا جو بالآخر ہندوستان میں برطانوی حکومت کی قانونی حیثیت کو جائز ثابت کرنے کا باعث بنا۔

17 ویں اور 18 ویں صدی میں، جسے یورپ کا روشن خیالی کا دور کہا جاتا ہے، سائنس اور منطق مغربی سماج کے لوگوں کے لیے عقیدے کے نئے ذرائع بن گئے، جس نے یورپی سرمایہ داری اور پھر نو آبادیاتی نظام کے فروغ میں مدد دی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران نو آبادیاتی ہندوستان میں برطانوی سلطنت، عالمی سطح پر 'یورپی دانشوریت اور سامراجیت' کے دور میں سامراجی کامیابیوں کا ایک جیتا جاگتا ثبوت تھی، جو 'غیر مساوی معاشی، ثقافتی، اور حاکم و محکوم کی بنیاد پر علاقائی تعلقات کی تخلیق و برقراری' کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

یورپ میں تخلیقی دریافتوں کا عظیم دور نشاۃ ثانیہ کے دوران شروع ہوا اور بعد ازاں یہ استدلال اور سائنس کے تحفے سے آراستہ ہو گیا۔ طاقتور اور مہم جو قوموں نے دنیا کے مختلف حصوں میں نوآبادیاں قائم کرنے کی شروعات کی۔ نئی جغرافیائی دریافتوں اور بحری اسفار کی ترقی نے نئے علم کو پھیلایا جس نے مشرق اور مغرب دونوں میں باصلاحیت مردوں کو تازہ اعتماد کے ساتھ حیات انسانی کے مختلف شعبوں میں اپنی بہترین کارکردگی کے مظاہرے پر مائل کیا۔ جیسے جیسے سائنسی دریافتوں نے فطرت اور اس کے رازوں کو آشکار کیا، انسانی ذہن مزید پر اعتماد ہوتا چلا گیا۔ اندھی عقیدت کے بجائے عقلی وضاحت، مغرب کی مادی اور روحانی زندگی کی مشعل راہ بن گئی۔ سائنس نے انسانوں کو عقلی بصیرت کے ساتھ مستقبل کی طرف متوجہ کیا تھا۔ تبدیلی کی ہوائیں ہر سو چلنے لگیں۔ تحقیق و دریافت کے نئے جذبے نے پرانے افکار کو منہدم کر کے نئے خیالات کو جنم دیا۔ سائنس نے اس عمل کو رفتار دی اور ایک بہتر زندگی کے لیے دولت کے حصول کی کوششوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہندوستان میں، یہ نظریاتی دھارے اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف میں نو آبادیاتی نظام کے ساتھ آئے۔ اس نے ایسی قوتیں پیدا کیں جنہوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر سماجی نظام اور بے شمار جاہلانہ روایات کی جڑیں کاٹ ڈالیں اور نئی عقلی سماجی سطح، جدیدیت اور بین الثقافتی ذہنیت کے ظہور کی بنیاد کو تخلیق کیا۔

برطانوی سلطنت نے نئے ذہنی فلسفے (سفید آدمی کا بوجھ)، معاشیات کے نئے نظریات (آزاد تجارت بمقابلہ تحفظ)، انتظامیہ کے نئے طریقے (براہ راست بمقابلہ بالواسطہ حکمرانی)، نئے سماجی نظریات (نسلی برتری)، نئے تاریخی نظریات (ایونجیلیکل اور افادیت پسند)، نئے ہیومنزم (سیاہ نسلوں کی ترقی)، نیا مذہب (ترقی اور تہذیب کی خوشخبری)، یہاں تک کہ نئے خواب (روڈس اور اس کی عالمی سلطنت) کو جِلا

بخشی۔ انگریز دھیرے دھیرے 'نئے رومیوں' کے طور پر ابھرے، جن پر دنیا بھر کے پسماندہ لوگوں کو مہذب بنانے کی ذمے داری تھی۔ مابعد روشن خیالی کے فکری ماحول میں، انگریزوں نے بھی اہل مشرق کے مقابلے میں خود کو جدید یا مہذب قرار دینا شروع کر دیا اور جس نے، نام نہاد 'اصلاح کے دور' سے منسوبانیسویں صدی، میں ان کے سامراجی نظریات کو استدلالی حیثیت بخشی۔

4.4.1 آزاد خیالی (Liberalism)

آزاد خیالی ایک سیاسی اور فلسفیانہ نظریہ ہے جو یورپ میں انفرادی آزادی، رضامندی اور مساوات قائم کرنے کے لیے نمودار ہوا۔ آزاد خیالی کا نظریہ، روشن خیالی (Enlightenment) کے دور میں ایک علاحدہ سیاسی تحریک کے طور پر ظاہر ہوا اور یورپی ماہرین معاشیات اور فلسفیوں میں پھیل گیا۔ اس نے موروثی استحقاق، مطلق العنان بادشاہت، ریاستی عقیدہ، اور بادشاہوں کے الوہی حق کے اس وقت موجودہ نظریات کو چنوتی دی۔ اس نے قدامت پسندی اور راسخ الاعتقادی کو مسترد کر دیا اور قانون کی حکمرانی اور نمائندہ جمہوریت کو اس کی جگہ دی۔ علاوہ ازیں، آزاد خیالی نے شاہی اجارہ داریوں، ذخیرہ اندوزی کی پالیسیوں اور دیگر تجارتی رکاوٹوں کو ختم کر دیا۔ اس کے بجائے، اس نے آزاد تجارت، عالمگیریت اور بازار کاری کی وکالت کی۔ آزاد خیالی کے نظریے کی ابتدا 17 ویں صدی کے انگریز سیاسی مفکر اور فلسفی جان لاک (John Locke) کے نظریات سے ہوتی ہے۔ اس کے مطابق، ہر انسان کو زندگی، آزادی اور نجی جائیداد کا حق حاصل ہے اور حکومتوں کو ان کی مخالفت کرنے کی بجائے ان کی حفاظت کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست، رعایا کے کاموں میں مداخلت نہ کرے۔

آزاد خیالی، مغرب کے انفرادیت کے تصور سے ماخوذ ہے، جب کہ دوسری تہذیبوں میں حیثیت، ذات اور روایت پر زور دیا جاتا ہے۔ پوری تاریخ میں، افراد اپنے قبیلے، خاندان، نسلی گروہ، یا سلطنت کے تحت تھے اور اس کے زیر اثر رہے۔ آزاد خیالی مغربی سماج میں ترقی کی انتہا ہے جس نے انسانی انفرادیت کی اہمیت کا احساس پیدا کیا، فرد کو گروہ کی مکمل تابعداری سے نجات دلائی اور رواج، قانون اور اقتدار کی سخت گرفت میں نرمی پیدا کی۔ اس لحاظ سے، آزاد خیالی فرد کی آزادی کے لیے کھڑی ہے۔

اگرچہ 16 ویں صدی کے اوائل تک یوروپی سیاست میں آزاد خیالی کے نظریات نمایاں طور پر نظر نہیں آتے، لیکن آزاد خیالی کی ابتدائی تاریخ ہمیں عہد وسطیٰ اور اس سے بھی کہیں قبل ملتی ہے۔ عہد وسطیٰ میں افراد کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین ایک مراتب والے سماجی نظام میں ان کے مقام سے ہوتا تھا جسے بلا ردوکد قبول کر لینے اور مطابقت اختیار کر لینے کا دباؤ رہتا تھا۔ بعد کے عہد وسطیٰ میں یورپ کی سست تجارت کاری اور شہر کاری کے اثرات، نشاۃ ثانیہ کے فکری خمیر اور 16 ویں صدی میں پروٹسٹنٹ فرقے کے پھیلاؤ کے اثرات کے تحت، سماج کی پرانی جاگیردارانہ درجہ بندی آہستہ آہستہ ختم ہونا شروع ہو گئی، جس کے نتیجے میں عدم استحکام کا خوف پیدا ہو گیا۔ عدم استحکام کا یہ خوف اتنا زیادہ تھا کہ بادشاہی مطلق العنانیت کو شہری بغاوت کا واحد علاج سمجھا جاتا تھا۔ 16 ویں صدی کے آخر تک، شمالی یورپ کے بیشتر حصوں میں پاپائیت کا اختیار ختم ہو چکا تھا، اور حکمرانوں نے رومن کیتھولک یا پروٹسٹنٹ فرقے کے ترجیحی نمونے کے مطابق عمل کر کے اپنے آپ کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ ان کوششوں کا اختتام تیس سالہ جنگ (48-1618) میں ہوا، جس نے یورپ کے بیشتر حصے کو بے پناہ نقصان پہنچایا۔

قومی حکمرانوں کے عزائم اور صنعت و تجارت کو وسعت دینے کے تقاضوں کے نتیجے میں بتدریج ایسی معاشی پالیسیوں کا ظہور ہوا جو تجارتی تحفظ پسندی پر مبنی تھیں۔ تجارتی تحفظ پسندی (Mercantilism) ایک ایسا نظریہ ہے جس نے ریاست کی دولت اور طاقت کو بڑھانے کے لیے ملک کی معیشت میں حکومتی مداخلت کی وکالت کی۔ تاہم، چونکہ اس طرح کی مداخلت نے حکمرانوں کے مفادات کو پورا کیا اور تجارت کی راہ میں رکاوٹ ڈالی۔ اسے نئے ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کے ارکان نے چنوتی دی۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں میں انگلینڈ اور فرانس کو ہلا کر رکھ دینے والے عظیم انقلابات بالخصوص برطانوی خانہ جنگی (51-1642)، عظیم الشان انقلاب (1688)، امریکی انقلاب (83-1775)، اور فرانسیسی انقلاب (1789) میں یہ چنوتی ایک اہم عنصر تھی۔ ان عظیم انقلابات کا ایک واضح نتیجہ ایک نظریے کے طور پر آزاد خیالی کا ابھرنا تھا۔

آزاد خیالی کا آغاز سولہویں سے اٹھارہویں صدی کی سیاسی تبدیلیوں سے ہوا۔ لیکن یہ نظریہ 1789 کے فرانسیسی انقلاب کے بعد ایک مکمل سیاسی اصول میں بدل گیا۔ بعد میں، انیسویں صدی میں، یہ نظریہ صنعتی انقلاب اور یورپ میں ترقی پذیر شہر کاری کے نتیجے کے طور پر سامنے آیا۔ آزاد خیالی کا کلاسیکی نظریہ ریاست کی کم سے کم قوت اور محدود کام پر زور دیتا ہے۔ اس نے انا پرستی (Egotism)، خود کفیل ہونے اور اپنی معاشی حالات کی خود ذمہ داری اٹھانے پر مزید زور دیا۔ ایک معاشی نظریہ کے طور پر اس نے خود انتظامی بازار کو فروغ دیا۔

4.4.2 استشراقیت (Orientalism)

استشراقیت، اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا ایک مغربی شعبۂ علم ہے جس نے ایشیائی سماجوں خصوصاً قدیم سماجوں کی زبان و ادب، مذاہب، فلسفے، تاریخ، آرٹ اور قوانین کے مطالعہ پر زور دیا۔ چونکہ استشراقیت، ایشیائی یا مشرقی چیزوں کے لیے عمومی جوش و جذبے کو ابھارنے کا بھی باعث بن سکتی ہے، اس طرح کی علمی کوشش نے یورپ اور شمالی امریکہ میں وسیع تر فکری اور فنکارانہ حلقوں کو تحریک بخشی۔ برطانوی نوآبادیاتی منتظمین اور دانشوروں میں مستشرقین کا بھی ایک گروہ تھا جنہوں نے یہ استدلال کیا کہ ہندوستان پر اس کی اپنی روایات اور قوانین کے مطابق حکومت کی جانی چاہیے۔ اس طرح انہوں نے اینگلو پرستوں (Anglicans) کی مخالفت کی جن کا ماننا تھا کہ ہندوستان پر برطانوی روایات اور قوانین کے مطابق حکومت کی جانی چاہیے۔ بیسویں صدی کے درمیان میں، مشرق کا مطالعہ کرنے والوں نے اپنے کام کو بیان کرنے کے لیے ایشیائی مطالعات (Asian Studies) کی اصطلاح استعمال کرنی شروع کی، تاکہ اسے مستشرقین کی نوآبادیاتی اور نئی نوآبادیاتی انجمنوں سے دور رکھا جا سکے۔ حال ہی میں، فلسطینی امریکی دانشور ایڈورڈ سعید (Edward Said) کے کاموں کے ذریعے معلوم ہوا کہ اس اصطلاح کو عام طور پر مغربی دانشوروں کے زیر اہتمام عرب اور ایشیائی ثقافتوں کے واضح طور پر سادہ، دقیانوسی اور توہین آمیز تصورات کا حوالہ دینے کے لیے اہانت انگیز طریقے سے استعمال کیا گیا ہے۔

ایک عالمانہ سرگرمی کے طور پر، استشراقیت اٹھارہویں صدی کے آخر میں یورپی تعلیمی مراکز اور ان کے نوآبادیاتی علاقوں میں ابھرا، جب مشرقی ایشیائی سماجوں کی زبانوں، ادب، مذاہب، قوانین اور آرٹ کا مطالعہ علمی توجہ اور فکری توانائی کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ اس دور میں،

مشرقی ایشیا پر تحقیق کرنے والے یورپیوں کی تعداد میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہوااور یونیورسٹیوں اور علمی انجمنوں میں اداروں کی طرف سے تعاون ملنے نے اس طرح کے مطالعے اور ان کے پھیلاؤ کی حوصلہ افزائی کی۔اس دانشورانہ مہم کا ایک عام موضوع یہ تھا کہ ایشیا کسی زمانے میں عظیم تہذیبوں کا گہوارہ رہا تھا جو تہذیبیں اب زوال کی موجودہ حالت میں پہنچ چکی تھیں۔بہت سے مستشرقین، نوآبادیاتی افسر شاہی سے جڑے ہوئے تھے، لیکن دوسرے ایسے نہیں تھے اور نوآبادیت پر ان کے نظریات مختلف تھے۔ایک علمی میدان کے طور پر استشراقیت پر فرانسیسی، انگریزی اور جرمن زبانوں میں تحقیق اور متعلقہ علمی مراکز کا غلبہ تھا،اور اس کے موضوعات جغرافیائی طور پر شمالی افریقی بحیرہ روم سے مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا تک پھیلے ہوئے تھے۔ مستشرقین کی سب سے اہم دریافتوں میں سے ایک یہ تھی کہ سنسکرت اور بہت سی یورپی زبانیں ایک دوسرے سے متعلق تھیں ، جس کا مطلب یہ تھا کہ یورپ اور ہندوستان کی تاریخی بنیادیں مشترک ہیں ۔ اس دریافت نے *Humanities* اور *Social Sciences* میں تقابلی طریقہ کار کو جنم دیا۔

استشراقیت(Orientalism)اور مستشرقین(Orientalist) کی اصطلاحات نے واضح طور پر سب سے پہلے اس وقت سیاسی معنی اختیار کیے جب ان کا استعمال ان انگریز دانشوروں،افسروں اور سیاست دانوں کے لیے کیا جاتا تھا جنہوں نے اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں برطانوی نوآبادیاتی پالیسی میں تبدیلیوں کی مخالفت کی تھی۔ یہ نوآبادیاتی پالیسی اینگلوپرستوں (Anglicists) کی طرف سے متعارف کروائی گئی تھی۔انہوں نے یہ دلیل دی کہ ہندوستان پر برطانوی قوانین اور اداروں کے مطابق حکومت کی جانی چاہیے۔ مستشرقین،اس کے برعکس، مقامی قوانین اور روایات کی اولیت پر اصرار کرتے تھے۔ان میں سے کچھ مستشرقین نے قدیم یا روایتی ہندوستانی قوانین اور قانونی ڈھانچے پر تحقیق کی تاکہ انہیں نوآبادیاتی نوکر شاہی کے استعمال کے لیے منظم کیا جائے۔تاہم، ستم ظریفی یہ ہے کہ مقامی روایت کو سمجھنے،اس سے مطابقت اپنانے اور حکومت کرنے کی برطانوی کوششوں نے اکثر ہندوستان کی سماجی اور سیاسی زندگی میں نمایاں تبدیلیاں لائی ہیں۔

اس طرح مستشرقین وہ برطانوی منتظم تھے جن کی رائے تھی کہ ہندوستان کو صحیح طریقے سے چلانے کے لیے ہندوستان اور اس کے ماضی کے بارے میں مکمل معلومات کی ضرورت ہے۔وارن ہیسٹنگز(Warren Hastings) جیسے مستشرقین تعلیم کے ایسے ادارے قائم کرنا چاہتے تھے جو پہلے ہندوستان کے سنہری ماضی کا علم حاصل کریں اور پھر اسے ان لوگوں تک پہنچائیں جو ہندوستان کا نظم ونسق سنبھال سکتے ہیں۔ہیسٹنگز ہندوستان میں انگریزی قوانین اور انگریزی طریقے رائج کرنے کے حق میں نہیں تھا۔اس کا بنیادی خیال تھا کہ ہندوستان پر ان کے اپنے طریقے سے حکومت کی جائے۔اس نے محسوس کیا کہ برطانوی حکومت کی تیز رفتار ترقی نے مختلف تعصبات کا آغاز کر دیا ہے۔اس نے محسوس کیا کہ ان کو روکنے کی ضرورت ہے۔دوسری بات یہ کہ وہ برطانوی حکومت کو ہندوستانی اداروں کے ساتھ ملانا چاہتا تھا۔اس کے لیے ملک کے 'آداب اور رسوم ورواج' کے بارے میں مزید گہری تحقیقات کی ضرورت تھی۔ ساتھ ہی اس کے لیے ہندوستانیوں کے ادب اور قوانین کا گہرائی سے تجزیہ کرنے کی بھی ضرورت تھی۔اس مقصد کے لیے،ہیسٹنگز کے لیفٹیننٹ میں سے ایک ہالہیڈ(Halhed) نے مذہبی اور روایتی قوانین کی ایک فہرست تیار کی جسے 'جینٹو لاز'(Gentoo Laws) کہا جاتا ہے جو مفاہمت کے عمل کو آسان بنانے میں مدد فراہم

کرنے کے لیے تھا۔

ایک اور مستشرق ولیم جونز(William Jones)، جو کہ ایک انگریز جج تھا، نے 1784 میں ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام میں مدد کی۔ یہ سوسائٹی ہندوستان کے سماجی، مذہبی، لسانی اور سیاسی پہلوؤں کا قریب سے مطالعہ کرنے میں مصروف تھی۔ یہ ایک لحاظ سے ابتدائی مسافروں کی طرح تھا جو عام طور پر نقوش ریکارڈ کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی نے گرامر، پرانوں اور کالیداس کی تحریروں اور فارسی اور سنسکرت تصنیفات کا ترجمہ کر کے اہم کردار ادا کیا۔ دوسرے یہ کہ، ایشیاٹک سوسائٹی کے اراکین نے ہندوستانی سماج اور مذہب پر تحقیق کی اور بڑی تعداد میں مضامین شائع کیے۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان اور اس کی ثقافت کا رومانوی جذبہ پورے یورپ میں پھیل گیا۔

عملی تربیت فراہم کرنے اور ہندوستانی انتظامیہ سے واقفیت کے لیے، مستشرقین نے 1800 میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ فورٹ ولیم کالج نے بنیادی طور پر اپنے طلباء کو ہندوستانی زبان سیکھنے پر آمادہ کیا تاکہ مستقبل کے منتظمین، ہندوستانیوں اور ان کے رسوم و رواج وغیرہ کو پیش نظر رکھ کر ان سے آسانی سے معاملات کر سکیں۔ اس سے انہیں سماج اور ہندوستان کے ماضی کو زیادہ ٹھوس انداز میں سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔ مزید برآں، فارسی کا مطالعہ برطانوی منتظمین کی عملی ضروریات کو پورا کرتا تھا۔ زیادہ تر ہندوستانی ریاستیں سرکاری ریکارڈ برقرار رکھنے اور روزمرہ کے کاروبار کو چلانے کے لیے فارسی زبان کا استعمال کرتی تھیں۔ اس طرح ہندوستان کے ماضی کی شان و شوکت اور برطانوی انتظامیہ کی عملی ضروریات کے بارے میں جاننے کا نظریہ صاف طور پر آپس میں ملا ہوا تھا۔ یہ مستشرقین کا ہی نظریہ تھا جس کی بنا پر ہندوستانی باشندوں نے، جو مختلف ماتحت ہندوستانی حکمرانوں کے درباروں میں تعینات تھے، فارسی کے علم اور استعمال دونوں کو دربار کے ثقافتی طرز زندگی کے ساتھ جوڑ دیا۔

4.4.3 اناجیلی روایت پرستی (Evangelicalism)

ابتدا میں برطانوی مستشرقین نے ہندوستان کے ماضی اور سماج کے بارے میں سیکھنے پر توجہ مرکوز کی اور کیوں کہ وہ اسے بغیر کسی رکاوٹ کے اس کے اپنے طریقے کے لحاظ سے چلانا چاہتے تھے، تاہم عیسائی مشنریوں نے اس طرز عمل پر ناراضگی ظاہر کی۔ مشنریوں کی رائے تھی کہ ہندوستانی معاشرہ تنزلی کی حالت میں ہے اور صرف عیسائی اقدار اور مذہب ہی اس کا علاج ہے۔ وہ ہندوستانی سماج کی موجودہ خرابیوں کی اصلاح کے کام کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ یہ مشنریاں ہندوستانی روایات، ثقافت، مذہب وغیرہ سے دشمنی رکھتی تھیں۔ یہ دشمنی اناجیلی روایت پرستی کی ایک خصوصیت یا علامت تھی۔ مزید اس میں ہندوستان کو 'مہذب' بنانے کی خواہش بھی شامل ہو گئی۔ مشنریوں کو تاجر برادری کی حمایت حاصل تھی جو مشنریوں کی خواہش کے مطابق ہندوستان میں جائیداد وغیرہ کے حصول کے لیے قوانین کے نفاذ سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ 'آزاد تجارت' کے تحت تاجر برادری ہندوستان میں برطانوی سامان کی ایک منڈی بنانا چاہتی تھی۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی مشنریوں کی سرگرمیوں کی حمایت کی۔ چارلس گرانٹ(Charles Grant) جیسے مشنریوں نے اس تہذیبی عمل اور مادی خوشحالی کے درمیان ایک تعلق کی نشان دہی کی۔

اناجیلی روایت پرستی نے ہندوستانی وحشی پن کے خلاف اپنی مذہبی جنگ کا آغاز کیااور 'ہندوستان کی فطرت' کو تبدیل کرنے کے مشن کے ساتھ برطانوی حکومت کے دوام کی وکالت کی۔ ہندوستان میں اس خیال کے ترجمان کلکتہ کے قریب سیرام پور میں واقع مشنری تھے۔ لیکن اس کا اصل مرکزی کردار چارلس گرانٹ تھا۔ اس نے 1792 میں دلیل دی کہ ہندوستان کا بنیادی مسئلہ وہ مذہبی نظریات تھے جنہوں نے ہندوستانی لوگوں میں جہالت کو پھیلایا۔ عیسائی روشنی کی تبلیغ کے ذریعے اسے مؤثر طریقے سے تبدیل کیا جاسکتا ہے، اور یہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا ایک عظیم مشن ہے۔ گرانٹ کے خیالات کو 1813 کے چارٹر ایکٹ، جس نے عیسائی مشنریوں کو بغیر کسی پابندی کے ہندوستان میں داخل ہونے کی اجازت دی، کی منظوری سے قبل پارلیمنٹ میں ولیم ولبر فورس (William Wilberforce) نے زیادہ مشہور کیا۔

بہتری اور تبدیلی کے تصور کی حمایت آزاد تجارت کے حامی تاجروں کی طرف سے بھی کی جارہی تھی، جن کا خیال تھا کہ اگر کمپنی ایک تاجر کے بجائے حکمرانی کے کام پر اپنی توجہ مبذول کرلے تو ہندوستان برطانوی سامان کے لیے ایک اچھی منڈی اور خام مال کا فراہم کنندہ ہوگا۔ ایک اچھی حکومت کے تحت ہندوستانی کسانوں کی حالت ایک بار پھر بہتر ہوگی جس سے وہ برطانوی مصنوعات کے صارفین بن سکیں گے۔ بنیادی طور پر، اناجیلی روایت پسندوں اور آزاد تجارت کے حامی تاجروں میں انضمام اور ہندوستانیوں کو انگریزی عقائد میں جذب کرنے کے عمل کی پالیسی کے حوالے سے کوئی بڑا فرق نہیں تھا۔ درحقیقت، یہاناجیلی روایت پسند چارلس گرانٹ تھا جس نے 1833 کے چارٹر ایکٹ کی منظوری کی صدارت کی۔ اس ایکٹ نے ہندوستان کی تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری ختم کردی۔

4.4.4 افادیت پسندی (Utilitarianism)

افادیت پسندی ایک روایت ہے جس کی جڑیں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے اواخر میں انگریز فلسفی اور ماہر معاشیات جیرمی بینتھم (Jeremy Bentham) اور جان اسٹوارٹ مل (John Stuart Mill) کے نظریات سے ملتی ہیں جن کے مطابق ہر وہ عمل صحیح ہوگا جو خوشی یا مسرت کو فروغ دے سکتا ہو اور وہ کوئی بھی عمل غلط ہوگا جو ناراضی یا درد پیدا کرتا ہو۔ یہ نہ صرف عمل کرنے والے کے لیے بلکہ اس سے متاثر ہونے والے ہر فرد کے لیے بھی ہے۔

افادیت پسند ہندوستان کو مہذب اور بہتر بنانے کے لیے تعلیم کے روادار راستے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ افادیت پسندوں نے مستشرقین کے افکار و نظریات سے اتفاق نہیں کیا۔ افادیت پسندوں کو ہندوستانی ماضی کی تاریخ یا تجربے کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ قانون اور زمینی جائیدادوں میں اصلاحات کے ذریعے تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ وہ ایسے حالات پیدا کرنا چاہتے تھے جہاں بازار پھل پھول سکیں۔ انہوں نے قانون کو بطور آلہ استعمال کرنے کی وکالت کی۔ وہ چاہتے تھے کہ عدلیہ یا قانون کا استعمال، ہندوستانی سماج کو بدلنے اور ستی اور بچیوں کے قتل جیسی رسموں پر پابندی لگانے کے لیے کیا جائے۔ ان کا ماننا تھا کہ قانون تبدیلی کا ایک ذریعہ ہوسکتا ہے اور ان (افادیت پسندوں) کی نگرانی میں قوانین کے نفاذ کے ذریعے ہندوستانی سماج کو توہم پرست سماج سے ایک جدید سماج میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد افادیت پسندوں کے

زیر اثر قوانین اور تعزیرات کا ایک سلسلہ نافذ کیا گیا۔

افادیت پسندوں نے اس وقت اور مستقبل قریب میں ہندوستان میں کسی بھی قسم کی نمائندہ حکومت کی مخالفت کی۔ گو کہ ہندوستان میں افادیت پسندی نے آزاد خیالی کی روایت کی کوکھ میں جنم لیا، اس نے ہندوستان میں کبھی بھی جمہوری حکومت کو قبول نہیں کیا۔ ایک افادیت پسند مفکر جیمس مل (James Mill) نے ہندوستان میں کسی بھی قسم کی نمائندہ حکومت کی مسلسل مخالفت کی۔ مزید برآں، قوانین کے نفاذ، زمینی جائیداد یا تعلیم کے ذریعے ہندوستانی سماج کو تبدیل کرنے کی تحریک افادیت پسندوں کے زیر اثر آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی گئی۔ بعد کے برطانوی منتظمین اس بات پر زور دیتے تھے کہ برطانوی حکومت ہمیشہ قانون کے تحت چلتی رہی ہے۔ تاہم، یہ دلیل دی گئی کہ موثر انتظامیہ کے لیے طاقت کا استعمال کیا جانا چاہیے اور سیاسی تبدیلی یا اصلاحات کا ذکر کر کے اس کا جواز پیش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہندوستان کو ایک غیر مہذب سماج سے ایک مہذب قوم میں تبدیل کرنے کا مفید کام، ایک موثر اور اچھی حکومت کے اصول کے تحت کیا گیا تھا۔ حکومت کو برطانوی انتظامیہ کے 'فولادی ڈھانچے' کی حمایت حاصل تھی۔ افادیت پسند فلسفے نے ڈلہوزی کے خیالات کو بھی متاثر کیا۔ افادیت پسندوں کے زیر اثر اصلاح کے مجموعی جذبے کو زوال ہوا اور اب برطانوی انتظامیہ پر عملیت پسندی اور عقلیت پسندی کے نقطہ نظر کا غلبہ تھا۔ بیک وقت ڈلہوزی کچھ پہلوؤں میں آزاد خیال موقف اختیار کرنے کے لیے تیار تھا۔ مثال کے طور پر، اس نے اپنی قانون ساز کونسل میں عوامی رائے کی نمائندگی کے فروغ کی ہمت افزائی کی۔ اس نے اسے (قانون ساز کونسل کو) انگریزی پارلیمنٹ سے لیے گئے طریقہ کار کے وسیع قواعد سے بھی آراستہ کیا۔ یہاں تک کہ اس نے قانون ساز کونسل میں ہندوستانی ارکان کو داخل کرنے کی حمایت کی۔ اس نے انگریزی تعلیم کے پھیلاؤ کے بارے میں میکالے کے نظریہ سے اتفاق کیا اور بڑے پیمانے پر مقامی تعلیم کے نظام کی حوصلہ افزائی کی۔

1800 کے آس پاس برطانیہ میں صنعتی انقلاب نے اس ضرورت کو جنم دیا کہ ہندوستانی بازاروں کو تیار شدہ مصنوعات کی کھپت کے لیے فروغ دیا جائے اور ہندوستان سے کچے مال کی محفوظ فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ اس کے لیے زیادہ موثر انتظامیہ کے ساتھ ساتھ نوآبادیات (Colonies) کو مادر وطن (Mother Land) کی معیشت کے ساتھ جوڑنے کی ضرورت تھی۔ برطانیہ میں کئی نئے فکری دھارے بھی وجود میں آئے جنہوں نے اصلاحی تصورات کی تبلیغ کی اور اس طرح برطانیہ اور ہندوستان میں اصلاح کے مسئلے کو آگے بڑھایا۔ جب کہ برطانیہ میں آزاد تجارتی تحریک کے دباؤ نے ہندوستانی تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری کے خاتمے کی سمت میں کام کیا۔ یہ افادیت پسندی اور اناجیلی روایت پرستی تھی، جس نے ہندوستان میں کمپنی کے نظم و نسق کی نوعیت میں بنیادی تبدیلیوں کا آغاز کیا۔ ان دونوں مکاتب فکر نے زور دے کر کہا کہ ہندوستان کی فتح گناہ یا جرم تھا۔ لیکن اس گناہ یا مجرمانہ حکمرانی کے خاتمے کی وکالت کرنے کے بجائے، انہوں نے اس کی اصلاح کا دعویٰ کیا، تاکہ ہندوستانی 'اپنے زمانے کے بہترین نظریات' کو مد نظر رکھتے ہوئے اچھی حکومت کا فائدہ حاصل کر سکیں۔ ان دو فکری روایات کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ دعویٰ کیا گیا کہ 'انگلینڈ کو مستقل طور پر ہندوستان میں رہنا چاہیے۔'

افادیت پسندی کے علمبردار جیرمی بینتھم نے کہا کہ انسانی تہذیب کا نمونہ عمل، سب سے بڑی تعداد کی سب سے بڑی خوشی حاصل

کرنا ہے۔اس کے مطابق اچھے قوانین، موثر اور روشن خیال انتظامیہ تبدیلی کے سب سے موثر عوامل تھے۔افادیت پسند جیمس مل کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لندن والے دفتر میں آنے کے ساتھ ہی، ہندوستانی پالیسیاں اسی کے تصور کے مطابق چلنے لگیں۔ 1817 میں شائع ہونے والی 'دی ہسٹری آف برٹش انڈیا'(*The History of British India*) میں اس نے سب سے پہلے ہندوستان کی معاشی اور ثقافتی دولت کے مفروضہ تصور کو فاش کیا، جو ولیم جونس جیسے افراد کے 'جانبدارانہ طرز فکر' کے ذریعے قائم ہوا۔اس نے بینتھم کے انداز میں دعویٰ کیا کہ ہندوستان کو اس کی بہتری کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے ایک دانشمند حکومت، جو اچھی قانون سازی کرے۔ بڑی حد تک اس کی کوششوں کی وجہ سے لارڈ میکالے کے تحت 1833 میں ایک لا کمیشن(Law Commission) مقرر کیا گیا جس نے بینتھم کے نمونے پر 1835 میں تعزیرات ہند(Indian Penal Code) تیار کی۔

افادیت پسند واضح معنوں میں بالخصوص انگریزی تعلیم اور ثقافت کی توسیع کے سوال کے حوالے سے آزاد خیالوں سے مختلف تھے۔ جب آزاد خیال لارڈ میکالے نے 1835 کے اپنے مشہور تعلیم پر مقالے (Education Minute) میں انگریزی تعلیم کو متعارف کروانے کے لیے ایک مضبوط مقدمہ پیش کیا، تب بھی مل جیسے افادیت پسندوں نے مقامی زبان کی تعلیم کو ہندوستانی ضروریات کے لیے زیادہ موزوں قرار دیا۔ باالفاظ دیگر، ہندوستان کے بارے میں سامراجی رویوں میں کھینچ تان انیسویں صدی کے پہلے نصف میں برقرار رہی۔اس کشمکش کی ایک علامت خود مل کا ایک پرجوش پیروکار لارڈ بینٹنک نظر آتا ہے، جس نے قانون سازی کے ذریعے ستی اور طفل کشی پر روک لگائی۔ لیکن ساتھ ہی اس نے ہندوستانی روایات پر اپنا عقیدہ برقرار رکھا اور ہندوستانیوں کو ان کا حقیقی مذہب واپس لوٹانے کی خواہش کو پروان چڑھایا۔ اسی لیے ستی کی رسم پر سرکاری بحث، اس مذہبی دلیل پر مبنی تھی کہ اس کے خاتمے کی توثیق قدیم ہندو متنوں میں بھی کی گئی ہے۔ 1835 میں تیار کیا گیا انڈین پینل کوڈ، 1860 تک باقاعدہ قانون نہیں بن سکا۔ ڈلہوزی کے اس عزم کے باوجود کہ ہندوستان میں برطانیہ کے مشن کو مل کے نقطہ نظر کے مطابق زور شور سے آگے بڑھایا جائے گا، انیسویں صدی کے درمیان تک یہ اختلافات یقینی طور پر برقرار رہے، نہ ہی حکمرانوں کی نسلی برتری کے بیانات پہلی بار انیسویں صدی کے درمیان میں دیے گئے تھے۔ اگر ہم سلطنت کے اصل کام کاج پر نظر ڈالیں، تو اس طرح کے بیانات اٹھارویں صدی کے آخر سے زیادہ زور و شور سے دیے جاتے رہے تھے، جب کارنوالس نے رعایا سے جسمانی علیحدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کمپنی کی افسران کو ایک 'علاحدہ طبقہ اعلیٰ' میں تبدیل کر دیا تھا۔ کمپنی کے سرکاری ملازمین کو ہندوستانی عورتیں رکھنے سے منع کیا گیا اور ان پر زور دیا گیا کہ وہ برطانوی بیویاں رکھیں اور اس طرح انگریزی خصوصیت کی حفاظت کریں۔ بورڈ آف کنٹرول کے پہلے صدر ہینری ڈُنڈاس کے مطابق اس خصوصیت کو مجروح کرنے والا کوئی بھی اقدام یقیناً 'ہماری ہندوستانی سلطنت کو تباہ کر دے گا'۔ اٹھارویں صدی کے دارالحکومت کلکتہ کے انسانی ماحول میں سامراجی نظریے کے طور پر حکمران اور رعیت کے درمیان جسمانی علیحدگی کے اس طرح کے بیانات بالکل عملی طور پر نظر آتے تھے۔ اٹھارویں صدی کے اوائل میں، نسلی خطوط کے لحاظ سے یہ مقامی علیحدگی اتنی واضح طور پر نشان زد نہیں تھی، جیسا کہ عام طور پر 'وہائٹ ٹاؤن' اور 'بلیک ٹاؤن' بنے ہوئے تھے جن کے درمیان ایک ملا جلا علاقہ تھا جہاں یوریشیائی (مخلوط جوڑوں کے بچے) رہتے تھے، تاہم یہاں مقامی افراد کو بھی آنے کی اجازت تھی۔

مخلوط شادیوں کے ذریعے ہونے والے بچوں کی تعداد 1791 کے بعد سے مسلسل کم ہوتی چلی گئی، جب انہیں معاہداتی شہری اور اونچے درجے کی فوجی یا بحری خدمات سے روک دیا گیا۔ نوآبادیاتی سماج کی نسلی خطوط پر تقسیم اب مکمل ہو چکی تھی۔ انیسویں صدی کے اوائل تک، عوام اور حکمران نسل کے درمیان 'سماجی دوری' کلکتہ کی شہری زندگی میں ایک واضح طور پر نظر آنے والی حقیقت بن گئی تھی۔ تاہم، انیسویں صدی کے پہلے نصف میں نسلی تکبر کے ساتھ ساتھ، ایک آزاد خیالی بھی تھی، جیسا کہ لارڈ میکالے کے اس مقصد میں نظر آتا ہے جس میں وہ ایک سادہ لوح ہندوستانی کو ایک بھورے صاحب میں بدلنا چاہتا تھا جس کا خون اور رنگ تو ہندوستانی ہو لیکن اس کی سوچ اور ذائقہ یورپی ہو۔ یہی وہ امید تھی جو 1857 کی بغاوت کے تند جھٹکے سے ٹوٹ گئی۔

4.4.5 رومانیت (Romanticism)

رومانیت ایک فکری تحریک تھی جو اٹھارہویں صدی کے آخر میں یورپ میں شروع ہوئی۔ اس میں جذبات اور انفرادیت اور فطری کاریگری پر زور دیا گیا۔ اس میں سائنس اور صنعت کاری پر شک اور عظمت رفتہ پر رشک شامل تھا جس میں عہد قدیم کے بجائے عہد وسطیٰ کو ترجیح دی گئی تھی۔ یہ جزوی طور پر صنعتی انقلاب، روشن خیالی کے دور کے سماجی اور سیاسی اصولوں، اور فطرت کے سائنسی استدلال بشمول جدیدیت کے تمام اجزا کے خلاف ایک نظریاتی رد عمل تھا۔ یہ بصری فنون، موسیقی اور ادب میں سب سے زیادہ واضح تھا، تاہم اس نے تاریخ نویسی، سماجی علوم اور قدرتی علوم پر گہرا اثر ڈالا۔ اس کا سیاست پر ایک اہم اور پیچیدہ اثر پڑا، جیسا کہ رومانوی مفکرین نے قدامت پسندی، بنیاد پرستی، آزاد خیالی اور قوم پرستی کو متاثر کیا۔ رومانیت نے ہندوستان میں برطانوی منتظمین کو بھی متاثر کیا۔

ہندوستان میں رومانیت پسندوں میں تھامس منرو (Thomas Munro)، جان میلکم (John Malcolm)، ماؤنٹ اسٹوارٹ ایلفنسٹن (Mount Stuart Elphinstone) اور چارلس میٹکاف (Charles Metcalfe) جیسے منتظمین شامل تھے۔ وہ غیر ذاتی قوانین اور محدود حکومت کے کارنوالس نظام کے مخالف تھے۔ انہوں نے ذاتی طرز حکمرانی پر زور دیا اور ہندوستان کے ماضی کے دیرپا سماجی اداروں کے تحفظ پر بھروسہ کیا۔ انہیں کارنوالس کے نظام اور ہندوستانی تاریخ یا تجربے میں کوئی تعلق نظر نہیں آیا۔ انہوں نے اس خیال کی مخالفت کی کہ ایک سیاسی معاشرہ ایک اجنبی انگریزی روایت سے اخذ کردہ اصولوں پر تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کارنوالس کی طرف سے انگریزی حکمرانی کی درآمد کی مخالفت کی جس میں عدلیہ اور حکومت کے انتظامی اختیارات کی واضح تقسیم تھی۔ رومانیت پسندوں نے ہندوستانی کسانوں کے لیے ایک سادہ، سربراہی والی حکومت کی حمایت کی۔ ان کی خواہش تھی کہ کارنوالس کے جج کی جگہ کلکٹر کو، ہندوستانی انتظامیہ کی اہم شخصیت بنایا جائے، جو کسانوں کے لیے رحمدل باپ اور ماں کے طور پر کام کرے۔ اس طرح کے تصور کا مطلب ریاست اور کسانوں کے درمیان زمینی بچولیوں کو مسترد کرنا تھا۔ قدیم اداروں کو محفوظ رکھنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے، منرو نے لکھا: 'اب وقت آ گیا ہے کہ ہمیں یہ سیکھنا چاہیے کہ نہ تو ملک کی ظاہری صورت، نہ اس کی جائیداد اور نہ ہی اس کا سماج، ایسی چیزیں ہیں جو ہماری کسی بھی سازش سے اچانک بہتر ہو سکتی ہیں۔ ہاں، اس سے وہ بہت زیادہ زخمی ہو سکتے ہیں جو ہم ان کی بھلائی کے لیے چاہتے ہیں۔ ہمیں ہر ملک کو اسی طرح قبول کرنا چاہیے جیسے ہم اسے پاتے ہیں۔'

تاہم، یہ زمینی بندوبست سے ٹکرا رہا تھا جس کی خود منرو نے وکالت کی تھی۔ رعیت واری بندوبست کے لیے مزید تفصیلی سروے، مزید ریاستی عہدیدار اور زیادہ مداخلت پسند حکومت کی ضرورت تھی۔ مزید برآں، رومانیت پسند بھی دوسرے برطانوی منتظمین کی طرح قانون کی حکمرانی، جائیداد اور 'بہتری' کے تصورات کے حامی تھے۔ مثال کے طور پر چارلس میٹکاف نے دہلی کے ارد گرد مثالی دیہی برادری کی مخصوص خصوصیات کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی، جو اس کے رومانوی تخیل سے جڑی ہیں۔ 1830 میں، زمینداروں یا کسانوں کے بجائے دیہی برادریوں سے محصول وصول کرنے کے حق کا دفاع کرتے ہوئے، اس نے لکھا: 'گاؤں کی برادریاں چھوٹی جمہوریہ ہیں، ان میں تقریباً وہ سب کچھ ہوتا ہے جو وہ اپنے اندر چاہ سکتے ہیں، یا وہ کسی بھی بیرونی تعلقات سے تقریباً آزاد ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک ایسی جگہ رہتے ہیں جہاں اور کوئی نہیں رہتا۔ یکے بعد دیگرے شاہی خاندان آتے ہیں، انقلاب کے بعد پھر انقلاب آتا ہے، ہندو، پٹھان، مغل، مراٹھا، سکھ، انگریز، سب باری باری سے مالک بنتے ہیں، لیکن گاؤں کی برادری وہی رہتی ہے۔'

بعد ازاں ہنری مین (Henry Main) نے اپنے ترقیاتی منصوبے میں ہندوستانی 'خود کفیل' گاؤں کی اس تصویر کو استعمال کیا، جو وقت سے آزاد ایک علاقے میں ایک قسم کے زندہ باقیات کے طور پر موجود ہے۔ 'تبدیل نہ ہونے والے' ہندوستانی دیہاتوں کی، اپنے مادری قبیلوں اور 'مشترکہ زمینوں' کے ساتھ ارتقائی عمل کے ایک ابتدائی مرحلے کے طور پر شناخت کی گئی۔ اس سے 'پسماندہ' اور 'جمود کا شکار' ہندوستانی سماج کے پرانے تصور کو تقویت ملی۔

4.5 مقامی ردعمل (Local Response)

اٹھارہویں صدی کے درمیان انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک سیاسی طاقت کے طور پر ہندوستان میں ابھرنے نے ہندوستان کے [مفروضہ] جاگیرداری سے سماجی ترقی کے اگلے اعلیٰ مرحلے میں تبدیلی کے عمل کو تیز کر دیا۔ مارکس نے اس کی وضاحت 'ایشیائی سماج کے خاتمے اور ایشیا میں مغربی سماج کی مادی بنیاد ڈالنے' کے طور پر کی ہے اور سرمایہ داری کے عروج اور پھیلاؤ کے ذریعے اس کی جگہ جدید بورژوا سماج (bourgeois society) کی تشکیل کی بات کہی ہے۔ ہندوستانی سماج نے ہمعصر یورپی سیاسی اثرات کے تحت برطانوی حکمرانی کے دوران ایک معیاری ساخت کی تبدیلی کا تجربہ کیا۔ معاشی اور فلسفیانہ نظریات نے نوآبادیاتی نیٹ ورک کے ذریعے اسے ترقی کی ایک نئی اور مختلف راہ پر گامزن کیا۔

اپنے ابتدائی دور میں عملی طور پر استشراقیت کو وارن ہیسٹنگز کے ماتحت کمپنی کی حکومت کی پالیسیوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس روایت کا بنیادی اصول یہ تھا کہ مفتوح لوگوں پر ان کے اپنے قوانین کے تحت حکومت کی جانی چاہیے۔ برطانوی حکمرانی کو 'ایک ہندوستانی محاورے میں اپنے آپ کو جائز قرار دینا تھا'، اس لیے اسے ہندوستانی سماج کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کی ضرورت تھی جو ایک ایسا عمل ہے جسے بعض اوقات، کسی ثقافت کے اثرات قبول کرنے کا الٹا عمل (Reverse Acculturation) بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے یورپی حکمرانوں کو ملک کے رسم و رواج اور قوانین کے بارے میں آگاہ کیا تاکہ انہیں زیادہ موثر انتظامیہ کے لیے محکوم سماج میں شامل کیا جا سکے۔ اس

سیاسی نقطہ نظر کے ساتھ ہی سرکاری ملازمین کو ہندوستانی زبانوں اور روایت میں تربیت دینے کے لیے 1800 میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا تھا۔ مستشرقین کا ایک اور سیاسی پہلو بھی تھا۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان رشتہ داری کا تعلق قائم کرکے، ان کو 'محبت' کے بیانات کے ذریعے اخلاقی طور پر نوآبادیاتی حکمرانی کا پابند بنانے کی کوشش کی گئی۔

مستشرقین کی بحث ابتدا میں قدیم ہندوستانی روایات کے احترام کے ارد گرد رہی جس نے محکوم سماج کے بارے میں آگاہی پیدا کی، جس نے بالآخر استشراقیت کو حکمرانی کی پالیسی کے طور پر نکارنے کی بنیاد فراہم کی۔ ان دانشوروں نے نہ صرف آریاؤں کے ذریعہ عطا کردہ ہندوستان کی کلاسیکی شان کو اجاگر کیا بلکہ ایک زمانے کی شاندار آریائی تہذیب کے بعد میں زوال کا بھی ذکر کیا۔ اس نے آمرانہ حکمرانی کو جائز قرار دیا کیونکہ ہندوستان کو اس کی اپنی مشکلات سے نجات دلانے اور یورپ کی طرح ترقی دینے کے لیے مطلوبہ حالت کی جانب بلند کرنے کی ضرورت تھی۔

ہیسٹنگز کی پالیسی کو لارڈ کارنوالس نے ترک کر دیا جو انتظامیہ کے زیادہ انگریز بنانے اور برطانوی حکومت کے 'وِگ' (اصلاح پسند) اصولوں کو نافذ کرنے کے لیے پر عزم تھا۔ لارڈ ویلزلی نے ان اقدامات کی حمایت کی، جس کا مقصد ہندوستانی سیاسی روایت کی آمرانہ روش کو ترک کرکے، عدلیہ اور عاملہ کے درمیان اختیارات کی علیحدگی کو یقینی بناتے ہوئے حکومتی مداخلت کو محدود کرنا تھا۔ ریاست کا کردار صرف انفرادی حقوق اور نجی املاک کا تحفظ ہو گیا تھا۔ یہ پالیسی 'مشرقی استبداد' (Oriental Despotism) کے تئیں مسلسل نفرت سے ابھری، جس سے ہندوستانیوں کو آزاد کرانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ استبداد یا آمریت ایک ایسی چیز تھی جس نے مشرقی ریاستوں کو اپنی یورپی ہم منصبوں سے ممتاز کیا تھا۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ وہی منطق تھی جس نے 'راج کی سرپرستی' کے لیے ایک 'ضمنی توجیہ' فراہم کی تھی۔ فتح کے ابتدائی مراحل سے ہی کمپنی نے مغل ریاست کی مقامی باقیات، راجاؤں اور زمینداروں کے مقامی اثر و رسوخ کو روکنے کی کوشش کی، تاکہ تجارت کے آزادانہ بہاؤ اور محصولات کی مستحکم وصولی کو یقینی بنایا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ اسی مقصد کے لیے، اس نے علاقے کا سروے اور نگرانی کرنے میں انتہائی احتیاط سے کام لیا اور طاقت کی علامتوں، جیسے پرچم، وردی، تمغے اور مہروں کے خصوصی کنٹرول پر زور دیا۔ اس سے ایک مضبوط ریاست کے ظہور کا اشارہ ملتا ہے جس کی بنیاد یہ تھی کہ مقامی لوگوں نے کبھی آزادی نہیں دیکھی اور انہیں اپنے بدعنوان اور بدسلوکی کرنے والے جاگیرداروں سے نجات دلانے کی ضرورت تھی۔ ولیم جونس جیسے افراد نے اس وقت کے بہت سے برطانوی افسروں کی طرف سے اس طرح کے پدرنمارویہ کی نشاندہی کی۔ انگلینڈ میں قدامت پرست، ہندوستان کے شاندار ماضی اور اس کے سادہ لوگوں کی جانب راغب ہونے کے باوجود ہندوستان میں آمرانہ حکمرانی کے حامی رہے۔

لیکن یہ اصلاحاتی پروگرام 'ہندوستانی زندگی کی بنیادوں کے خلاف نظریاتی حملہ' سے کچھ کم نہیں تھا۔ یہ فرض کیا گیا کہ برطانوی حکمرانی کی مہربان اور دانشمندانہ رہنمائی کے تحت، بت پرستی، جھوٹے مذاہب، توہم پرستی اور بے معنی روایات سے آزاد ہو کر، ہندوستانی فطری طور پر تہذیب کی اسی سطح کی خواہش کریں گے اور اسے حاصل کریں گے جو روشن خیال برطانیہ نے حاصل کی تھی۔ یہ تہذیبی مشن ایک سامراجی کوشش تھی جس کا مقصد برطانوی حکمرانوں کو فاتح کے طور پر نہیں بلکہ آزاد کرنے والوں کے طور پر تصور کیا جائے گا۔

1857 کی بغاوت ہندوستان اور برطانیہ دونوں میں برطانوی سماج کی تمام سطحوں کے لیے ایک گہرا صدمہ ثابت ہوئی۔ باغیوں نے حکمرانوں کے طور پر نہ صرف انگریزوں کو مسترد کر دیا تھا بلکہ سامراجی لحاظ سے، پورے وکٹوریائی عالمی نظریہ پر براہ راست حملہ کیا تھا۔ بغاوت وکٹوریائی دور کی من گھڑنت اور انگریزوں کے لیے انتہائی قابل قدر اقدار کی تذلیل تھی۔ نظریاتی سطح پر، بغاوت نے ان اصولوں کو چنوتی دی جس نے انیسویں صدی کے پورے سامراجی منصوبے کو شکل دی۔

4.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ہر حکومت کو جواز کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اپنی توسیع کے دور میں، برطانیہ نے اپنے آپ کو ایک 'تہذیبی مہم' پر تعینات سمجھا۔ ایک طرف، اس نے لالچ، جارحیت اور لوٹ کھسوٹ کی ایک گھناؤنی تاریخ کو سنہرے الفاظ سے لکھنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف، اس نے ان سرگرمی میں مقصد کا مضبوط احساس پیدا کیا۔ یہ مقصد تمام افراد کے لیے یکساں نہیں تھا۔ ولیم جونس جیسے مستشرقین، چارلس گرانٹ جیسے اناجیلی روایت پرست، جیمس مل جیسے افادیت پسند، اور پھر منرو یا ڈلہوزی کے ذہن میں بالکل مختلف مقاصد تھے۔ اس کے علاوہ ان کے خیالات جیسے مستشرقین کی ہندوستان کی تعمیر یا اناجیلی روایت پرستوں کی 'دیسی' روح کو بچانے کی کوشش، یا افادیت پسندوں کی 'سب سے بہترین اشیا' میں بھی اخلاقی و مادی لحاظ سے کافی فرق تھا۔ خیالات کے اس تنوع کے باوجود ہندوستان میں برطانوی 'مہم' کے ایک زیادہ جانبدارانہ تصور نے عمل میں یکجائی فراہم کی۔ صاف طور پر ان خیالات اور افراد نے ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے استحکام کا کام کیا۔

4.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

بورژوا سماج	:	سماج کا درمیانی طبقہ جس میں وکیل، تاجر، حکیم اور غیر زرعی سرگرمی کرنے والے افراد آتے تھے۔
وہائٹ ٹاؤن	:	برطانوی ہندوستان میں شہروں میں یورپیوں کی رہائش گاہ یا کالونی
بلیک ٹاؤن	:	برطانوی ہندوستان میں شہروں میں مقامی لوگوں کی رہائش گاہ یا کالونی
روشن خیالی کا دور	:	(The Age of Enlightenment) 17ویں اور 18ویں صدی کا وہ دور جہاں حکومت، شخصی آزادی اور مذہبی عقائد کے بارے میں نئے خیالات منظر عام پر آئے۔
تجارتی تحفظ پسندی	:	(Mercantilism) ایک ایسا مکتبہ فکر ہے جس نے ریاست کی دولت اور طاقت کو بڑھانے کے لیے ملک کی معیشت میں حکومتی مداخلت کی وکالت کی

4.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

4.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. بورژوا سماج کسے کہتے ہیں؟

2. وہائٹ ٹاؤن کسے کہتے ہیں؟
3. بلیک ٹاؤن کسے کہتے ہیں؟
4. روشن خیالی کا دور کسے کہتے ہیں؟
5. تجارتی تحفظ پسندی کسے کہتے ہیں؟
6. Orientalism کی تعریف کیجیے۔
7. Utilitarianism کی تعریف کیجیے۔
8. Humanism کی تعریف کیجیے۔
9. Laissez-faire کی تعریف کیجیے۔
10. فرانسیسی انقلاب کب واقع ہوا؟

4.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی سیاست پر نوٹ لکھیے۔
2. ہندوستان کے بارے میں یورپی ابتدائی نظریے پر نوٹ لکھیے۔
3. آزاد خیالی پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. اناجیلی روایت پرستی پر نوٹ لکھیے۔
5. رومانیت کے بارے میں ایک نوٹ لکھیے۔

4.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. استشراقیت کے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے ہندوستان میں اس کے پھیلنے پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. افادیت پسندی کے عروج اور ارتقا پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
3. مذکورہ سیاسی اور سماجی نظریات کے خلاف سماجی ردعمل پر ایک تفصیلی مضمون قلم بند کیجیے۔

4.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Aziz, K. K., *The British in India*: *A Study in Imperialism*, Indian Institute of Applied Political Research, New Delhi, 1988.
2. Cohn, Bernard S., *Colonialism and its Forms of Knowledge*: *The British in India*, Princeton University Press, Princeton, 1996.
3. David Kopf, *British Orientalism and the Bengal Renaissance*: *The Dynamics of Indian Modernization 1773-1835*, Firma K. L. Mukhopadhyay, Calcutta, 1969.

4. Edward W. Said, "Orientalism Reconsidered" in *Race and Class*, Vol. 27, No. 2, 1985.
5. Edward W. Said, *Orientalism*: *The Western Conceptions of the Orient*, Penguin Books, New Delhi, 1978.
6. Eric Stokes, *The English Utilitarians and India*, Clarendon Press, Oxford, 1959.
7. Jonathan Parry, *The Politics of Patriotism*: *English Liberalism, National Identity and Europe*, Cambridge University Press, Cambridge, 2006.
8. Judith N. Shklar, *Political Thought and Political Thinkers*, University of Chicago Press, Chicago, 1998.
9. Lynn Zastoupil, *John Stuart Mill and India*, California Press, Stanford, 1994.
10. Metcalf, T. R., *Ideologies of the Raj*: *The New Cambridge History of India*, vol.3.4, Cambridge University Press, Cambridge, 1994.
11. Mukherjee, S. N., *Sir William Jones*: *A Study in Eighteenth-Century British Attitude to India*, Cambridge University Press, Cambridge, 1968.
12. Sekher Bandyopadhyay, *From Plessey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
13. Stokes E., *The English Utilitarians and India*, Oxford University Press, London, 1959.
14. Travers, Robert, *Ideology and Empire in Eighteenth century India*: *The British in Bengal*, Cambridge University Press, Cambridge, 2007.
15. Ventury, 'Oriental Despotism', *Journal of the History of Ideas*, Vol. XXIV, 1963.

اکائی 5۔ جنگ اور حکمت عملی

(War and Diplomacy)

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 برطانوی حکومت کی توسیع: رنگ فینس کی حکمت عملی

5.2.1 رابرٹ کلائیو: آرکاٹ پر قبضہ اور بنگال میں استحکام

5.2.2 وارن ہیسٹنگز: میسور اور مراٹھا کے ساتھ جنگ

5.2.3 لارڈ کارنوالس: میسور کے ساتھ جنگ

5.2.4 سر جان شور: غیر جانبدارانہ پالیسی

5.2.5 لارڈ ویلزلی: ذیلی معاہدوں کا نظام

5.2.6 لارڈ کارنوالس: عدم مداخلت کی پالیسی

5.3 ماتحت معاہدے کی پالیسی

5.3.1 لارڈ ہیسٹینگز

5.4 جبری الحاق، ضبطی اور قبضے کی پالیسی

5.4.1 ولیم بنٹنک

5.4.2 لارڈ آکلینڈ: پیش قدمی [فارورڈ] پالیسی

5.4.3 لارڈ ایلن برو

5.4.4 لارڈ ہورڈنگ: اینگلو سکھ تنازعہ

5.4.5 لارڈ ڈلہوزی: نظریہ جبری تسلط اور الحاق

5.4.6 لارڈ لٹن: اینگلو افغان جنگ

5.4.7 لارڈ ڈفرن: تیسری اینگلو برمیز جنگ
5.5 ماتحت یونین سے متعلق پالیسی
5.6 اکتسابی نتائج
5.7 کلیدی الفاظ
5.8 نمونہ امتحانی سوالات
5.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
5.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
5.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
5.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

5.0 تمہید (Introduction)

پلاسی اور بکسر کی لڑائیاں فیصلہ کن ثابت ہوئیں اور ہندوستان میں انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو مضبوط بنیادیں فراہم کیں ۔ مسابقت کرنے والی دوسری یوروپی حریف کمپنیوں پر برطانوی فتح نے اسے ہندوستان میں اپنی سیاسی طاقت بڑھانے کا موقع فراہم کیا۔یہ برطانوی اور مقامی حکومتوں کے درمیان سیدھی لڑائی تھی۔یہ لڑائی اٹھارویں صدی کے وسط میں اس وقت شروع ہوئی تھی جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل رابرٹ کلائیو کے تحت بنگال میں سیاسی استحکام حاصل ہوا،اور پھر یہ لڑائی 1857 کی جنگ تک پھیل گئی۔اس دوران انگریز گورنروں نے اپنے دائرہ اثر کو بڑھانے اور وسیع علاقوں پر اپنا سیاسی تسلط قائم کرنے کے لیے اپنا اثر ورسوخ اور مختلف طرز کی جنگی اور سفارتی حکمت اپنائی۔

5.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- انگریزوں کی جانب سے اختیار کی گئی مختلف توسیع پسندانہ پالیسیوں کو جان سکیں گے۔
- ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے استحکام کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- برطانوی اقتدار کو مستحکم کرنے میں گورنر جنرلوں کے کردار پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- برطانوی اور مقامی حکومتوں کے درمیان تعلقات کا جائزہ لے سکیں گے۔

5.2 برطانوی اقتدار کی توسیع: رنگ فنس پالیسی

(Expansion of British Power: Policy of Ring Fence)

مختلف مراحل میں نئے نئے علاقوں کے الحاق کے ذریعہ برطانوی اقتدار کی توسیع کی گئی۔ ہر مرحلے پر اس توسیع کے ذمہ دار عوامل اور کارگر طاقتیں مختلف ہوتی ہیں۔ آیئے ہم مرحلہ وار طریقے سے ان آپریشنز سے متعلق مطالعہ کرتے ہیں جو مختلف مراحل پر الگ الگ اصولوں اور مقاصد کے تحت ہوتی ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ابتداء میں رنگ فنس پالیسی(Policy of Ring Fence,1765-1813) کو اپنایا تھا۔ جس کا مطلب تھا برطانوی حکومت کی سرحدوں پر دفاع کو مضبوط کرنے کے لیے نیم سرکاری حکومتیں قائم کرنا، یعنی اپنی ریاستوں کی حفاظت کے لیے پڑوسی ریاستوں کو سرحدی دفاع(buffer) بنانا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں کمپنی کو سب سے بڑا خطرہ افغان حملہ آوروں اور مراٹھوں سے تھا۔ ان خطرات سے بچاؤ کے لیے کمپنی نے اس شرط پر اودھ ریاست کی سرحدوں کا دفاع کرنے کا فیصلہ کیا کہ اودھ کے نواب دفاعی اخراجات ادا کریں گے۔ اس وقت اودھ کا دفاع، بنگال کا دفاع تھا۔ یہ پالیسی 1765 میں رابرٹ کلائیو نے شروع کی تھی، وارن ہیسٹنگ نے اس پالیسی کو مزید تقویت دی جس کو بعد میں ویلزلی کے ماتحت اتحاد نظام (Subsidiary Alliance) کے ذریعہ ذیلی فریقوں سے اتحاد کے تحت لاگو کیا گیا۔ اس کا مطلب تھا کوئی بھی شاہی ریاست اپنے حدود کے اندر، ایک ماتحتی کے معاہدے میں داخل ہوگا۔ اپنے خرچ پر ایک اجنبی فوج رکھے گا۔ برطانوی ریزیڈنٹ ریاست کے دربار میں رہے گا۔ حکمراں کسی یوروپی شہری کو ملازمت میں نہیں رکھے گا اور گورنر جنرل سے مشورہ کیے بغیر کسی دوسری ہندوستانی ریاست کے ساتھ بات چیت نہیں کرے گا۔ اس باہمی مفاہمت کے بدلے کمپنی، علاقائی سالمیت اور ہندوستانی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کی ضمانت دیتی ہے۔ لیکن اس طرح کے وعدے کمپنی نے شاید ہی کبھی پورے کیے۔

5.2.1 رابرٹ کلائیو؛ آرکاٹ پر قبضہ اور بنگال میں قدم جمانے کی کوشش

(Robert Clive: Capture of Arcot, and Foothold in Bengal)

ہندوستان میں برطانوی حکومت کے لیے رابرٹ کلائیو کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ 1751 میں آرکاٹ پر قبضہ اور کامیابی سے اس کا دفاع کرنے کا اعزاز اس کو جاتا ہے۔ پلاسی کی فتح سے اس نے بنگال میں برطانوی حکومت کی بنیاد ڈالی اور ہندوستان کے اندرونی علاقوں میں کمپنی کی مزید توسیع کے لیے بنیاد فراہم کی۔ کلائیو نے 1765 میں الہ باد کا معاہدہ کیا۔ اس معاہدے کے تحت اودھ کے نواب کی سلطنت کو محدود کرتے ہوئے کورا، الہ باد، چنار اور بنارس کی زمینداری سے مستثنی کر دیا۔ اس معاہدے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اودھ کی ریاست ایک ذیلی نیم سرکاری ریاست میں تبدیل ہوگئی۔ اسی طرح وہ مغل بادشاہ شاہ عالم کو، کورا اور الہ باد اضلاع دے کر ایک معاہدہ کیا جو اس نے اودھ کے نواب سے حاصل کیے تھے، ان سب کے بدلے میں مغل بادشاہ نے کمپنی کو بہار بنگال اور اڈیسہ کی دیوانی عطا کی۔ بنگال، سال 1767-72 تک ورلسٹ

اور کارٹیئر کے زیر انتظام رہا اس تمام دورانیہ میں سب زیادہ قابل ذکر قصہ، ریاست میسور کے ساتھ اچانک تعلقات بگڑ جانا تھا۔

پہلی اینگلو، میسور جنگ (1767-1769): جنوبی ہند میں فرانسیسی اقتدار کے خاتمہ کے بعد انگریزوں نے میسور کے سلطان حیدر علی کی توسیع پسندانہ سرگرمیوں کو روکنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے مطابق حکومت مدراس نے نظام آف حیدر آباد کو حیدر علی کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی ترغیب دی اور اس مقصد کے تحت ضروری فوجی امداد فراہم کرنے کی پیشکش کی۔ نظام کو پہلے ہی مراٹھوں کی حمایت حاصل تھی، اس طرح حیدر علی کے خلاف سہ کونی اتحاد بنایا گیا۔ مدراس حکومت، کرناٹک اور بالا گھاٹ کو حاصل کرنے کے لیے پہلے سے ہی بے چین تھی جو اس وقت حیدر علی کے قبضہ میں تھے اور انہوں نے اس کے لیے نظام کو ستر لاکھ روپئے ادیوانی دا کرنے پر اتفاق کیا تھا۔ نظام اور مرہٹوں کے ساتھ برطانوی اتحاد نے حیدر علی کو ردعمل پر اکسایا۔ کرنل اسمتھ کی قیادت میں برطانوی افواج کے ساتھ، نظام اگست 1767 میں میسور میں داخل ہوا۔ لیکن حیدر علی اس موقع پر سرخرو ہوئے۔ وہ مرہٹوں سے 23 لاکھ روپے کی رقم کا وعدہ کر کے جیتنے میں کامیاب رہے۔ وہ نظام پر بھی فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز اکیلے رہ گئے۔ انگریزوں نے خوب مقابلہ کیا لیکن حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو کی پوزیشن مضبوط تھی۔ ٹیپو خود مدراس کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور اس کے مضافات کو لوٹ لیا۔ مدراس کے حکام گھبرا گئے اور امن کے لیے مقدمہ دائر کر دیا۔ حیدر علی نے عملی طور پر امن کی شرائط طے کیں جو کہ 4 اپریل 1769 کو ختم ہوئیں۔

5.2.2 وارن ہیسٹنگز: مراٹھوں اور میسور کے ساتھ تنازعہ

(Warren Hastings: Conflict with the Marathas and Mysore)

جب وارن ہیسٹنگز نے بنگال کے گورنر کے طور پر عہدہ سنبھالا تو مراٹھا ان کے اقتدار کے لیے خطرے کا باعث تھے۔ مغل شہنشاہ شاہ عالم انگریزوں کی دفاعی مدد چھوڑ کر مرہٹوں کے پاس چلا گیا تھا۔ دکن میں حیدر علی ایک اور خطرہ تھا۔ وارن ہیسٹنگز نے اودھ کے ساتھ ذیلی اسٹیٹ پالیسی کو جاری رکھا۔ اس نے مرہٹوں کے خطرے کی وجہ سے نواب کے ساتھ اچھے تعلقات جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ 1772 میں اس نے بنارس سے معاہدہ کیا جس کے تحت کورا اور الہ آباد کو اودھ کے نواب کو 50 لاکھ روپے میں فروخت کر دیا گیا۔ اگر نواب سبسڈی امداد ادا کرتا رہا تو انگلش کمپنی اسے جب بھی ضرورت پڑی برطانوی فوجیوں کے ذریعے مدد دے گی۔ روہیل کھنڈ کے تئیں ہیسٹنگز کی پالیسی متنازع ہو گئی تھی۔ برطانوی فوج نے اودھ کے نواب وزیر کے ساتھ مل کر روہیل کھنڈ کو فتح کیا اور سردار حافظ رحمت خان مارا گیا۔ ہیسٹنگز کو یہاں دو پہلوؤں سے برتری حاصل ہوئی: وہ کمپنی کے لیے مزید رقم چاہتا تھا اور یہ اسے اودھ کے نواب سے حاصل ہو سکتی تھی۔ دوسری بات یہ کہ اس طرح وہ روہیل کھنڈ کی حساس پوزیشن پر قابض تھا اور اودھ کا قبضہ اسے مرہٹوں کے حملوں سے محفوظ رکھے گا۔

پہلی اینگلو-مراٹھا جنگ (1775-1782): نارائن راؤ، مادھو راؤ کی موت کے بعد پیشوا بنا۔ لیکن رگھوناتھ راؤ نے اسے 30 اگست 1773 کو قتل کر دیا، اور خاندان میں کسی دوسرے مرد رکن کی عدم موجودگی میں پیشوا بن گیا۔ بہت سے رئیس رگھوناتھ راؤ کی حکمرانی کو برداشت نہ کر سکے۔ نانا فڈنویس (کونسل آف ریجنسی کے سربراہ) نے نارائن راؤ اور گنگا بائی کے بعد از مرگ، بیٹے کا معاملہ اٹھایا۔ مراٹھا

سرداروں نے شیر خوار بچے کو پیشوا تسلیم کیا۔ ہر طرف سے اپنی کوششوں میں ناکام ہو کر جب آبائی صوبوں سے باہر نکال دیا گیا، تب رگھوناتھ راؤ نے بمبئی میں انگریزوں سے مدد کی اپیل کی اور مایوسی کے عالم میں بمبئی حکومت کے ساتھ 1775 میں سورت کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ رگھوناتھ راؤ نے انگریزوں کی مدد سے پیشوا شپ واپس حاصل کرنے کی امید ظاہر کی۔ اس طرح ہندوستانی شہزادوں اور سرداروں کے اندرونی جھگڑوں نے انگریزوں کو معاملات میں مداخلت کا موقع فراہم کیا۔ انگریزوں نے مرہٹوں کے خلاف جنگ چھیڑنے کا فیصلہ کیا۔ ابتدائی دور میں مرہٹوں کو فتح ہوئی۔ نانا فڑنویس نے پونہ میں ہمت کے ساتھ ان تمام معاملات کی رہنمائی کی۔ ہیسٹنگ اس وقت مایوس ہو گیا تھا، جب بمبئی سے رگھوناتھ راؤ کی قیادت میں پونا جانے والی ایک مہم کو تالی گاؤں میں تباہی ہوئی تھی۔ برطانوی افواج نے وڈگاؤں کو پوری طرح سے گھیر لیا تھا۔ وڈگاؤں میں ایک ذلت آمیز ملاقات کے اختتام پر انگریزوں نے رگھوناتھ راؤ کو ہتھیار ڈال دیے، سلسیٹ اور تھانہ کو واپس کرنے پر رضامند ہوئے۔ اس ملاقات کو ذلت آمیز کے سلوک کے طور پر دیکھا گیا تھا اور گورنر جنرل نے اسے مسترد کر دیا تھا۔ اس نے کرنل گوڈارڈ کے ماتحت ایک مضبوط فوج بھیجی تاکہ وہ رسوائی کا ازالہ کر سکے۔ نانا فڈنویس اس موقع پر اٹھے اور ایک برطانوی مخالف اتحاد (کنفیڈریسی) کو منظم کیا جس میں حیدرآباد کے نظام، میسور کے حیدر علی اور ناگپور کے بھونسلے شامل تھے۔ تاہم، انگریزوں نے انگریز مخالف (اتحاد) کنفیڈریسی کو توڑ دیا۔ ہیسٹنگ نے مختلف مراٹھا سرداروں کے درمیان بڑھتے ہوئے دراڑ کا بھی فائدہ اٹھایا۔ چونکہ انگریزوں کو مرہٹہ اور حیدر علی کے خلاف دو محاذوں پر جنگ کرنا پڑی، کمپنی کی مالی حالت آہستہ آہستہ خراب ہوتی گئی۔ چنانچہ بالآخر انگریزوں کو 1782 میں سلبائی کے معاہدے پر دستخط کرنا پڑا۔ معاہدے کے مطابق

- انگریزوں نے سلسیٹ کو بازیاب کرالیا اور رگھوناتھ راؤ کی برقرار رکھا جسے پیشوا کی طرف سے پنشن ملتے رہے گی۔
- مہادجی سندھیا نے مغرب میں دریائے جمنا تک کے اپنے تمام علاقے واپس حاصل کر لیے۔
- دونوں فریقوں نے جنوبی ہندوستان میں جنگ کے دوران ایک دوسرے کے فتح کیے گئے علاقے واپس کر دیے۔
- سلبائی کے معاہدے نے جمود قائم کر دیا۔

اس معاہدے سے حاصل ہونے والے مادی فوائد اہم نہیں تھے لیکن اس معاہدے نے مرہٹوں کی پالیسی اور حکمت عملی میں ایک اہم موڑ کا نشان لگایا۔ یہ معاہدہ جدید ہندوستان کی تاریخ میں ایک سنگ میل تھا۔ مرہٹوں اور انگریزوں کے تعلقات واضح طور پر بیان کیے گئے تھے۔ کلکتہ اور بمبئی میں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھا کر مرہٹوں کو مجبور کیا گیا۔

دوسری اینگلو میسور جنگ (1780-1784): حیدر علی کے ساتھ برطانوی تعلقات نے بدترین موڑ لیا۔ انگریز رگھوبا کی طرف سے پونہ حکومت کے ساتھ جنگ میں شامل ہو رہے تھے۔ اگست 1778 میں، انگریزوں نے پانڈی چیری پر حملہ کیا اور اس پر قبضے کے بعد، انہوں نے ماہے کے خلاف ایک مہم بھیجی۔ حیدر علی نے احتجاج کیا کیونکہ وہ اپنا فوجی سامان زیادہ تر ماہے کے ذریعے حاصل کر رہے تھے۔ حیدر علی نے ماہے کے دفاع کے لیے اپنی فوج بھیجی لیکن اس کے باوجود مارچ 1779 میں ماہی کا وجود ختم ہو گیا۔ اس سے حیدر علی اور انگریزوں کے تعلقات خراب ہو گئے۔ نظام، مدراس حکومت سے بھی خوش نہیں تھا کیونکہ انہوں نے شمالی سرکاروں کو خراج تحسین پیش کرنے سے روک

دیا تھا۔ ان حالات میں انگریزوں کے خلاف حیدر علی، نظام، پونا حکومت اور ناگپور کے بھونسلے پر مشتمل عظیم چو مورچہ اتحاد (گرینڈ کواڈرپل الائنس) تشکیل دیا گیا۔ لیکن جلد ہی اتحاد میں دشمنی شروع ہو گئی۔ ناگپور کے بھونسلے جو پونہ حکومت کا دشمن تھا وارن ہیسٹنگز سے متاثر ہو کر اس نے اتحاد چھوڑ دیا۔ نظام نے حیدر علی کو بھی چھوڑ دیا۔ پونا حکومت نے بھی اتحاد چھوڑ دیا۔ قدرتی طور پر حیدر علی انگریزوں سے لڑنے کے لیے تنہا رہ گئے تھے۔ حیدر علی کی فوج نے بہت سے دیہات اور قصبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پورٹو نووا اور کانجی ورام کے قصبوں کو لوٹ لیا گیا۔ حیدر علی نے کرناٹک کے دارالحکومت آرکوٹ پر قبضہ کر لیا۔ جب سر آئر کوٹ نے جنوب میں کمان سنبھالی تو صورتحال بدل گئی اور اس نے سولی نگر میں حیدر علی کو عبرتناک شکست دی۔ ناگاپٹنم اور ترنکومالی پر بھی انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ ایک طویل جنگ کے بعد حیدر علی 7 دسمبر 1782 کو انتقال کر گئے۔ جنگ ان کے بیٹے ٹیپو سلطان نے جاری رکھی۔ دونوں فریق جنگ سے بہت متاثر تھے اور بالآخر 11 مئی 1784 کو منگلور کا معاہدہ طے پایا۔

5.2.3 لارڈ کارنوالس (Lord Cornwallis: War with Mysore)

میسور کے ساتھ جنگ کے دوران لارڈ کارنوالس نے مکمل انتظامی معاملات سنبھالتے ہوئے وارن ہیسٹنگز کے کام میں مدد کی۔ اگر ہندوستان میں سول انتظامیہ کی بنیاد وارن ہیسٹنگز نے رکھی تھی تو اس ڈھانچے کو لارڈ کارنوالس نے کھڑا کیا تھا۔ لینڈ ریونیو کے معاملات کے حل میں ان کی شراکت نے ان کے وژن کو ثابت کیا۔ سیاسی محاذ پر اس کے دور حکومت میں میسور ریاست کے ساتھ ایک اور جنگ دیکھی۔

تیسری اینگلو میسور جنگ (1790-1792): برطانوی سامراج اپنی فطرت کے مطابق ہر امن معاہدے کو ٹیپو سلطان کے خلاف ایک اور حملے کے لیے سانس لینے کا وقت سمجھتا تھا۔ لارڈ کارنوالس نے نظام، مراٹھوں کے درمیان مخالف ٹیپو سلطان شکوک و شبہات پیدا کرنے پر کام کیا اور ٹیپو سلطان کے خلاف ان کے ساتھ ٹرپل الائنس (1790) کا اہتمام کیا۔ انگریزوں کے ساتھ جنگ کی ناگزیریت کے قائل ہو کر ٹیپو سلطان نے سفارت کار بھیج کر ترکوں سے 1784 اور 1785 میں قسطنطنیہ اور 1787 میں فرانسیسی بادشاہ کے پاس سفارت کار بھیج کر مدد طلب کی تھی۔ بعد ازاں کوچین ریاست میں ڈچوں سے جیکوٹائی اور کرینگنور کی ڈچ سے خریداری پر ٹریونکور کے راجا کے ساتھ ٹیپو سلطان کی نااتفاقی شروع ہو گئی۔ کیونکہ وہ کوچین ریاست کو اپنی معاون ریاست سمجھتے تھے اور اس طرح ٹراوانکور راجہ کے اس عمل کو اپنے خود مختار حقوق کی خلاف ورزی سمجھتے تھے۔ اس نے اپریل 1790 میں ٹریونکور پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنگ کے لیے انگریزوں کی منافقت نے ٹریونکور کے حکمران کا ساتھ دیا اور ٹیپو سلطان کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ کارنوالس نے خود ویلور اور امبور سے ہوتے ہوئے بنگلور تک مارچ کیا (مارچ 1791 میں پکڑا گیا) اور سرینگا پٹنم تک پہنچا۔ مراٹھا اور نظام کی فوجوں کی مدد سے انگریزوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ٹیپو سلطان نے افواج کے خلاف مزاحمت کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا جس کی وجہ سے اس کی شکست ہوئی۔ معاہدہ سرینگا پٹنم (مارچ 1792) پر دستخط ہوئے جس کے نتیجے میں میسور کا تقریباً نصف علاقہ فاتح اتحادیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ انگریزوں نے بارمحل، ڈنڈیگل اور مالابار پر قبضہ کر لیا جبکہ مراٹھوں کو تنگابدرا کی طرف اور نظام نے کرشنا سے لے کر پنار تک کے علاقے حاصل کر لیے۔ ٹیپو سلطان کو تین کروڑ روپے سے زائد کا جنگی معاوضہ بھی ادا کرنا پڑا۔ ٹیپو سلطان کو بھاری نقصان ہوا اور وہ صرف اپنی سلطنت کو مکمل ناپید ہونے سے بچا سکا۔

5.2.4 سر جان شور: غیر جانبداری کی پالیسی (Sir John Shore: The Policy of Neutrality)

پٹز انڈیا ایکٹ (1784) کی روح سے متاثر ہو کر سر جان شور نے مقامی ریاستوں کے حوالے سے غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اودھ کے معاملات میں مداخلت کرنے پر اس وقت مجبور ہوا جب 1797 میں نواب کا انتقال ہوا اور اس کے بعد اس کا جانشین اس کا ایک نالائق کردار والا بیٹا بنا۔ جان شور کے ساتھ شروع کرنے کے لئے جانشینی کی منظوری دی. لیکن بعد میں اپنا فیصلہ واپس لے لیا اور اس کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ اس نئے معاہدے کے ذریعے انگریزی کمپنی کو اودھ کے دفاع کا ذمہ دار بنایا گیا۔ نواب کو 76 لاکھ روپے سالانہ سبسڈی (مالگذاری) دینا تھی۔ اس نے الہ آباد کا قلعہ بھی انگریزی کمپنی کو دے دیا۔ اس نے خود کو پابند کیا کہ وہ کسی بھی غیر ملکی ریاست سے کوئی رابطہ نہ رکھے گا۔

5.2.5 لارڈ ویلزلی: ماتحتی اتحادی نظام (Lord Wellesley: The Subsidiary Alliance System)

لارڈ ویلزلی نے ہندوستانی حکمرانوں کے خلاف سخت اور جارحانہ رویہ اپنایا۔ اس نے خود کو بنگال ٹائیگر بتایا، اور ہمیشہ شکار کی تلاش میں رہتا تھا۔ اس نے ہندوستانی ریاستوں کو برطانوی سیاسی طاقت کے مدار میں لانے کے لیے ذیلی اتحادی نظام سے متعارف کرایا۔

ماتحتی اتحاد: اس نظام نے ہندوستان میں برطانوی بالادستی کو یقینی بنانے اور نپولین کے خطرے سے بچانے کا دوہرا مقصد پورا کیا۔ اس نظام نے کمپنی کے تسلط کی توسیع میں اہم کردار ادا کیا اور کمپنی کے املاک میں بہت سے نئے علاقے شامل کیے گئے۔ ماتحت نظام کے تحت اس نظام کو قبول کرنے والے حکمرانی کو کمپنی کو تسلیم کرنا پڑتا تھا، جو بدلے میں علاقے کے تحفظ کو یقینی بنائے گی۔ اس نظام کے تحت ریاستوں کے شامل ہونے سے پہلے درج ذیل شرائط کا اطلاق ضروری تھا:

- دستخط شدہ ہندوستانی ریاست نے اپنے بیرونی تعلقات کو کمپنی کے سپرد کرنا تھا اور کوئی جنگ نہیں کرنی تھی اور صرف کمپنی کے ذریعے ہی دیگر ریاستوں کے ساتھ مذاکرات کرنا تھا۔
- ایک بڑی ریاست کو اپنے علاقوں کے اندر ایک فوجی نظم و نسق قائم کرنا ہو تو اس کی کمانڈ برطانوی افسران کرتے تھے اور حکمران کو اس فوج کی دیکھ بھال کے لیے مکمل خود مختاری کے ساتھ ان علاقوں کو سونپنا تھا۔ چھوٹی ریاست خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کمپنی کو نقد کی پیش کرتی تھی۔
- ریاست کو اپنے ہیڈ کوارٹر میں ایک برطانوی باشندے کو قبول کرنا تھا۔
- ریاست کو کمپنی کے مشورے کے بغیر یورپیوں کو اپنی خدمات میں ملازمت نہیں دینا تھا۔
- کمپنی کو ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرنی تھی۔
- کمپنی کے ذمہ غیر ملکی دشمنوں کے خلاف ریاست کی حفاظت کرنا تھی۔

1798 میں حیدرآباد کے نظام نے اسے قبول کیا، اس کے بعد اودھ اور میسور کے راجہ نے اسے قبول کیا۔ پیشوا باجی راؤ نے بھی ہولکروں کے ہاتھوں شکست کے بعد یہ معاہدہ قبول کر لیا تھا۔ بڑودہ کے حکمرانوں اور بہت سے راجپوتوں نے اس نظام کو قبول کیا۔ اس نظام

نے کمپنی کے علاقے کے علاوہ کمپنی کے وسائل میں بھی اضافہ کیا۔ کمپنی کو ریاستوں کے معاملات میں اپنی فوجی طاقت استعمال کرنے کا حق حاصل تھا۔اس سے ریاستوں کو کمپنی پر انحصار کرنا پڑا اور مقامی حکمرانوں پر غیر ملکی اثر ورسوخ ختم ہو گیا۔

چوتھی اینگلو میسور جنگ (1799): سامراجی لارڈ ویلزلی کی 1798 میں گورنر جنرل کے طور پر ہندوستان کو نپولین کے خطرے کے پس منظر میں آمد نے میسور کی تقدیر بدل دی۔ ویلزلی ٹیپو سلطان کا مکمل صفایا کرنے کے لیے پر عزم تھا۔ ٹیپو سلطان کے خلاف نظام اور مرہٹوں کے ساتھ سازشوں کی منصوبہ بندی کرنے یا اپنے سفیر عرب بھیجنے کا الزام، افغانستان کے زمان شاہ یا قسطنطنیہ یا جزائر آف فرانس (ماریشس) میں فرانسیسیوں یا ورسائی کی ڈائرکٹری کے خلاف حملہ کرنے جیسے آسان بہانے تھے۔ اسی لیے ٹیپو سلطان کے خلاف آپریشن 17 اپریل 1799 کو شروع ہوا اور 4 مئی 1799 کو سرینگا پٹنم کے زوال کے ساتھ ہی میسور کی آزادی کی تاریخ کا خاتمہ ہوا۔ ٹیپو سلطان بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ انگریزوں نے میسور کے پورے سمندری ساحل کے علاوہ کنارا، کوئمبتور، وائناد اور دھرا پورم کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ کچھ علاقے نظام کو دے دیے گئے۔

دوسری اینگلو-مراٹھا جنگ (1803-1805): پہلی اینگلو-مراٹھا جنگ کے خاتمے کے بعد مراٹھوں کے اندرونی معاملات مزید بگڑ گئے۔ مراٹھا اتحاد اپنے اراکین کی باہمی عدم اعتماد اور خود غرضانہ سازشوں کے باعث کمزور پڑ چکا تھا۔ نوجوان پیشوا مادھو راؤ نے حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی لیکن مؤثر طریقے سے ایسا نہ کر سکے۔

مہادجی سندھیا اس دور کے سب سے نمایاں مراٹھا سردار بن گئے تھے۔ لیکن مہادجی سندھیا کا انتقال 1794 میں ہوا اور اس کے بعد ان کے بھتیجے دولت راؤ سندھیا نے تخت سنبھالا۔ ان کی موت نے پونا میں نانا فڑنویس کو تنہا چھوڑ دیا۔ مرہٹوں نے نرمدا کے جنوب میں اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کو دوبارہ حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس کی وجہ سے وہ میسور کے ٹیپو سلطان سے ٹکرا گئے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ تین طاقتوں یعنی مرہٹوں، انگریزوں اور نظام حیدرآباد کا ایک مضبوط اتحاد ٹیپو سلطان کے خلاف تشکیل دیا گیا تھا۔ انگریز ٹیپو سلطان کو شکست دینے میں کامیاب رہے۔ اس کے بعد مرہٹوں کے سردار نظام حیدرآباد کے خلاف متحد ہو گئے اور 1795 میں اسے شکست دی۔ نظام کو ایک ذلت آمیز معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا۔ 1800 میں نانا فڑنویس کا انتقال ہو گیا۔ ان کی موت مراٹھا تاریخ میں ایک اہم موڑ تھی، کیونکہ اس نے دولت راؤ سندھیا اور جسونت راؤ ہولکر کے درمیان شدید مخاصمت تھی۔ انہی حالات میں انگریزوں کو مرہٹوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا بہتر موقع ملا۔ لارڈ ویلزلی جب 1798 میں گورنر جنرل کے طور پر ہندوستان آیا تو اس نے مراٹھوں کو منتشر پایا۔ اس نے مراٹھا سرداروں کے درمیان اس اختلاف کو انگریزوں کے فائدے کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور کمپنی کو ہندوستان میں سب سے بڑی طاقت بنانے کا عزم کیا۔ اس دوران جسونت راؤ ہولکر نے اکتوبر 1802 میں پونا میں سندھیا اور پیشوا کی مشترکہ فوجوں کو شکست دی۔ جسونت راؤ ہولکر نے اب رگھوناتھ راؤ کے گود لیے ہوئے بیٹے ونائک راؤ کو پیشوا کے تخت پر بٹھایا۔ یہ انگریزوں کے لیے مرہٹوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا موزوں وقت تھا۔ مایوسی محسوس کرتے ہوئے، پیشوا نے انگریزوں سے اتحاد کی کوشش کی اور 31 دسمبر 1802 کو باسین کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ معاہدے کے مطابق،

- دونوں فریقین-پیشوااور انگریز،ایک دوسرے کے علاقوں کا دفاع کرنے پر متفق ہوئے۔
- پیشوانے برطانوی ذیلی فوج کو اپنی خدمات میں شامل کرنے اور ان کی تنخواہ کے عوض 26 لاکھ روپے کی آمدنی حاصل کرنے والے اپنے علاقے کا ایک حصہ دینے پر رضامندی ظاہر کی۔
- انہوں نے دوسری ریاستوں کے ساتھ اپنے خارجہ تعلقات کو بھی انگریزوں کے حوالے کر دیااور اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ اس کی خدمت میں کسی یورپی کو شامل نہ کیا جائے۔
- باجی راؤII دوبارہ انگریزوں کی مدد سے پیشوا کے طور پر نصب کیا گیا۔
- معاہدے نے کمپنی کو پیشوااور دیگر مراٹھا سربراہان، پیشوااور دیگر ہندوستانی حکمرانوں کے درمیان تنازعات میں ثالث بنایا۔
- پیشوانے عملی طور پر نظام پر اپنے تمام دعوے تسلیم کر لیے۔

اگرچہ اس معاہدے نے انگریزوں کی سیاسی بالادستی قائم نہیں کی، لیکن یہ یقینی طور پر اس سمت میں ایک اہم سنگ میل تھا۔ پیشوااور انگریزوں کے درمیان اتحاد کی سندھیااور بھونسلے نے سخت مخالفت کی۔ وہ اسے عام طور پر مراٹھا نسل کی تذلیل سمجھتے تھے۔ انہوں نے برطانوی طاقت کو چیلنج کیا۔ لیکن، دونوں طاقتوں نے 17 دسمبر 1803 کو دیوگاؤں کے ذلت آمیز معاہدے کو تسلیم کیا۔ بھونسلے نے صوبہ کٹک اور دریائے وردہ کے مغرب میں پورا علاقہ کمپنی کو دے دیا۔ سندھیا نے سرجی ارجن گانوں معاہدہ (دسمبر، 1803) میں کیا جس کے تحت، اس نے گنگا اور جمنا کے درمیان کے علاقوں کو ہتھیار ڈال دیا۔ دونوں علاقے جے پور اور جودھ پور کی ریاستوں میں واقع تھے۔ دونوں شہزادوں نے برطانوی باشندوں کو بھی قبول کیا۔ تاہم، ہولکر بے لگام رہے۔ انگریزوں اور ہولکر کے درمیان مقابلہ جاری رہا۔ اسی دوران ویلزلی کو ہندوستان سے واپس بلایا گیا تھا۔ یہ سر جارج بارلو تھا، جس نے ہولکر کے ساتھ راج پور گھاٹ کا معاہدہ (25 دسمبر، 1805) کیا، جس کے ذریعے مراٹھا نے بنڈیل کھنڈ کے اوپر دریائے چمبل کے شمال میں واقع مقامات پر اپنے دعوے ترک کر دیے۔ انگریزوں نے بھی راجپوت ریاستوں سے اپنا تحفظ واپس لے لیا۔ دوسری اینگلو مراٹھا جنگ، گورنر جنرل کے لیے ایک عظیم فتح تھی۔ جنگ نے انگریزوں کو دہلی اور آگرہ کے شاہی دارالحکومتوں پر مستقل قبضہ حاصل کرنے کے قابل بنایا۔ انگریز اب ہندوستان کے مکمل آقا تھے۔

ویلزلی کے تحت برطانوی تسلط کی توسیع: 1805 تک کمپنی کا تسلط ہندوستان کی پوری سمندری پٹی کے ساتھ ساتھ سندھ کی سرحد سے لے کر دریائے سندھ کے کنارے سے مغربی ساحل کے نیچے کیپ کومورین تک اور وہاں سے شمال مشرق کی طرف خلیج بنگال کے ساتھ برما کی سرحد تک پھیل گیا۔ چوتھی اینگلو میسور جنگ کے بعد ویلزلی نے جنوبی کنارا ساحل، جنوب مشرق میں وائناد، جنوب مشرق میں کوئمبٹور اور دھارا پورم کے علاوہ سرینگاپٹنم کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ نظام مجبوراً (1800) میں ایک نظر ثانی شدہ ذیلی معاہدہ کے تحت مؤخر الذکر نے بیلاری اور کڈپہ کے اضلاع کو کمپنی کے حوالے کر دیا۔ اودھ کے نواب وزیر سے زبردستی معاہدے کے ذریعے، کمپنی نے روہیل کھنڈ، فرخ آباد، مین پوری، اٹاوہ، کانپور، فتح گڑھ، الہ آباد، اعظم گڑھ، بستی اور گورکھپور کو حاصل کیا۔ دوسری اینگلو-مراٹھا جنگ کے بعد کمپنی کے علاقائی فوائد میں بالائی دوآب (گنگا اور جمنا کے درمیان کا علاقہ)، راجپوت ریاستوں جے پور، جودھ پور اور گوہد کے شمال میں تمام علاقے، بروچ کا حصہ، احمد نگر کا

قلعہ، اس کے علاوہ اڑیسہ کے عقبی حصے ضلع کٹک کمپنی میں شامل تھے۔ ویلزلی نے تنجور کا [کتوبر 1799)]، سورت کا مارچ 1800) اور کرناٹک کا (جولائی 1801) میں انتظام سنبھالا۔

5.2.6 لارڈ کارنوالس: عدم مداخلت کی پالیسی (Lord Cornwallis: Policy of Non-Intervention)

1805 میں لارڈ کارنوالس دوسری بار گورنر جنرل کے طور پر واپس آئے۔ کمپنی کے ڈائریکٹرز جو برطانوی تسلط میں توسیع کی پالیسی کی حمایت میں نہیں تھے۔ ویلزلی نے عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ عدم مداخلت کی پالیسی کے عزم کے ساتھ ہندوستان واپس آئے تھے۔ انہوں نے ہولکر کے ساتھ دشمنی ختم کرنے اور سندھیا کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ انہوں نے گوالیار میں سندھیا کو بحال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور جمنا کے مغرب میں تمام علاقے چھوڑنے اور راجپوت ریاستوں سے انگریزی کمپنی کے تحفظ کے انتظامات واپس لینے کا بھی فیصلہ کیا۔ 1805 میں اس کی موت کے بعد سر جارج بارلو گورنر جنرل بنا۔ جارج بارلو کے بعد لارڈ منٹو تھے جو بورڈ آف کنٹرول کے صدر تھے۔ 1809 میں لارڈ منٹو نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ امرتسر کا معاہدہ کیا۔ اس سلسلے میں سر چارلس میٹ کلاف نے اہم کردار ادا کیا۔ سکھوں کا علاقہ ستلج کے دوسری طرف ہونا تھا۔ یہ معاہدہ دونوں فریقین نے تیس سال تک برقرار رکھا۔ اس نے فرانسیسی اور ڈچوں کو نیچا دکھانے کے لیے بھی سخت اقدامات کیے تھے۔ اس نے بوربن اور ماریشس کی فرانسیسی کالونیوں کے خلاف بحری مہم بھیجی۔ ان جزائر پر قبضہ کر لیا گیا۔ ایک اور مہم جاوا بھیجی گئی۔ 1813 میں انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر ایکٹ کی 20 سال کے لیے تجدید کی گئی۔ اسی سال لارڈ ہیسٹنگز نے ان کی جگہ لی۔

5.3 ماتحت اتحادی پالیسی (Policy of Subordinate Alliance)

لارڈ ہیسٹنگز کی جنگوں (1813-1823) نے ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تعلقات میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ سامراجی خیال پروان چڑھا اور نظریہ بالادستی پروان چڑھنے لگا۔ ریاستوں کے ساتھ برتاؤ کا پہلے جو نظام تھا گویا وہ انگریزوں کے ساتھ برابری کی بنیاد پر کھڑی تھیں، بالآخر اس طرز کو ترک کر دیا گیا۔ اس طرح کی پالیسی کے معمار لارڈ ہیسٹنگز تھے جنہوں نے ''باہمی ہم آہنگی''، ''دوستانہ تعاون'' (ماتحت اتحاد) کے پرانے معاہدوں کی جگہ ''ماتحت تعاون'' کے معاہدوں کو اپنایا۔ اس نظام کے تحت ریاستوں کو جنگ یا امن قائم کرنے اور دیگر طاقتوں کے ساتھ معاہدے کرنے کے اپنے حقوق سے دستبردار کر دیا۔ باضابطہ طور پر ان ریاستوں نے داخلی خود مختاری برقرار رکھی لیکن یہ صرف کاغذی سطح محدود ہو گئی۔ لارڈ ہیسٹنگز نے اپنے نظم کو بدھل کھنڈ، وسطی ہندوستان اور گجرات کے چھوٹے سرداروں تک وسیع کر دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر انگریز چاہتے تو بہت سی ریاستوں پر قبضہ کر سکتے تھے۔ لیکن اقتصادی نقطہ نظر سے اور بین یورپی تعلقات پر ناپسندیدہ اثرات کے خوف سے انہوں نے الحاق کی پالیسی اپنانا دانشمندی نہیں سمجھی۔

5.3.1 لارڈ ہیسٹنگز (Lord Hastings)

اگر ویلزلی فرانسیسیوں کو نکال باہر کرنے اور اپنے ہندوستانی مخالفین کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا تو ہیسٹنگز پورے ہندوستان پر

انگلینڈ کی سیاسی خود مختاری کو صریح الفاظ میں قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ہیسٹنگز نے محسوس کیا کہ سندھیا، بھونسلے اور ہولکر جیسے آزاد مراٹھا حکمرانوں کا وجود ہندوستان میں برطانوی پوزیشن سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اگر کمپنی کو ہندوستان کی تقدیر کا ثالث بننا ہے تو مراٹھوں کی آزادی کو ختم کر دینا چاہیے۔

تیسری اینگلو-مراٹھا جنگ (1817-1818): گورنر جنرل کے طور پر لارڈ ہیسٹنگز کی آمد کے ساتھ، مراٹھاؤں کے ساتھ جدوجہد کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا۔ کارنوالس اور سر جارج بارلو مراٹھا معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی کے حق میں تھے۔ لیکن، لارڈ ہیسٹنگز نے پچھلی پالیسی کو ترک کر دیا اور ہندوستان میں برطانوی بالادستی کا اعلان کرنے کا عزم کیا۔ انگریزوں کو یہ تاثر تھا کہ مراٹھا پنڈاریوں کے ساتھ خفیہ اتحاد میں ہیں (پنڈاری ایک بے قاعدہ فوج تھی جسے ریاست کی طرف سے معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا تھا لیکن جنگ کے دوران انہیں لوٹنے کی اجازت تھی۔ انہیں پیشوا باجی راؤ اول نے بے قاعدہ گھڑ سوار کے طور پر ملازم رکھا تھا)۔ لہذا، پنڈاریوں کے خلاف ہیسٹنگز کے کسی بھی اقدام کا مطلب مراٹھا سربراہ کی خود مختاری کی خلاف ورزی کرنا اور دو فریقین جنگ میں گھسیٹنا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ریاست ناگپور پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ انگریزوں نے اپّا صاحب کو مئی 1816 میں معاہدہ ناگپور کے نام سے ایک ذیلی معاہدہ کرنے کی ترغیب دی۔ اس معاہدے سے ناگپور کی آزادی ختم ہو گئی۔ ہیسٹنگز نے سندھیا کو بھی 5 نومبر 1817 گوالیار کے معاہدے کے نام سے ایک معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور کیا۔ اسی طرح جبر کے تحت، پونا کا معاہدہ جون 1817 میں پیشواؤں اور انگریزوں کے درمیان طے پایا۔ اگرچہ پیشوا نے معاہدے پر دستخط کیے، لیکن وہ معاہدے کی شرائط پر ذلت محسوس کرتے تھے۔ یہ ان کے لیے بہت زیادہ تھا۔ انہوں نے بغاوت کی اور برطانوی ریذیڈنسی پر حملہ کر کے جلا دیا۔ تاہم ''کِرکی'' میں اسے شکست ہوئی اور وہ جنوب کی طرف بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کا تعاقب کیا گیا اور مزید دو مدبھیڑوں میں اسے شکست ہوئی اور اسے 18 جون 1818 کو جان میلکم کے حوالے کر دیا گیا۔ پیشوا باجی راؤ دوم کو آٹھ لاکھ روپے سالانہ پنشن الاٹ کی گئی اور پیشوا کا دفتر ختم کر دیا گیا۔ انہیں کانپور کے قریب گنگا کے کنارے بٹور میں رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔

پیشوا کے ہتھیار ڈالنے کے بعد باقی ماندہ لوگوں کا محکوم ہونا چند دنوں کی بات تھی۔ جب پیشوا منظر سے غائب ہو رہا تھا، ناگپور کے اپا صاحب بھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور 1840 میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ہولکر ریاست کے معاملات اس کے نابالغ بیٹے ملہار راؤ اور ہولکر کی بیوی تلسی بائی کے ہاتھ میں تھے۔ برطانوی افواج نے ریاست پر حملہ کیا اور سیتابلدی اور مہید پور میں فتح حاصل کی۔ مرہٹوں نے اگرچہ بہادری سے مقابلہ کیا لیکن وہ جنگ ہار گئے۔ امیر خان (ہولکر کا ایک مسلمان ساتھی) کی مداخلت سے مندیسور میں نو عمر شہزادہ ملہار راؤ کے ساتھ ایک معاہدہ طے پایا۔ اس معاہدے کے مطابق برطانوی تسلط کو قبول کر لیا گیا۔ شہزادے نے ماتحت افواج قبول کر لی۔ بنڈی کے شمال میں اور ست پورہ رینج کے جنوب میں تمام علاقوں کو سونپ دیا گیا۔ اس طرح مرہٹوں کی طاقت پوری طرح سے کم ہو گئی۔ جنگ میں انگریزوں کی کامیابی نے شہزادوں کے زیر اقتدار پورے ملک کو برطانوی حکومت کے کنٹرول میں لے لیا۔ ناگپور کا راجہ اسیر ہو گیا۔ پیشوا بھگوڑا تھا اور

پنڈاریوں کا وجود ختم ہو گیا۔ برطانوی سلطنت کی سرحدیں وسطی ہندوستان اور دکن تک پھیلی ہوئی تھیں۔

5.4 جبری الحاق، ضبطی اور قبضے کی پالیسی (Policy of Lapse, Escheat And Annexations)

1823 اور 1858 کے درمیانی عرصے میں ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں برطانوی رویے میں ایک بنیادی تبدیلی دیکھی گئی۔ تمام حربوں اور بہانوں سے ریاستوں کے علاقوں کا الحاق اور برطانوی طاقت کی توسیع کمپنی کا نصب العین بن گیا۔ لارڈ ولیم بینٹنک جب ہندوستان آئے تو انگلینڈ کے حکام کی طرف سے جاری ''اکیلا رہنے دو'' کی پالیسی کا پابند تھا۔ لیکن اس نے اس پالیسی سے بڑی تیزی سے علیحدگی اختیار کر لی جیسا کہ کورگ، کیچر اور جینتیا کے الحاق اور میسور انتظامیہ کو انگریزوں کے ہاتھوں میں منتقل کرنے سے ظاہر ہے۔ 1834 اور 1841 میں انگلینڈ میں برطانوی حکام نے ہندوستانی علاقوں کو برطانوی سلطنت میں ملحق یا الحاق کے واضح اشارے دیے۔ لہٰذا، لارڈ آکلینڈ نے ''جبری الحاق'' (Lapse and Escheat) کی بنیاد پر کئی ریاستوں کا الحاق کر لیا، یہ طریقہ کار ڈلہوزی نے آخری دور تک برقرار رکھا۔ 'جبری الحاق کے نظریے' کا مطلب یہ تھا کہ، فطری وارثوں کی ناکامی پر، زیر تسلط ریاستوں کی خود مختاری یا اس جیسی اعلیٰ ترین طاقت ختم ہو جائے گی. یہ وہ مقام ہے جو برطانوی حکومت نے مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد حاصل کیا تھا، اور انگریز ایسی ریاستوں کے وارثوں کو گود لینے کے حق کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس نظریے کی مد میں، ستارہ (1848)، جے پور (1849)، باگھاٹ (1850)، ادے پور (1852)، جھانسی (1854)، اور ناگپور (1854) کی ریاستوں کا الحاق کیا گیا۔ کچھ ریاستوں کے حکمرانوں کے ٹائٹل اور پنشن کو ختم کر دینے کے لیے بھی نظریہ جبری استبداد (Doctrine of Lapse) کا اطلاق کیا گیا۔ اس کے علاوہ، ڈلہوزی نے ''بد نظمی'' کی شکایت پر اودھ پر قبضہ کر لیا۔ دوسرے لفظوں میں، کمپنی نے الحاق کی حکمت عملی اچھی طرح کر سوچ اپنائی تھی اور ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کے تقدس کا احترام کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اسی پالیسی نے موجودہ ریاستوں میں ناراضگی کے ساتھ ساتھ اندیشے بھی پیدا کیے اور اس لیے یہ 1857 کی بغاوت میں ایک معاون عنصر بن گئی۔

5.4.1 ولیم بینٹنک (William Bentinck)

برطانوی ہندوستان کی تاریخ میں ترقی پسند گورنر جنرل اور لبرل مصلح کے طور پر مقبولیت کے ساتھ، اس نے ریاستوں کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی اپنائی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے عدم مداخلت کی پالیسی سے علیحدگی اختیار کر لی اور بدانتظامی کی درخواست پر میسور (1831)، کورگ (1834) اور سنٹرل کاچھر (1834) کو کمپنی کے ساتھ ملحق کر لیا۔ یہ بینٹینک وسطی ایشیا میں روسی ترقی کے لیے متحرک تھا۔ ہندوستانی طاقتوں کے ساتھ یکجہتی کا مظاہرہ کرنے کے لیے، اس نے رنجیت سنگھ کے ساتھ ''دائمی دوستی کا معاہدہ'' کیا اور سندھ کے امیروں کے ساتھ تجارتی اور سیاسی معاہدہ کیا۔ اس نے کابل کے تخت پر شاہ شجاع کے دعوؤں کی بھی تائید کی۔

5.4.2 لارڈ آکلینڈ: پیش قدمی کی پالیسی (Lord Auckland: Forward Policy)

لارڈ آکلینڈ نے ایک پیش قدمی کی حکمت عملی (فارورڈ پالیسی) کی وکالت کی اور افغانستان کو اپنے سیاسی دائرے اثر میں لانے کے

حوالے سے سوچا۔ 1837 میں آکلینڈ نے کیپٹن الیگزینڈر برنس کو برائے نام تجارتی مشن پر کابل بھیجا، لیکن حقیقت میں وہ وہاں کے سیاسی حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ لیکن یہ مشن ناکام رہا۔اس کے بعد آکلینڈ کے لیے دو وسیع مواقع دستیاب ہوئے یعنی یا تو افغانستان سے متعلق تمام منصوبوں کو ترک کر دیا جائے اور دفاعی اقدامات کو دریائے سندھ تک محدود کر دیں یا رنجیت سنگھ کی مدد سے یا اس کے بغیر افغانستان پر حملہ کر کے بے مروتی سے امیر دوست کو معزول کر دیں۔ محمد، اور ملک کو کسی دوست شہزادے کے سپرد کر دیں، شاہ شجاع کہتے ہیں۔ حکومت نے پیش قدمی کی پالیسی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور شاہ شجاع اور رنجیت سنگھ کے ساتھ ایک سہ فریقی معاہدے (جون 1838) پر دستخط کیے۔اس معاہدے میں یہ شرط رکھی گئی تھی کہ شاہ شجاع کو سکھوں کی مسلح مدد سے کابل کے تخت پر بحال کیا جائے گا۔ کمپنی کو ان کے پس پشت رہنا تھا۔اس کے بدلے میں شاہ شجاع کو اپنے خارجہ تعلقات کو انگریزوں اور سکھوں کے مشورے سے چلانے کا پابند کیا۔افغانستان پر حملے کی تیاریاں بڑے پیمانے پر کی گئیں۔ق کیا گیا۔اس کے علاوہ، ڈلہوزی نے ''بد نظمی'' کی شکایت پر اودھ پر قبضہ کر لیا۔ دوسرے لفظوں میں ، کمپنی نے الحاق کی حکمت عملی اچھی طرح کر سوچ اپنائی تھی اور ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کے تقدس کا احترام کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔اسی پالیسی نے موجودہ ریاستوں میں ناراضگی کے ساتھ ساتھ اندیشے بھی پیدا کیے اور اس لیے یہ 1857 کی بغاوت میں ایک معاون عنصر بن گئی۔

پہلی افغان جنگ (1839-1842): انگریزی فوج نے سر جان کین کی سربراہی میں بولان پاس سے کوچ کیا، قندھار اور غزنی پر قبضہ کیا اور اگست 1839 میں فتح کے ساتھ کابل میں داخل ہوئے۔ دوست محمد نے 1840 میں ہتھیار ڈال دیے اور اسے قیدی بنا کر کلکتہ بھیج دیا گیا۔ شاہ شجاع کو افغانستان کا امیر قرار دیا گیا۔اس کے سارے منصوبے کی حماقت کچھ ہی دیر بعد عیاں ہو گئی۔ آکلینڈ نے برطانوی فوجیوں کے انخلاء کا فیصلہ کیا، حالانکہ جنرل ایلفنسٹن کی کمان میں کابل میں ایک چھوٹی سی چھاونی چھوڑ دی گئی تھی۔ جلد ہی افغان بغاوت پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ جنوری 1842 میں جنرل ایلفنسٹن کو اپنے کیمپ اور پیروکاروں سمیت قتل کر دیا گیا۔ شاہ شجاع کو اپریل 1842 میں قتل کر دیا گیا۔ یہ عظیم الشان منصوبہ غبارے کی طرح پھٹ گیا۔

5.4.3 لارڈ ایلن برو (Lord Ellenborough)

لارڈ ایلن برگ کا تقرر ایک ایسے وقت میں کیا گیا تھا جب آکلینڈ کے زمانے میں افغانستان میں انگریزوں کی خرد برد کی وجہ سے ہندوستان کے حالات سنگین ہو گئے تھے۔ ہندوستان آنے سے پہلے وہ بورڈ آف کنٹرول کے صدر کے طور پر کام کر چکے تھے۔ وہ ان کے ساتھ مسلسل مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد پہلی افغان جنگ کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں کامیاب رہا۔

سندھ پالیسی کا ارتقاء: سندھ اس ملک کو دیا گیا نام ہے جو دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر، پنجاب کے جنوب میں اور بحیرہ عرب تک پھیلا ہوا ہے۔ 18 ویں صدی میں اس خطے پر کئی سرداروں کی حکومت تھی جن میں سب سے اہم خیر پور، میر پور اور حیدر آباد میں بیٹھے تھے۔ انگریزوں نے کئی سالوں تک دریائے سندھ کو لالچ بھری نظروں سے دیکھا۔ 1832 میں، سندھ کے امیروں کو ہچکچاتے ہوئے ایک معاہدے

پر اتفاق کیا گیا جس کے ذریعے سندھ کے دریااور سڑکیں ہندوستان کے سوداگروں اور تاجروں کے لیے کھول دی جائیں گی۔ 1834 سے 1836 کے دوران برطانوی راج نے عملی طور پر سندھ کے امیروں کو اپنے دائرہ تحفظ میں لے لیا۔ افغان جنگ کے دوران سندھ انگریزوں کی کارروائیوں کا مرکز تھا۔ سندھ کے امیروں نے برطانوی حکومت کے ساتھ اپنے معاہدوں کو وفاداری سے برقرار رکھا۔

سندھ کا الحاق (1843): لارڈ آکلینڈ نے بھی 1838 میں سندھ کے امیروں کو حیدر آباد میں ایک برطانوی رہائشی علاقوں تک محدود رہنے پر مجبور کیا۔ چارلس نیپئر جنہوں نے برطانوی باشندے کی حیثیت سے خدمات انجام دیں سندھ کے عسکری اور سیاسی امور پر اعلیٰ کنٹرول حاصل کر لیا۔ اس نے نئے معاہدوں کو امیروں پر مسلط کرنے کی کوشش کی۔ دسمبر 1842 میں یہ معاہدے توثیق کے لیے ان کے پاس بھیجے گئے۔ امیروں سے کہا گیا کہ وہ جنوری 1843 تک معاہدوں کو قبول کر لیں۔ معاہدوں کے مطابق، امیروں کو خراج کے عوض اہم علاقے انگریزی کمپنی کو دینے تھے۔ ان کو سندھ میں بحری جہاز چلانے والے انگریزی اسٹیمروں کو ایندھن فراہم کرنا تھا۔ انہیں برطانوی حکومت کے حق میں رقم جمع کرنے کی مہم بھی ترک کرنا تھا۔ نیپئر کی اسی اجارہ داری وجہ سے جنگ شروع ہو گئی۔ اہم لڑائیاں میانی اور ڈبو میں لڑی گئیں۔ نیپئر نے میر پور پر قبضہ کر لیا اور اس فتح کے نتیجے میں اگست 1843 میں سندھ کا الحاق ہو گیا۔ امیروں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ نیپئر کو 70000 پاؤنڈ انعامی رقم کے طور پر ملے۔ ایلن برگ اور آؤٹرم کی سندھ پالیسی کی عالمی سطح پر مذمت کی گئی۔

5.4.4 لارڈ ہارڈنگ: اینگلو سکھ تنازعہ (Lord Hardinge: Anglo-Sikh Conflict)

لارڈ ہارڈنگ، ایک عظیم شہرت کے حامل سپاہی نے 1844 میں لارڈ ایلنبرو کی جگہ لی۔ نئے گورنر جنرل نے کمپنی کی فوجی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لیے بھرپور اقدامات اٹھائے۔ پنجاب میں کمپنی کی فوج کی طاقت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ ستلج کے دوسری طرف سکھ سپاہیوں نے یہ سب دیکھا اور اپنے اپنے نتائج اخذ کئے۔ سندھ میں برٹش کمپنی کے دستے اچھی طرح سے لیس تھے اور ملتان پر کسی بھی ممکنہ مارچ کے لیے تیار تھے۔ کمپنی نے کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ تیاریاں دفاعی نوعیت کی ہیں اور سکھوں کے ممکنہ حملے سے نمٹنے کے لیے کی گئی ہیں لیکن پنجاب میں افراتفری کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے واضح طور پر یہ تمام جھوٹی تاویلات منافقانہ تھیں۔

پہلی اینگلو سکھ جنگ (1845-1846): سکھوں کے معاملات سے نمٹنے کے لیے 1843 میں میجر براڈفٹ کی لدھیانہ میں بطور کمپنی کے ایجنٹ کے تقرری نے اینگلو سکھ تعلقات کو مزید خراب کر دیا۔ اس نے ایک غیر اخلاقی اعلان کیا کہ لاہور دربار کی مہاراجہ دلیپ سنگھ کی موت یا معزولی میں کسی نقصان سے بچانے کے لیے دریائے ستلج کے پار کی تمام ملکیتیں پٹیالہ اور دیگر سرداروں کے برابر برطانوی تحفظ میں ہیں۔ اس اعلان کے پس پردہ مکاری نے لاہور میں شدید تشویش پیدا کی۔ برطانوی چالوں اور تیاریوں نے دوسری طرف ایک قسم کی مہم کا اشارہ دیا اور معاملات کو مزید تیز کر دیا۔ نتیجتاً سکھ فوجیوں نے 11 دسمبر 1845 کو ہرکی اور قصور کے درمیان ستلج کو عبور کیا اور سر ہیوگف کے زیر کمان انگریزی دستوں کے خلاف جارحیت کی۔ فوری طور پر ہارڈنگ نے اس دعوے کے ساتھ جنگ کا اعلان کر دیا کہ ستلج کے کنارے کی بائیں جانب والی مہاراجہ دلیپ سنگھ کی املاک ضبط کر کے برطانوی علاقوں سے الحاق کر لیا گیا ہے۔ چار لڑائیاں مڈکی، فیروز شاہ، بڈھے وال اور

علیوال میں لڑی گئیں لیکن اس مسئلہ کا فیصلہ نہ ہوا۔ سوبران میں لال سنگھ اور تیجا سنگھ کی غداری کی وجہ سے، جنہوں نے انگریزوں کو خندقوں کے بارے میں تمام معلومات فراہم کیں تھیں، آخری فیصلہ کن معرکہ ثابت ہوا۔ اس جنگ کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر سکھ فوجیوں کا قتل عام ہوا۔ انگریز فوج نے ستلج پار کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا اور 9 مارچ 1846 کو رنجیت سنگھ کے دارالحکومت میں معاہدہ لاہور پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کے تحت:

- مہاراجہ نے اپنے، اپنے وارثوں اور جانشینوں کے لیے، دریائے ستلج کے جنوب میں واقع علاقوں سے متعلق تمام دعوؤں یا ان سے کسی تعلق ترک کر دیا۔
- مہاراجہ نے دائمی خود مختاری، دوآب میں اپنے تمام قلعے، علاقے اور حقوق، یا دریائے بیاس اور ستلج کے درمیان کا سارا علاقہ کمپنی کے حوالے کر دیا۔
- ایک کروڑ روپے کا نقد ہرجانہ اور خطہ اراضی دونوں صورتوں میں ادا کیا جانا ہے۔
- مہاراجہ نے لاہور کی فوج کے دستوں کو ختم کرنے اور طاقت میں مزید کمی کرنے پر اتفاق کیا۔
- برطانوی فوجیوں کو لاہور کے علاقوں سے گزرنے کے لیے مفت راہداری کی اجازت فراہم کی گئی۔
- نابالغ دلیپ سنگھ کو مہاراجہ کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا، رانی جنداں کو ریاست کا ریجنٹ اور لال سنگھ کو وزیر کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا۔
- سر ہنری لارنس کا نام لاہور میں برطانوی ریسیڈنٹ کے طور پر رکھا گیا تھا۔
- کمپنی کو لاہور ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرنی تھی۔

5.4.5 لارڈ ڈلہوزی: جبری الحاق کا نظریہ (Lord Dalhousie: The Doctrine of Lapse)

ڈلہوزی کی حکم رانی کے آٹھ سال کے دوران، ہر میدان اہم واقعات سے بھرا ہوا ہے۔ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی تعمیر میں ان کا تعاون بہت بڑا تھا۔ انہوں نے ہندوستانی سرزمین پر قبضہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ڈلہوزی کے ہندوستانی علاقوں کے الحاق کو دو طرح سے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک فتح پنجاب، برما اور سکم کے حوالے سے ہے۔ دوسرا خاموشی اور امن سے نظریہ جبری الحاق پر عمل پیرا رہنا جس کے نتیجے میں راجپوت ریاستوں، اودھ، برار وغیرہ کے علاقوں کے الحاق کے لیے ماحول سازگار ہوتا رہا۔

دوسری اینگلو سکھ جنگ (1849): ملتان کے گورنر مولراج کی بغاوت نے ایک سنگین صورتحال پیدا کر دی تھی۔ ملتان کے سپاہیوں کے ہاتھوں دو انگریز افسر وینز اگنیو اور لیفٹیننٹ اینڈرسن کو قتل کر دیا گیا تھا۔ ہزارہ کے سکھ گورنر نے بغاوت کا جھنڈا اٹھا رکھا تھا۔ سکھوں نے افغانستان کے امیر دوست محمد کے پشاور پر قبضہ کر کے فتح حاصل کی۔ پنجابیوں نے مول راج کے جھنڈے تلے بڑی تعداد میں ریلی نکالی اور یہ بغاوت پنجاب میں قومی جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔ 16 نومبر 1848 کو لارڈ گواف کی قیادت میں برطانوی فوجوں نے سرحد عبور کیا۔ رام نگر، چلیانوالہ اور گجرات میں خونریز مقابلے ہوئے۔ سکھ کا زمنہدم ہو گیا۔ ڈلہوزی نے الحاق کے حق میں فیصلہ کیا اور 29 مارچ 1849 کو ایک اعلان کے ذریعے پنجاب کا الحاق کر لیا گیا۔ دلیپ سنگھ کی پنشن ختم کر دی گئی اور انگریزوں نے پنجاب کا انتظام سنبھال لیا۔ سیاسی طور پر انگریزوں

کے لیے یہ الحاق مناسب اور فائدہ مند تھا کیونکہ اس نے برطانوی سرحدوں کو اپنی فطری حدود تک پہنچادیا اور شمال مغرب کے مشہور راستوں کو انگریزوں کی حفاظت میں رکھا۔

اینگلو برمی جنگ (1852): 1826 میں یندابو کے معاہدے کے ذریعے برطانوی تاجروں کی ایک بڑی تعداد برما اور رنگون کے جنوبی ساحل پر آباد ہوگئی تھی۔ یہ برطانوی سوداگر اکثر رنگون کے گورنر کے ہاتھوں ناروا سلوک کی شکایت کرتے تھے۔ دو برطانوی کیپٹن شیپارڈ اور لیوس پر برمن حکومت نے کچھ مخصوص الزامات پر بھاری جرمانہ عائد کیا۔ برطانوی تاجروں نے اس مسئلے کو ڈلہوزی کے علم میں لایا۔ ڈلہوزی نے اس مسئلے کو ایچ.ایم.(H.M.) تک پہنچایا۔ شکایات کے ازالے اور معاوضے کے مطالبے کی بات چیت کے لیے فریگیٹ سے رنگون تک پرامن گفت وشنید کے بہانے جنگی جہازوں کی روانہ کرنا ایک غیر معمولی اقدام تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسئلہ مذاکرات کے بجائے تلوار سے حل کیا جائے گا۔ اس کے مطابق جنگ شروع ہوئی جس میں برمیوں کو شکست ہوئی۔ ڈلہوزی، جس نے مشرقی سمندروں میں امریکہ اور فرانس کی دھمکی آمیز پیش قدمی کی وجہ سے پہلے ہی زیریں برما کو الحاق کرنے کا ارادہ کرلیا تھا، نے 20 دسمبر 1852 کو پیگو کو الحاق کرتے ہوئے ایک اعلان جاری کیا۔

سکم کا الحاق: نیپال اور بھوٹان کے درمیان واقع ایک چھوٹی ریاست سکم کے راجہ پر دو انگریز ڈاکٹروں کے ساتھ بدسلوکی اور قید کرنے کے جرم کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ 1850 میں ریاست کے کچھ دور دراز اضلاع بشمول دارجلنگ کو ڈلہوزی نے ضم کرلیا۔

جبری الحاق پالیسی کے تحت قبضہ: ڈلہوزی کی شبیہ اور ساکھ اسی نظریے کے اطلاق سے وابستہ ہے جس کا مقصد مقامی ریاستوں کو ایک مخصوص حکمت عملی کے تحت الحاق کرنا تھا۔ اگرچہ وہ اس نظریے کے خالق کے طور پر مقبول سمجھے جاتے ہیں، لیکن ہمیں اس فلسفے کی جڑیں کئی مواقع پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹرز کے بیانات میں ملتی ہیں۔ نظریے کی بنیاد یہ تھی کہ چونکہ کمپنی ہندوستان میں سب سے بڑی طاقت تھی، اس لیے کمپنی پر منحصر ریاستوں کی بالادست طاقتوں کی منظوری کے بغیر لے پالک (متبنی) بیٹے کو سلطنت نہیں دے سکتی تھیں اور مؤخرالذکر کو اس کی منظوری کو روکنے کا حق حاصل تھا۔ ڈلہوزی نے اس پالیسی کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاقوں کو مستحکم کرنے میں کسی موقع کو نظرانداز نہیں کیا۔ جبری الحاق کے تصور اور اطلاق کے طریقہ کار کو کئی حلقوں نے شدید تنقید کا نشانہ بنایا، جو برطانوی پالیسیوں کے سامراجی رجحانات کو ظاہر کرتے ہیں۔

- ستارہ پہلی ہندوستانی ریاست تھی جس کا اس نظریہ کے تحت الحاق کیا گیا تھا۔ 1848 میں ستارا اپّا صاحب کے راجہ بغیر وارث (بیٹا) چھوڑے انتقال کرگئے۔ تاہم، اس نے اپنی موت سے کچھ دن پہلے کمپنی کی رضامندی کے بغیر ایک بیٹا گود لیا تھا۔ سر جارج کلرک کی سربراہی میں بمبئی کونسل نے الحاق کے خلاف مشورہ دیا۔ ڈلہوزی نے اسے منحصر ریاست کے طور پر ماننے کا فیصلہ کیا اور ریاست کو الحاق شدہ قرار دے دیا، جسے بعد میں کورٹ آف ڈائریکٹرز نے منظور کرلیا۔
- راجہ نارائن سنگھ، سنبھل پور ریاست کے حکمران، بنا وارث اور بیٹا گود لیے بغیر انتقال کرگئے۔ ریاست کا 1849 میں الحاق کیا گیا۔

- جھانسی کے راجہ، گنگادھر اراؤ، نومبر 1853 میں بغیر کسی مرد وارث کے انتقال کر گئے اور کمپنی کو اس کا وارث قرار دیا گیا۔ گود لیے ہوئے بیٹے کے دعووں کو نظر انداز کر دیا گیا۔
- ناگپور کا راجہ، رگھوجی III، تخت کا وارث بنائے بغیر 1853 میں انتقال کر گیا۔ رانی کے بیٹے کو گود لینے کے دعوے کو ایک طرف رکھ دیا گیا اور ریاست کا الحاق کر دیا گیا۔

اودھ کا الحاق: 1856 میں ڈلہوزی نے حکومتی نظم میں بگاڑ کے بہانے اودھ کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ ڈلہوزی نے بڑی مہارت سے اودھ کے الحاق کی منصوبہ بندی کی۔ اس نے اودھ میں بدانتظامی کے الزامات کی چھان بین کے لیے خصوصی افسر بھیجے، وہاں کی حکومت کی بدحالی کے بارے میں لمبی لمبی رپورٹیں لکھیں اور مملکتی حکام کو اپنے نقطہ نظر پر قائل کر دیا۔ اس طرح، مملکتی حکام کی منظوری کے ساتھ، ڈلہوزی نے اپنے الحاق کی حکمت عملی کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے فوری طور پر کام کیا۔ اس نے نواب واجد علی شاہ سے استعفیٰ پر دستخط کرنے کو کہا اور ان کے انکار پر 13 فروری 1856 کو ایک اعلان کے ذریعے ریاست کا الحاق کر لیا گیا۔

5.4.6 لارڈ لیٹن: دوسری اینگلو افغان جنگ (Lord Lytton: Second Anglo-Afghan War)

لیٹن کا 'ماہرانہ فعال لیکن خاموشی سے عمل پیرا حکمت عملی' پر پورا اعتماد ختم ہو چکا تھا اور اس کا ذہن افغانستان کے لیے ایک پرجوش ''پیش قدمی کی پالیسی'' کی طرف کام کر رہا تھا۔ افغانستان کے امیر شیر علی نے دونوں قوموں کے درمیان پرامن تعلقات کے لیے اپنی تجاویز کو قبول نہیں کیا۔ لٹن نے فوجی کارروائیوں کی تیاریاں شروع کر دیں۔ روسی عناصر نے بحران کو جنم دیا۔ لٹن نے افغانستان پر حملے کا فیصلہ کیا۔ شیر علی کو ایک الٹی میٹم بھیجا گیا، جس میں ''مکمل اور مناسب'' معافی مانگنے اور کابل میں ایک مستقل برطانوی باشندے کو قبول کرنے کے وعدے کا مطالبہ کیا گیا، اس کی تعمیل میں ناکامی پر افغانستان پر حملہ کیا جانا تھا۔ 20 نومبر 1878 کو الٹی میٹم کی میعاد ختم ہونے پر دشمنی شروع ہو گئی۔ 30,000 سے 40,000 کے درمیان برطانوی فوج نے خیبر، پیواڑ اور بولان کے راستے افغانستان میں مارچ کیا۔ تمام مخالفت جلد ہی دم توڑ گئی اور شیر علی روسی ترکستان میں فرار ہو گئے جہاں 21 فروری 1879 کو اس کی موت ہو گئی۔ 26 مئی 1879 کو گندمک میں شیر علی کے بڑے بیٹے یعقوب خان کے ساتھ امن معاہدہ ہوا جس کے تحت یعقوب خان کابل میں مستقل برطانوی باشندوں کا اور ہرات میں ایجنٹوں کے ساتھ قیام پر رضامندی ظاہر کی۔ حکومت ہند نے امیر کو بیرونی جارحیت کے خلاف ہر طرح کی حمایت اور چھ لاکھ روپے کی سالانہ سبسڈی دینے پر اتفاق کیا۔ انگریزوں کی فتح مختصر تھی۔ کابل میں برطانوی باشندوں کو قتل کر دیا گیا۔ چنانچہ برطانوی فوجیوں نے دوسری بار افغانستان کی طرف مارچ کیا اور کابل اور قندھار پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ یعقوب خان نے دستبردار ہو کر برطانوی کیمپ میں پناہ لی۔ لٹن نے افغانستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے منصوبے بنائے۔ اس دوران اس نے استعفیٰ دے دیا اور اس کے بعد رپن اس کا جانشین بنا۔

5.5 ماتحت وفاق کی پالیسی (Policy of Subordinate Union)

1858 میں برطانوی ولی عہد کا براہ راست ذمہ داری قبول کرنے کی وجہ سے برطانیہ اور مقامی ریاستوں کے درمیان بہتر تعلقات

قائم کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ ایک عرصے بعد 1858 میں ملکہ کے اعلان سے انگریزوں کی علاقائی حکمت عملی تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ الحاق کی پالیسی مکمل طور پر ترک کر دی گئی۔ جبری تسلط اور الحاق (Policy of Lapse) کا نظریہ مکمل طور پر ختم کر دیا گیا۔ یہ تبدیلی 1857 کی بغاوت کے دوران شہزادوں کے وفادارانہ رویے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ انگریزوں نے 1857 سے 1835 تک ہندوستانی ریاستوں کے لیے ایک نئی پالیسی، ماتحت وفاق کی پالیسی اپنائی تھی۔ حکومتی بدنظمی پر اگر ضرورت پڑی تو حکمرانوں کو معزول کیا جا سکتا تھا لیکن اس ریاست کو برطانوی حکومت سے ضم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پالیسی کی یہ شکل انگریزوں کی حکمت عملیوں میں سے ایک تھی۔ انہوں نے براہ راست الحاق کے بجائے ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے ریاست کا کنٹرول خود بخود ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ تاہم الحاق کی اس پالیسی نے ہندوستان کی مسلمہ حیثیت کو بدنام کر دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت گورنر جنرل کی منظوری صرف حکومت کے احیاء یا قدرتی وارثوں کی عدم موجودگی کی صورت میں ضروری تھی۔ 1858 کے بعد مغلوں کا تسلط مکمل طور پر بکھر گیا اور برطانوی ولی عہد ہندوستان کا غیر متنازعہ اقتدار بن گیا۔ نتیجے کے طور پر تمام جانشینوں کو باقاعدگی سے براہ راست ولی عہد کی منظوری حاصل کرنی پڑی۔ اس نئی پالیسی کے تحت مقامی شہزادوں نے تخت وراثت سے نہیں بلکہ برطانوی تاج کے تحفے کے طور پر حاصل کیا۔ عام طور پر ہر حکمران کو برطانوی حکومت نے باقاعدہ طور پر تخت پر بٹھایا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ برطانوی حکومت نے بھی نابالغ شہزادوں کی سرپرستی کے طور پر کام کیا اور اس دور میں ریاست کا انتظام سنبھالا۔

ماتحت کی نئی پالیسی کے تحت ہندوستانی شہزادوں کی ولی عہد کے ساتھ مساوی حیثیت کا اصول ختم ہو گیا۔ لارڈ کیننگ نے ہندوستانی مقامی شہزادوں کو جاگیر یا جاگیر دار کہا۔ ولی عہد کی تمام تقریبات اور تمام معاملات میں ہندوستانی شہزادوں کی سلامی کو منظم کرنے کا حق حاصل کر لیا۔ ولی عہد نے ہندوستانی شہزادوں کو اعزازات اور اعزازات سے نوازا۔ حکومت ہند نے ہندوستانی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا حق کا مظاہرہ کیا۔ تاہم انگریزوں کو ان کی اندرونی خود مختاری میں تجاوز کرنے میں خود ہندوستانی شہزادوں نے مزید مدد کی۔ مجموعی طور پر تمام ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں نے متحدہ کردار ادا کیا جس نے برطانیہ کو اپنی پالیسیوں کے مطابق عمل پیرا ہونے پر مجبور کیا۔ نقل و حمل کے جدید ذرائع کی ترقی، مواصلات، عوامی پریس اور تمام ہندوستانی رائے عامہ، برطانوی حکومت کی نئی پالیسی کی طرف متوجہ ہے۔ مزید یہ کہ ریاستوں کو فوجی منصوبوں میں مدد کرنے اور برطانوی فوج کی نقل و حرکت کے لیے تمام سہولیات فراہم کرنے کی ضرورت تھی۔ حکومت ہند نے ہندوستانی ریاستوں کے خارجی اور اندرونی معاملات پر مکمل کنٹرول کا اختیار استعمال کیا۔ اس طرح ہندوستانی حکومت (برطانوی تاج) ہندوستانی ریاستوں کے لیے جنگ، امن یا غیر جانبداری کا اعلان کر سکتی تھی۔ اس نئی پالیسی نے تمام ہندوستانی ریاستوں کو جاگیر دار ریاستوں یا جاگیر داروں میں تبدیل کر دیا، چاہے وہ ماتحت ریاستیں ہوں یا مختلف درجات کے اختیارات سے لطف اندوز ہوں۔

برطانوی ہندوستان میں سیاسی بدامنی کا بڑھنا بھی ماتحت وفاق کی پالیسی کو اپنانے کی ایک وجہ ہے۔ انگریزوں نے اس پالیسی کو انقلابی سرگرمیوں کو دبانے کے لیے ایک آلہ کے طور پر استعمال کیا۔ برطانوی حکومت نے ترقی پسندوں اور انقلابی سرگرمیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستانی شہزادوں کی حمایت سے استفادہ کرنا مناسب سمجھا۔ چنانچہ ماتحت اتحاد کی پالیسی سے انگریزوں اور مقامی شہزادوں نے اپنی حیثیت اور استحقاق کے تحفظ کے لیے ایک مشترکہ محاذ تشکیل دیا۔ انگریزوں کو اب ہندوستانی شہزادوں کی مزاحمت کا خوف نہیں رہا۔ پہلی جنگ

عظیم کے دوران، حکومت ہند اکثر ہندوستانی شہزادوں کو سامراجی دفاع کے معاملات پر مشاورت میں حصہ لینے کے لیے بلاتی تھی۔ بعد میں مونٹیگ ۔چیلمس فورڈ اصلاحات نے شہزادوں کی کونسل کے قیام کی حمایت کی۔اس طرح ہندوستانی شہزادوں نے اجتماعی طور پر سلطنت کے آزاد جزو کی تنظیم نو کی۔

5.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

1757 میں پلاسی کی جنگ میں انگریزوں کی فتح نے بنگال اور بالآخر پورے ہندوستان پر تسلط کی راہ ہموار کی۔ ہندوستان کے امیر ترین صوبے کو لوٹ لیا گیا۔1764 میں بکسر کی جنگ نے پلاسی کی جنگ کی فیصلہ کن کامیابیوں کی تصدیق کر دی تھی۔ بعد کے دنوں میں پلاسی اور بکسر کی لڑائیوں کی کامیابی سے پیدا ہونے والی برطانوی تسلط کی توسیع نے مختلف گورنر جنرلوں کے دور حکومت میں انگریزوں کو مختلف مراحل میں اپنی بالادستی قائم کرنے پر مجبور کیا۔اس باب کے بنیادی نکات، مختلف لڑائیوں اور مختلف جنگوں میں فتح کے ذریعے انگریزوں کا ہندوستان میں دخول کے مطالعہ سے جڑے ہیں۔ جو مقامی ریاستوں جیسے میسور، مراٹھوں، سکھوں اور دیگر کے ساتھ ہوئیں۔اس پورے منظر نامے میں انگریزوں کی طرف سے مختلف پالیسیاں اپنائی گئیں۔

5.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

Policy of Ring Fence	:	رنگ فینس پالیسی کا مطلب یہ تھا کہ برطانوی حکومت کی سرحدوں پر دفاع کو مضبوط کرنے کے لیے غیر برطانوی حکومتیں رکھی جائیں۔
Doctorine of Lapse	:	جبری الحاق کے نظریے کا مطلب یہ تھا کہ، فطری وارثوں کی نہ ہونے پر، زیر تسلط ریاست برطانوی قبضے میں چلی جائے گی. یہ وہ مقام ہے جو برطانوی حکومت نے مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد حاصل کیا تھا، اور انگریز ایسی ریاستوں کے وارثوں کو گود لینے کے حق کو تسلیم نہیں کرتے تھے

5.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

5.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. رنگ فینس کی پالیسی کی وضاحت کریں۔
2. پہلی اینگلو میسور جنگ کا احوال بیان کریں۔
3. پہلی اینگلو-مراٹھا جنگ پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔
4. دوسری اینگلو مراٹھا جنگ کی وضاحت کریں۔

5. تیسری اینگلو میسور جنگ کا جائزہ لیں۔
6. سر جان شور کی غیر جانبداری کی پالیسی پر ایک نوٹ لکھیں۔
7. لارڈ آکلینڈ کی فارورڈ پالیسی کی وضاحت کریں۔
8. تیسری اینگلو مراٹھا جنگ کا احوال دیں۔
9. لارڈ ڈلہوزی کے عقیدہ ختم ہونے کے اصولوں کا جائزہ لیں۔
10. پہلی اینگلو افغان جنگ پر ایک نوٹ لکھیں۔

5.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ذیلی اتحادی نظام کے ضروری اصولوں کا جائزہ لیں، اس سے انگریزوں کو ہندوستان میں اعلیٰ ترین خود مختار اقتدار بنانے میں کس حد تک حصہ لیا؟
2. انگریزوں کی سندھ پالیسی کا جائزہ لیں۔
3. لارڈ کارنوالس کی عدم مداخلت کی پالیسی پر ایک نوٹ لکھیں۔
4. اینگلو سکھ تنازعہ کا محاسبہ کریں۔
5. ماتحت وفاق کی پالیسی بیان کریں۔

5.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. میسور کو انگریزوں نے جنوب میں اپنے مال اور تجارتی مفادات کے لیے خطرہ کیوں سمجھا؟
2. 19ویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں انگریزوں نے مرہٹوں پر اپنا تسلط کیسے قائم کیا؟
3. 'ڈلہوزی نے ہندوستان کا نقشہ اتنی تیز رفتاری سے تبدیل کر دیا، جس کے مماثل کوئی دوسری مہم نہیں ہو سکتی۔' تبصرہ کیجیے۔

5.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Bhargava, M.L., *History of Modern India*, Reliance Publishing House, Delhi, 2002.
2. Chandra, Bipan, *Modern India*, NCERT, New Delhi, 1971.
3. Chaurasia, R.S., *History of Modern India*, *1707 A.D. upto 2000 A.D.*, Atlantic Publishers, Delhi, 2011.
4. Desai, A.R., *Social Background of Indian Nationalism*, Popular Prakashan Ltd., Delhi, 2011.
5. Douglas M. Peers., *India under Colonial Rule*: *1700-1885*, Routledge, London, 2013.

6. Grover. B. L. & Grover. S., *A New Look at Modern Indian History*, S. Chand, 2006.
7. Himanshu Roy & Jawaid Alam (Eds.), *A History of Colonial India*: *1757 to 1947*, Taylor & Francis Limited, London, 2021.
8. Majumdar, R.C., *History of the Freedom Movement in India*, Vol. I., South Asia Books, Delhi, 1988.
9. Sarkar, Sumit, *Modern India*, *1885-1947*, Laxmi Publications, Delhi, 2006.
10. Sharma, L.P., *History of Modern India*, Konark Publishers Pvt. Ltd., Delhi, 1989.

اکائی 6۔ حکمرانی کے اعضا: ساخت اور ادارے: فوج، پولیس اور شہری خدمات

(Apparatus of Rule: Structures and Institutions –
Army, Police, and the Civil Service)

اکائی کے اجزا

6.0		تمہید
6.1		مقاصد
6.2		انتظامی عہدوں کا ارتقا
	6.2.1	لارڈ کارنوالس کی اصلاحات
	6.2.2	لارڈ ویلزلی کی اصلاحات
	6.2.3	چارٹر ایکٹ 1853
	6.2.4	انڈین سول سروس ایکٹ 1861
	6.2.5	آئینی سول سروس
	6.2.6	ایچی سن کمیشن 1886
	6.2.7	قرارداد 1893
	6.2.8	از لنگٹن کمیشن 1912
	6.2.9	مونٹفورڈ اصلاحات 1919
	6.2.10	لی کمیشن 1924
	6.2.11	حکومت ہند ایکٹ، 1935
	6.2.12	برطانوی راج کے تحت سول سروسز کا ارتقاء
6.3		پولیس ڈھانچے کا ارتقاء
	6.3.1	پولیس کمیشن 1860
6.4		انگریزوں کے ماتحت فوج

6.5 برطانوی ہندوستان میں عدلیہ کی ترقی
6.5.1 وارن ہیسٹنگز کے تحت اصلاحات
6.5.2 لارڈ کارنوالس کے تحت اصلاحات
6.5.3 ولیم بینٹنک کے تحت اصلاحات
6.5.4 مابعد تبدیلیاں
6.6 تاج برطانیہ کے تحت ہندوستانی نظم ونسق
6.6.1 صوبائی حکومت
6.6.2 بلدیاتی ادارے
6.6.3 مقامی حکومت کے ارتقائی مراحل
6.7 اکتسابی نتائج
6.8 کلیدی الفاظ
6.9 نمونہ امتحانی سوالات
6.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
6.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
6.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
6.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

6.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان میں برطانوی نظم ونسق کا آغاز 1600ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے ساتھ ہوا۔ 1755 تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی طاقت کے طور پر اپنا وجود اچھی طرح قائم کر لیا تھا۔ 1757ء میں پلاسی کی جنگ کے بعد ہندوستان میں برطانوی طاقت کی بنیاد رکھی گئی۔ 1773ء سے 1858ء تک کے عرصے میں ہندوستان پر کمپنی اور برطانوی پارلیمنٹ کی حکمرانی دیکھی گئی۔ جہاں کمپنی کی حکمرانی جاری رہی وہیں برطانوی پارلیمنٹ نے بھی ہندوستانی نظم ونسق کے معاملات میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا۔ 1857 کے انقلاب نے ایک زبردست تبدیلی کی بنیاد رکھی اور 1858ء سے ہندوستان میں براہ راست برطانوی راج کا آغاز ہوا۔ ہندوستان میں برطانوی راج بڑی حد تک ضلعی نظم ونسق پر مبنی تھا جس میں مرکزی نظم ونسق اور ریاستی سطح کا نظم ونسق اس پر اور اس سے بالاتر تھے۔ محصول اور قانونی نظام اس نظم

ونسق کی بنیاد بن گیا۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی نظم ونسق میں اہم کامیابیوں کو سمجھ سکیں گے۔
- تاج برطانیہ کے تحت نظم ونسق میں اہم تبدیلیوں کی وضاحت کر سکیں گے۔
- برطانوی نظم ونسق کے ڈھانچے اور ادارے کو جان سکیں گے۔
- برطانوی حکمرانی کے اعضاء، ساخت اور اداروں کو سمجھ سکیں گے۔

6.2 انتظامی مراتب عہدہ کا ارتقا (Evolution of the Administrative Apparatus)

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے تجارتی معاملات کے فائدے کے لئے ہندوستان میں سول سروس نظام متعارف کرایا جو ہندوستان میں قبضہ گیر علاقوں کے انتظامی معاملات کی دیکھ بھال کے لئے ایک منظم مشینری میں تبدیل ہو گیا۔ مختلف گورنر س جنرل اور وائسرائے نے ڈھانچے کو موثر اور منظم اور انتظامیہ کو مستحکم اور مضبوط بنانے کے لئے تجربات کیے اور اصلاحات لائے۔

6.2.1 لارڈ کارنوالس کی اصلاحات (Reforms of Lord Cornwallis)

ہندوستان میں 1786-1793 تک ہندوستان کے گورنر جنرل رہے لارڈ کارنوالس نے سب سے پہلے سول خدمات کا آغاز کیا اور اسے منظم کیا۔ اس نے تمام اعلیٰ عہدے انگریزوں اور یورپیوں کے لیے محفوظ کر دیئے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ صرف انگریز اور یورپی ہی پیدائشی طور پر اور تربیت کے لحاظ سے ملک پر حکمرانی کے اہل ہیں۔ ماتحت عہدے ہندوستانیوں کو دیئے جاتے تھے۔ انہوں نے کمپنی کے خدمتگاروں کے لئے نجی تجارت کو ممنوع قرار دیا تھا اور واضح کر دیا کہ اس اصول کی خلاف ورزی کرنے والوں سے سختی سے نمٹا جائے گا۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ انہوں نے ان کی تنخواہوں میں اس قدر اضافہ کیا کہ وہ ہندوستان میں باوقار زندگی گزار سکیں اور کچھ، وطن کو بھی واپس لے جا سکیں۔ ان اصلاحات کا مقصد ملازمین کو کارکرد اور ایماندار بنانا تھا۔ قانون منشور 1793ء نے کارنوالس کی اصلاحات کو مستقل حیثیت دے دی۔ سالانہ 500 برطانوی پونڈ سے زیادہ تنخواہ کا کوئی بھی عہدہ کسی ایسے ملازم کو نہیں دیا جاتا تھا جو ہندوستان میں عہد شدہ نوکر کی حیثیت سے تین سال سے کم رہا ہو۔ ترقی کے معاملات میں سینیاریٹی کے اصول پر سختی سے عمل درآمد کیا جاتا تھا۔

6.2.2 لارڈ ویلزلی کی اصلاحات (Reforms of Lord Wellesley)

لارڈ ویلزلی نے نئے سیول سرونٹس کی تربیت کے لئے کلکتہ کا مشہور کالج قائم کیا۔ وہ انگریز جو سول خدمت گزاروں کی حیثیت سے ہندوستان آتے تھے انہیں تین سال تک ٹریننگ کالج میں تعلیم حاصل کرنی پڑتی تھی اور ہندوستانی زبانوں، قانون اور تاریخ کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔

کورٹ آف ڈائریکٹرز کی عدم منظوری کی وجہ سے اس کالج کو بند کرنا پڑا۔ تاہم خود ڈائریکٹرز نے 1806 میں ہیلی بری میں ایک کالج قائم کیا۔ قانون منشور 1813 میں یہ محکوم کیا گیا کہ ہندوستان میں کسی بھی شخص کو اس وقت تک محرر مقرر نہ کیا جائے گا جب تک وہ ہیلی بری میں چار میعاد تک قیام نہ کرے۔ اس کالج میں داخلہ نامزدگی کے ذریعے ہوتا تھا۔ نامزدگی ڈائریکٹرس کی جانب سے کی جاتی تھی جنہوں نے بورڈ آف کنٹرول کو اس استحقاق میں شامل کیا تھا۔ ہیلی بری کا کالج 1858 تک کام کرتا رہا۔

6.2.3 قانون منشور (The Charter Act of 1853)

قانون منشور 1853 نے کمپنی کے ڈائریکٹرز کی سرپرستی کا سلسلہ ختم کر دیا اور پابند عہد سول سروس کو عزت مآب ملکہ برطانیہ کی تمام رعایا بشمول ہندوستانیوں کے لئے بذریعہ مسابقت عام کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ لارڈ کارنوالس نے اپنی اصلاحات کے معاملہ میں دیانتدارانہ پیش قدمی کی تھی۔ لیکن ان کی اصلاحات کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانیوں کو کمپنی کی خدمت میں اعلیٰ عہدوں سے مکمل طور پر خارج کر دیا گیا تھا۔ یہ اقدام کافی تنقید کا نشانہ بنا۔ سر تھامس منرو کے مطابق، ''فتح کی شائد ہی ایسی کوئی مثال ہو جس میں مقامی باشندوں کو ان کے اپنے ملک میں حکومت کے تمام گوشوں سے مکمل طور سے بے دخل کر دیا گیا ہو جیسا کہ برطانوی ہندوستان میں کیا گیا۔ قانون منشور 1833 میں اس خرابی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور اس کی 87 ویں شق میں کہا گیا ہے: "مذکورہ علاقوں کا کوئی مقامی اور نہ ہی ہز مجسٹی کی رعایا کا کوئی مقامی پیدائشی فرد، صرف اس کے مذہب، جائے پیدائش، نسب، رنگ یا ان میں سے کسی بھی وجہ سے مذکورہ کمپنی کے تحت کسی بھی عہدہ یا ملازمت سے معذول نہیں کیا جائے گا۔" تاہم یہ شق ایک ناقابل عمل تحریر رہی۔ لیکن ہندوستانیوں کی شکایات کو دور کرنے کے اسی طرح کے مقصد کے ساتھ ملکہ وکٹوریہ نے 1858 میں مندرجہ ذیل اعلان کیا: "یہ ہماری مزید خواہش ہیکہ جہاں تک ہو، ہماری رعایا خواہ کسی بھی نسل یا مسلک کی ہو، ہماری خدمت میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ طور پر ہماری خدمت کے لئے قبول کیا جائے گا جس کے لئے وہ تعلیم، قابلیت اور دیانت داری کے اعتبار سے اس ذمہ داری کو انجام دینے کا اہل ہو۔" 1858 میں دیئے گئے عہد کی تکمیل کے لئے 1860 میں وزیر خارجہ برائے ہند کی جانب سے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ کمیٹی نے سفارش کی کہ ہندوستانیوں کو جس ناانصافی سے تکلیف اٹھانی پڑی اسے دور کرنے کے لئے برطانیہ اور ہندوستان دونوں جگہ بیک وقت امتحانات منعقد کیے جائیں۔ تاہم اس کی سفارشات پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

6.2.4 انڈین سول سروس ایکٹ (The Indian Civil Service Act, 1861)

1861ء میں انڈین سول سروس ایکٹ منظور کیا گیا۔ اس ایکٹ کا مقصد ماضی میں 1793ء کے قانون منشور کی شرائط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کئے گئے بعض تقررات کو قانونی شکل دینا اور مشروط سول سروس کے ارکان کے لئے تقریباً تمام اعلیٰ تقررات کو محفوظ بنانا تھا۔ غیر معمولی صورتوں میں حکومت ہند کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ان افراد کا بھی تقرر کرے جو مشروط سول سروس کے رکن نہیں تھے۔ تاہم ان تقررات کی خصوصی وجوہات سے وزیر خارجہ کو ان کی منظوری کے لئے اندرون 12 ماہ مطلع کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ مشروط سول سروس میں ممبران کی بھرتی کے لئے ہر سال لندن میں سول سروس کمشنروں کی نگرانی میں کھلے مسابقتی امتحانات منعقد کیے جاتے تھے۔

1860 میں ان امتحانات میں شرکت کرنے والے امیدواروں کی زیادہ سے زیادہ عمر کم کر کے 22 سال کر دی گئی تھی۔ 1866 میں اسے کم کر کے 21 کر دیا گیا۔ 1878 میں اسے مزید کم کر کے 19 کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کسی بھی ہندوستانی کے لئے ان امتحانات کے لئے مقابلہ کرنا عملی طور پر ناممکن ہو گیا۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ 1870 تک ہندوستان کے صرف ایک باشندے نے مشروط سول سروس کے لئے کامیاب مسابقت کی تھی۔ یہ مشکل صرف عمر کی نہیں تھی بلکہ سماجی، مذہبی اور مالی جیسے دیگر عوامل نے ہندوستانیوں کے لئے مقابلے میں حصہ لینے کے لئے انگلینڈ جانا مشکل بنا دیا تھا۔ لارڈ لارنس نے ہر سال £200 کی مالیت کے نو وظائف قائم کیے جو تین سال تک قابل عمل رہے تاکہ ذہین لیکن غریب ہندوستانی انگلینڈ جا سکیں اور "مختلف متعین پیشوں یا ہندوستان کی سول یا دیگر خدمات کے لیے" تعلیم حاصل کر سکیں۔ گورنر جنرل کے اس اقدام کو وزیر خارجہ برائے ہند ڈیوک آف ارگیل نے ناپسند کیا۔

1870 کے ایکٹ میں ہندوستان کے مقامی باشندوں کی تقرری کے لیے، جنہوں نے سول سروس کا امتحان پاس نہیں کیا تھا، ان کو مشروط سروس کے لیے مخصوص عہدوں پر تقرری فراہم کی گئی تھی "ایسے قواعد کے تابع جو کہ گورنر جنرل ان کونسل کی جانب سے وقتاً فوقتاً تجویز کیے جا سکتے تھے اور موجودہ ممبران کی اکثریت کی رضامندی کے ساتھ سیکرٹری آف اسٹیٹ ان کونسل کے ذریعہ منظور کیا جا سکتا تھا۔ تاہم حکومت ہند کو اس ایکٹ کے تحت قوانین بنانے میں نو سال لگے۔

1878 میں لارڈ لیٹن نے ہندوستانیوں کے لئے مشروط سیول سرویسز پر پابندی لگانے اور "قریبی مقامی سروس" بنانے کا فیصلہ کیا جس میں مخصوص مشروط عہدوں میں سے کچھ کو منتقل کیا جانا تھا۔ تاہم وزیر خارجہ برائے ہند نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ 1885 میں جب انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو اس نے اسی سال ایک قرارداد منظور کی جس میں مشروط سروس میں تقررات کے لیے ہندوستان اور انگلینڈ دونوں میں بیک وقت امتحانات کے انعقاد کا مطالبہ کیا۔

6.2.5 قانونی سول سروس (Statutory Civil Service)

1878-79 میں لارڈ لٹن نے 1870 کے قانون کے مطابق قانونی سول سروس کو متعارف کروایا جس نے گورنر۔ جنرل۔ ان۔ کونسل کو اختیار دیا کہ وہ "بہتر خاندانی اور سماجی حیثیت" کے حامل ہندوستانیوں کو انگلینڈ میں وزیر خارجہ کی جانب سے ہر سال کئے جانے والے تقررات کے چھٹے حصے کی حد تک مشروط سرویس کے لئے محفوظ عہدوں پر تقررات کریں۔ اگرچہ قانونی سول سروس بنائی گئی تھی، لیکن یہ عملی طور پر کامیاب نہیں ہوئی۔ ہندوستانیوں نے شکایت کی کہ امیدواروں کی ذہنی صلاحیت اور اخلاقی بہتری سے زیادہ پیدائشی اور سماجی مقام کو اہمیت دی گئی۔

6.2.6 ایچی سن کمیشن (Aitchison Commission)

لارڈ ڈفرن نے 1886 میں سر چارلس ایچی سن کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ سرکاری خدمات میں اعلیٰ عہدوں پر ہندوستان کے مقامی افراد کے دعووں سے نمٹا جا سکے۔ ایچی سن کمیشن نے ہندوستان اور انگلینڈ میں بیک وقت امتحانات کے انعقاد کے خلاف

رپورٹ دی۔اس نے مشروط اور غیر مشروط خدمات کی اصطلاح کو ختم کرنے کی بھی سفارش کی۔اس نے تمام خدمات کو تین زمروں میں تقسیم کرنے کی سفارش کی-امپیریل سروسز (انگلینڈ میں امتحان کے ساتھ)، صوبائی سروس (ہندوستان میں امتحان کے ساتھ) اور ماتحت سروس (ہندوستان میں امتحان کے ساتھ)۔ تمام اہم ملازمتیں شاہی اور صوبائی سول سروسز کے پاس تھیں۔ کمیشن نے قانونی سول سروس کو ختم کرنے اور عمر کی حد 23 سال کرنے کی سفارش کی۔

6.2.7 1893 کی قرارداد (Resolution of 1893)

1893 میں، انگلینڈ میں ایوان عام نے ایک قرارداد منظور کی جس میں ہندوستان اور انگلینڈ میں بیک وقت امتحان کے انعقاد کی حمایت کی گئی؛ لیکن قرارداد پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ وزیر خارجہ کمبرلے نے کہا، ''یہ ناگزیر ہے کہ سول سروس کے ارکان کی ایک مناسب تعداد ہمیشہ یوروپی ہو۔''

6.2.8 از لنگٹن کمیشن (Islington Commission, 1912)

ہندوستان میں سول سروسز کے مقام کا جائزہ 1912 میں رائل کمیشن آن پبلک سروسز نے لیا تھا۔ کمیشن کے صدر نشین لارڈ از لنگٹن تھے۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ 1915ء میں پیش کی، لیکن یہ جون 1917ء تک شائع نہ ہو سکی۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس رپورٹ پر میرٹ پر غور کیا جاتا، ملک کے حالات بالکل بدل چکے تھے۔اگست 1917 میں، وزیر خارجہ برائے ہند مونٹاگو نے ایوان عام میں اعلان کیا کہ ہندوستان کے تئیں ہز مجسٹی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ نظم ونسق کی ہر شاخ میں ہندوستانیوں کی ساجھے داری کو بڑھانا ہے۔اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ ملک کے نظم ونسق میں ہندوستانیوں کو کافی حصہ دیا جانا چاہیے۔

6.2.9 مونٹ فورڈ کی اصلاحات (Montford Reforms, 1919)

قانون حکومت ہند 1919 (مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات) کا خیال تھا کہ اگر ہندوستان میں ایک ذمہ دار حکومت قائم کرنی ہو تو سرکاری خدمات میں زیادہ سے زیادہ ہندوستانیوں کو ملازمت میں لانا بہتر ہوگا اور اس طرح ہندوستان میں سول سروسز میں درج ذیل اصلاحات پر اثر پڑے گا۔

- ہندوستان اور انگلینڈ دونوں میں بیک وقت امتحانات کا انعقاد۔
- ہندوستان میں شروع میں 33 فیصد (ایک تہائی) اعلیٰ عہدوں پر بھرتی کی جائے اور اس فیصد میں سالانہ ڈیڑھ فیصد اضافہ کیا جائے۔اسی طرح کا فیصد دیگر خدمات میں متعین کیا جائے۔
- بہترین یورپی اور انگریز افسران کو ہندوستان کی طرف راغب کرنے کے مقصد سے، تنخواہ، وظیفہ، چھٹی اور بیرون ملک الاؤنس کی بہتر شرحوں کے لیے سفارشات پیش کی گئیں۔
- ہر سرکاری ملازم کو، جہاں کہیں بھی برسر خدمت ہو، اسے اس کے جائز فرائض کی انجام دہی میں مناسب طریقے سے مدد اور تحفظ فراہم

کیاجائے۔

6.2.10 لی کمیشن (Lee Commission, 1923)

لی کمیشن کا تقرر 1923 میں برطانوی حکومت نے حکومت ہند کی اعلیٰ عوامی خدمات کی نسلی ساخت پر غور کرنے کے لیے کیا تھا۔ چیئرمین لارڈ لی آف فریم تھے، اور اس میں ہندوستانی اور برطانوی ممبران کی تعداد برابر تھی۔ لی کمیشن نے بہت سی سفارشات کیں۔ جہاں تک انڈین سول سروس، انڈین پولیس سروس، انڈین فاریسٹ سروس اور انجینئرس سروس کی آبپاشی شاخ کا تعلق ہے 'جس پر عوامی سلامتی کا اصل انحصار تھا، وزیر خارجہ کو بھرتی جاری رکھنے کی اجازت تھی۔ لی کمیشن نے ہندوستانیت کی شرح میں اضافے کی سفارش کی۔ انڈین سول سروس کے لیے، 10 فیصد اعلیٰ عہدوں کو "مندرج" عہدوں پر صوبائی سروس افسران کی تقرری کے ذریعے پُر کیا جانا تھا۔ مستقبل میں براہ راست بھرتی یورپیوں اور ہندوستانیوں کے درمیان مساوی تعداد کی بنیاد پر ہونی تھی۔ یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ 15 سال کے اندر اندر ہندوستانی سول سروس میں تمام بھرتی ہونے والے ہندوستانی اور نصف یورپی ہوں گے۔ جہاں تک انڈین پولیس سروس کا تعلق ہے، بھرتی 5 یورپی اور 3 ہندوستانیوں کے تناسب سے ہونی تھی۔ لی کمیشن نے سول سروسز کے ممبران کی مراعات اور مراعات میں اضافے کی بھی سفارش کی۔ 1919 کے قانون حکومت ہند نے ہندوستان میں پبلک سروس کمیشن کے قیام کی سہولت فراہم کی تھی، لیکن یہ اب تک قائم نہیں ہو سکی تھی۔ لی کمیشن نے سفارش کی کہ پبلک سروس کمیشن فوری طور پر قائم کیا جائے۔

6.2.11 قانون حکومت ہند (Government of India Act, 1935)

1935 کے قانون میں وفاقی پبلک سروس کمیشن اور صوبائی پبلک سروس کمیشن ان کے دائرہ کار میں قائم کرنے کی سفارش کی گئی۔ گورنر جنرل کو وفاقی شعبے میں ماسوا انڈین سول سروس، انڈین پولیس سروس اور انڈین میڈیکل سروس (سول)، سول سروسز میں تقررات کرنے کا اختیار تھا۔ وہ ان خدمات کی شرائط کے لیے اصول بنانے کا بھی مجاز تھا۔ صوبائی دائرہ کار میں، گورنرس کو سول سروسز میں تقرری کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ انہیں ان خدمات کی شرائط کے لیے قواعد بنانے کی بھی اجازت تھی۔ مقننہ کو بھی سروس کی شرائط کو باقاعدہ کا اختیار دیا گیا تھا۔

سول سروسز کی تنخواہوں، مراعات اور پنشن کو مقننہ کے ووٹ سے مشروط نہیں کیا گیا تھا۔ سبکدوش عہدیداروں اور ان کے زیر کفالت افراد کے وظائف کو ہندوستانی ٹیکس سے اس صورت میں مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا کہ وہ مستقل طور پر ہندوستان سے باہر مقیم ہوں۔ سرکاری ملازمین کو ان کی طرف سے نیک نیتی کے ساتھ اپنے فرض کی انجام دہی میں نیک نیتی سے کئے گئے تمام اقدامات پر دیوانی اور فوجداری کارروائیوں کے خلاف قانونی تحفظ فراہم کیا گیا جبکہ نیک نیتی کا تعین گورنر جنرل پر منحصر تھا۔ گورنر جنرل یا گورنر کی اس کی صوابدید پر اجازت کے بغیر کسی عہدیدار کے خلاف اس کی سرکاری حیثیت میں کیے گئے کاموں کے سلسلے میں کوئی دیوانی یا فوجداری کارروائی نہیں کی جاسکتی تھی۔

6.2.12 برطانوی راج کے تحت سول سروسز کا ارتقاء

(Evolution of the Civil Services under British Rule)

جس طرح ہندوستانیوں کو منظم طریقے سے قانون اور پالیسی ساز اداروں سے باہر رکھا گیا تھا، اسی طرح انہیں پالیسی پر عمل درآمد کے ذمہ دار اداروں سے زیادہ تر باہر رکھا گیا تھا۔ حکومت کے دیگر شعبوں کی طرح سول سروس میں یورپی بالادستی کو یقینی بنایا گیا۔ یہ بنیادی طور پر دو طریقوں سے کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے، اگرچہ ہندوستانیوں نے 1863 کے بعد سے ہی انڈین سول سروسز (ICS) کے صفوں میں حرص اور خواہش مندی سے داخل ہونا شروع کر دیا تھا، لیکن پھر بھی ہندوستانیوں کے لیے سول سروسز میں داخل ہونا انتہائی مشکل تھا۔ آئی سی ایس کے لیے داخلہ کا امتحان صرف انگلش میڈیم میں لندن میں منعقد ہوا تھا، اور مضامین میں کلاسیکی یونانی اور لاطینی سیکھنے شامل تھے۔ مزید یہ کہ امتحان میں شرکت کے لیے زیادہ سے زیادہ عمر 1859 میں 23 سے کم کر کے 1878 میں لٹن کے تحت 19 کر دی گئی۔ دوسری بات یہ کہ اقتدار اور اختیار کے تمام کلیدی عہدوں پر اور جن کو اچھی تنخواہ ملتی تھی ان پر یورپیوں کا قبضہ تھا۔ اگرچہ 1918 کے بعد قوم پرست دباؤ کے تحت ہندوستانی بنانے کا ایک سست عمل ہوا، اہم اور اعلیٰ عہدوں پر یورپیوں کا قبضہ برقرار رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ، ہندوستانیوں کو یہ احساس ہوا کہ سول سروس کے ہندوستانی ہونے سے، کسی بھی طرح سے، ہندوستانی ہاتھوں میں موثر اقتدار منتقل نہیں ہو سکتا ہے۔ سول سروس کے ہندوستانی ارکان اپنے برطانوی آقاؤں کے سامراجی مفادات کی تکمیل کرتے رہے۔

6.3 پولیس کے ڈھانچے کا ارتقاء (Evolution of Police Structure)

قبل از نوآبادیاتی ہندوستان میں، مغلوں اور دیگر مقامی ریاستوں کے تحت حکومتیں، مطلق العنان تھیں، اور ان کے پاس علیحدہ یا رسمی پولیس نظام کا فقدان تھا۔ تاہم، قدیم زمانے سے رات کے وقت دیہاتوں کی حفاظت کے لیے پہرے دار موجود تھے۔ بعد میں، مغل دور حکومت میں فوجدار تھے جنہوں نے امن وامان کو برقرار رکھنے میں مدد کی، اور عامل تھے جو بنیادی طور پر ریونیو اکٹھا کرنے والے تھے لیکن اگر کوئی باغی ہوتا تو ان سے نمٹنا پڑتا پڑتا۔ کوتوال شہروں میں امن وامان کی بحالی کا ذمہ دار تھا۔ 1765 اور 1772 کے درمیان بنگال، بہار اور اڑیسہ میں دوہری حکمرانی کے دوران بھی زمینداروں سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ نظم وضبط کے فرائض اور امن کی برقراری کے ساتھ ساتھ جرائم اور مجرموں سے نمٹنے کے لیے بھی تھانیدار سمیت عملہ کو رکھیں۔ لیکن اکثر اوقات، زمیندار اپنے فرائض سے غفلت برتتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ انہوں نے ڈاکوؤں کے ساتھ ملی بھگت کی اور ان کی لوٹ مار میں ساجھے داری کی۔ 1770ء میں فوجدار اور عاملوں کا ادارہ ختم کر دیا گیا۔ تاہم، 1774 میں، وارن ہیسٹنگز نے فوجداروں کے ادارے کو بحال کیا اور زمینداروں سے کہا کہ وہ ڈاکوؤں، تشدد اور بدامنی کو دبانے میں ان کی مدد کریں۔ 1775 میں، وسیع اضلاع کے بڑے شہروں میں فوجدار تھانے قائم کیے گئے اور کئی چھوٹے پولیس اسٹیشنوں کے ذریعہ ان کی معاونت کی گئی۔ انگریزوں کے دور میں پولیس کے نظام میں مسلسل تبدیلیوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

- 1791: لارڈ کارنوالس نے ضلع کے صدر مستقر میں ایک داروغہ (ہندوستانی) اور ایک سپرنٹنڈنٹ آف پولیس (ایس پی) کے ماتحت ضلع میں تھانوں کے پرانے ہندوستانی نظام (حلقوں) کی بحالی اور اسے جدید بنا کر امن وامان کو برقرار رکھنے کے لیے باقاعدہ پولیس فورس کا

اہتمام کیا۔اس نے زمینداروں کو پولیس کے فرائض سے فارغ کر دیا۔

- 1808: میو نے ہر ڈویژن کے لیے کئی جاسوسوں کی معاونت کے ساتھ ایک ایس پی کا تقرر کیا لیکن ان جاسوسوں نے مقامی لوگوں پر ظلم وزیادتی کی۔
- 1814: کورٹ آف ڈائریکٹرز کے ایک حکم سے داروغوں اور ان کے ماتحتوں کی تقرری سوائے بنگال کے کمپنی کے تمام زیر قبضہ علاقوں میں ختم کر دی گئی۔ بینٹنک (گورنر جنرل، 35-1828) نے ایس پی کا عہدہ ختم کر دیا۔ کلکٹر / مجسٹریٹ کو اب اپنے دائرہ اختیار میں پولیس فورس کی سربراہی کرنی تھی اور ہر ڈویژن میں کمشنر کو ایس پی کے طور پر کام کرنا تھا۔ اس انتظام کا نتیجہ بری طرح سے منظم پولیس فورس کی صورت میں نکلا، جس سے کلکٹر / مجسٹریٹ پر بہت زیادہ بوجھ پڑا۔ پریذیڈنسی ٹاؤنس پہلے تھے جہاں کلکٹر / مجسٹریٹ کی ڈیوٹیاں الگ الگ تھیں۔

6.3.1 پولیس کمیشن 1860 (The Police Commission)

1860 میں برطانوی حکومت نے ایم ایچ عدالتوں کی سربراہی میں ایک پولیس کمیشن مقرر کیا تھا تاکہ ہندوستانی پولیس نظام کا جائزہ لیں اور پولیس نظام کو درست کرنے کے لیے اقدامات تجویز کریں۔ پولیس کمیشن (1860) کی سفارشات نے انڈین پولیس ایکٹ 1861 بنایا۔ کمیشن نے درج ذیل سفارشات کیں۔

- سول کانسٹیبلری کا نظام - موجودہ شکل میں گاؤں کی ترتیب کی برقراری (ایک گاؤں کا چوکیدار جو گاؤں کے ذریعہ برقرار رکھا جاتا ہے) لیکن باقی کانسٹیبلری کے ساتھ براہ راست تعلق میں ہو۔
- انسپکٹر جنرل ایک صوبے کے سربراہ کے طور پر، ڈپٹی انسپکٹر جنرل ایک دائرے کے سربراہ کے طور پر، اور ایس پی ایک ضلع کے سربراہ کے طور پر۔

پولیس دھیرے دھیرے ڈاکو، ٹھگی وغیرہ جیسی مجرمانہ کارروائیوں پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی لیکن عوام سے نمٹنے میں پولیس کا رویہ غیر ہمدردانہ رہا۔ پولیس کو قومی تحریک کو دبانے کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ انگریزوں نے آل انڈیا پولیس نہیں بنائی۔ قانون پولیس، 1861 نے صوبوں میں پولیس کو منظم کرنے کے لیے رہنما اصول پیش کیے۔ پورے ملک میں مراتب عہدہ کا یکساں طور پر آغاز کیا گیا۔ پولیس کمیشن نے صوبوں میں سی آئی ڈی (شعبہ تفتیش جرائم) اور مرکز میں سینٹرل انٹیلی جنس بیورو کے قیام کی بھی سفارش کی۔

6.4 انگریزوں کے ماتحت فوج (Military under the British)

فوج ہندوستان میں کمپنی کی حکمرانی کی ریڑھ کی ہڈی تھی۔ 1857 کی بغاوت سے پہلے، برطانوی کنٹرول میں فوجی دستوں کے دو الگ الگ ڈھانچے تھے، جو ہندوستان میں کارکرد تھے۔ ملکہ کی فوج سے موسوم یونٹ کا پہلا ڈھانچہ ہندوستان میں برسرکار فوجی دستے تھے۔ دوسرا ڈھانچہ کمپنی کے سپاہی تھے وہ برطانویوں کی یورپی رجمنٹوں اور مقامی رجمنٹوں کا مرکب تھی جو ہندوستان سے مقامی طور پر لیکن برطانوی

افسران کے ساتھ بھرتی کیے گئے۔ ملکہ کی فوج ولی عہد کی فوج کا حصہ تھی۔ 1857 کے بعد، فوج کی ایک باضابطہ تنظیم نو کی گئی، جیسا کہ ڈفرن نے دسمبر 1888 میں خبردار کیا تھا، "انگریزوں کو ہمیشہ وہ سبق یاد رکھنا چاہیے جو 30 سال پہلے ایسے خوفناک تجربے سے سیکھے گئے تھے۔"

اس تنظیم نو کے پس پردہ اصل محرک ایک اور بغاوت کو روکنا تھا۔ نیز، ہندوستانی فوج کو خطے کی دیگر سامراجی طاقتوں - روس، جرمنی، فرانس وغیرہ سے سلطنت کی ہندوستانی سرزمین کے دفاع کے لیے استعمال کیا جانا تھا۔ فوج کی ہندوستانی شاخ کو ایشیا اور افریقہ میں توسیع کے لیے استعمال کیا جانا تھا، جبکہ برطانوی حصے کو ہندوستان میں قابض فوج کے طور پر استعمال کیا جانا تھا۔ ابتدا میں، ہندوستانی شاخوں پر یورپی شاخ کا تسلط یقینی بنایا گیا۔ 1859 اور 1879 کے کمیشنوں نے (1857 سے پہلے 14 فیصد کے بالمقابل) ایک تہائی سفید فام فوج کے اصول پر اصرار کیا۔ آخر کار، ہندوستانیوں سے یورپیوں کا تناسب بہ احتیاط بنگال کی فوج میں ایک سے دو اور مدراس اور بمبئی کی فوجوں میں دو سے پانچ تک مقرر کیا گیا۔ اہم جغرافیائی مقامات اور محکموں جیسے توپ خانے، ٹینکوں اور مسلح دستوں پر مضبوط یورپی اجارہ داری برقرار رکھی گئی۔ یہاں تک کہ 1900ء تک ہندوستانیوں کو دی جانے والی رائفلیں بھی کمتر معیار کی تھیں اور دوسری جنگ عظیم تک ہندوستانیوں کو ان ہائی ٹیک محکموں میں اجازت نہیں تھی۔ کسی ہندوستانی کو افسر کے عہدے پر جانے کی اجازت نہیں تھی، اور 1914 تک جس اعلیٰ ترین عہدے پر کوئی ہندوستانی پہنچ سکتا تھا وہ ایک صوبیدار کا تھا (صرف 1918 کے بعد سے کمیشنڈ عہدہ پر ہندوستانیوں کو اجازت دی گئی تھی)۔

ہندوستانی شاخ کو توازن اور مقابلہ یا تقسیم کرو اور حکومت کرو، کی پالیسی کی بنیاد پر دوبارہ منظم کیا گیا۔ 1879 کے آرمی کمیشن نے اس بات پر زور دیا تھا کہ "مناسب یورپی فورس کے زبردست مقابلہ کے بعد مقامی لوگوں کے خلاف مقامی لوگوں کا مقابلہ آتا ہے۔" "فوجی نسل اور غیر فوجی نسل" کا ایک نظریہ کہ جس میں یہ مفروضہ پیش کیا گیا کہ اچھے سپاہی صرف کچھ مخصوص برادریوں سے ہی آ سکتے ہیں، لارڈ رابرٹس کے تحت، جو 1887 سے 1892 تک کمانڈر-ان-چیف تھے، خاص طور پر 1880 کی دہائی کے اواخر میں پروان چڑھا۔ اس کا استعمال سکھوں، گورکھوں اور پٹھانوں کی متعصبانہ بھرتی کی پالیسی کا جواز پیش کرنے کے لیے کیا گیا تھا جنہوں نے بغاوت کو دبانے میں مدد کی تھی اور نسبتاً پسماندہ سماجی گروہ تھے—اس لیے ان کے قوم پرستی سے متاثر ہونے کا امکان کم تھا۔ اودھ، بہار، وسطی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان کے فوجی جنہوں نے بغاوت میں حصہ لیا تھا، انہیں غیر فوجی قرار دیا گیا۔ مزید یہ کہ تمام رجمنٹوں میں ذات پات اور فرقہ وارانہ کمپنیاں متعارف کرائی گئیں اور ہندوستانی رجمنٹوں کو مختلف سماجی و نسلی گروہوں کا مرکب بنایا گیا تاکہ آپس میں توازن برقرار رکھا جا سکے۔ فرقہ وارانہ، ذات پات، قبائلی اور علاقائی شعور کی حوصلہ افزائی کی گئی تاکہ سپاہیوں میں قوم پرستانہ جذبات کی نشوونما کو روکا جا سکے۔ چارلس وڈ، وزیر خارجہ برائے ہند نے کہا، "میں مختلف رجمنٹوں میں ایک مختلف اور حریف جذبہ رکھنا چاہتا ہوں، تاکہ ضرورت پڑنے پر سکھ فوجی ہندوؤں پر، گورکھا دوسروں پر کسی اضطراب کے بغیر گولی چلا سکیں۔" بالآخر اخبارات، جرائد اور قوم پرست اشاعتوں کو ان تک پہنچنے سے روکنے جیسے اقدامات کے ذریعے فوجیوں کو باقی آبادی کی زندگی اور خیالات سے الگ تھلگ کرنے کی سوچی سمجھی کوشش کی گئی۔ مجموعی طور پر، برطانوی ہندوستانی فوج ایک مہنگی فوجی مشین بنی ہوئی تھی۔

6.5 برطانوی ہندوستان میں عدلیہ کی ترقی (Development of Judiciary in British India)

نوآبادیاتی دور کے ہندوستان میں – مغل دور میں یا اس سے بھی پہلے (بشمول قدیم دور) – عدالتی نظام نے مجموعی طور پر نہ تو مناسب طریقہ کار اپنایا اور نہ ہی قانونی عدالتوں کی مناسب تنظیم کی – اعلیٰ سے ادنیٰ تک باقاعدہ درجہ بندی میں نہ ہی عدالتوں کی مناسب تقسیم اس علاقے کے تناسب سے کی گئی تھی جہاں ان کو خدمت انجام دینا تھا۔ ہندوؤں کے درمیان زیادہ تر قانونی چارہ جوئی کا فیصلہ ذات کے بزرگوں یا گاؤں کی پنچایتوں یا زمینداروں نے کیا تھا۔ مسلمانوں کے لیے، عدالتی انتظامیہ کی اکائی قاضی تھی جو مذہبی افراد کا عہدہ تھا اور جس کے دفاتر صوبائی دارالحکومتوں، شہروں اور قصبوں (بڑے دیہات) میں واقع تھے۔ راجاؤں اور بادشاہوں کو انصاف کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا، اور انصاف کی فراہمی کا عمل من مانی ہو سکتا تھا۔ ریکارڈ شدہ عدالتی نظیروں پر مبنی مشترکہ قانون کے نظام کے آغاز کا اندازہ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے 1726 میں مدراس، بمبئی اور کلکتہ میں 'میئر کورٹس' کے قیام سے کیا جا سکتا ہے۔ کمپنی کی، تجارتی کمپنی سے حکمران طاقت میں تبدیلی کے ساتھ، عدالتی نظام کے نئے عناصر نے موجودہ مغل انتظامی اور قانونی نظام کی جگہ لی۔ ان تبدیلیوں کا ایک مختصر سروے ذیل میں دیا گیا ہے۔

6.5.1 وارن ہیسٹنگز کے تحت اصلاحات 1772-1785 (Reforms under Warren Hastings)

- اضلاع میں دیوانی تنازعات کی سماعت کے لیے دیوانی عدالتیں قائم کی گئیں۔ یہ عدالتیں کلکٹر کے تحت رکھی گئی تھیں اور ان میں ہندوؤں کے لیے ہندو قانون اور مسلمانوں کے لیے مسلم قانون قابل اطلاق تھے۔ ضلع دیوانی عدالتوں کی جانب سے اپیل صدر دیوانی عدالت میں رکھی گئی تھی جو سپریم کونسل کے صدر اور دو ممبران کے ماتحت کام کرتی تھی۔
- فوجداری تنازعات کی سماعت کے لیے ضلعی فوجداری عدالتیں قائم کی گئی تھیں اور انہیں قاضیوں اور مفتیوں کی مدد سے ایک ہندوستانی افسر کے ماتحت رکھا گیا تھا۔ یہ عدالتیں کلکٹر کی عمومی نگرانی میں بھی ہوتی تھیں۔ فوجداری عدالتوں میں مسلم قانون کا انتظام کیا گیا تھا۔ سزائے موت اور جائیداد کے حصول کی منظوری مرشد آباد میں صدر نظامت عدالت میں رکھی گئی تھی جس کا سربراہ نائب نظام (ایک ہندوستانی مسلمان) تھا اور چیف قاضی اور مفتی اعظم اس کے معاون تھے۔
- ضابطہ قانون 1773 کے تحت، کلکتہ میں ایک سپریم کورٹ قائم کیا گیا تھا، جو حدود کلکتہ میں تمام برطانوی شہریوں اور ماتحت فیکٹریوں بشمول ہندوستانیوں اور یورپیوں پر مقدمہ چلانے کی اہل تھی۔ وہ حقیقی اور اپیلی دائرہ سماعت رکھتی تھی۔ اکثر و بیشتر سپریم کورٹ کا دائرہ اختیار دوسری عدالتوں کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔

6.5.2 لارڈ کارنوالس کے تحت اصلاحات (Reforms under Lord Cornwallis, 1786-1793)

- ضلعی فوجداری عدالتیں ختم کر دی گئیں اور اس کے بجائے کلکتہ، ڈھاکہ، مرشد آباد اور پٹنہ میں سرکٹ کورٹس قائم کی گئیں۔ ان سرکٹ عدالتوں میں یورپی جج تھے اور انہیں دیوانی اور فوجداری دونوں مقدمات کے لیے اپیل کی عدالتوں کے طور پر کام کرنا تھا۔
- صدر نظامت عدالت کو کلکتہ منتقل کر دیا گیا اور اسے گورنر جنرل اور سپریم کونسل کے ممبران کے ماتحت کر دیا گیا جس کے معاون چیف

قاضی اور مفتی اعظم تھے۔

- ضلعی دیوانی عدالت کو اب ڈسٹرکٹ، سٹی یا ضلعی عدالت کے طور پر نامزد کیا گیا تھا اور اسے ضلعی جج کے تحت رکھا گیا تھا۔ کلکٹر اب صرف محصولاتی انتظامیاں (ریونیو ایڈمنسٹریشن) کا ذمہ دار تھا جس کی کوئی عدالتی ذمہ داری نہیں تھی۔

سول عدالتوں کی ایک درجہ بندی (ہندو اور مسلم دونوں قوانین کے لیے) مندرجہ ذیل طرز پر قائم کی گئی۔

1. بھارتی افسران کے ماتحت منصف کی عدالت۔
2. یورپی جج کے ماتحت رجسٹرار کی عدالت۔
3. ضلع جج کے ماتحت ضلعی کورٹ۔
4. اپیل کی صوبائی عدالتوں کے طور پر چار سرکٹ کورٹس۔
5. کلکتہ میں صدر دیوانی عدالت، اور
6. 5000 پاؤنڈ اور اس سے زیادہ کی اپیلوں کے لیے کنگ-ان-کونسل۔

لارڈ کارنوالس کی اصلاحات کے نتیجے میں جو کہ 'کارنوالس کوڈ' کے نام سے مشہور تھی، عدالتی انتظامیہ میں درج ذیل تبدیلیاں آئیں۔

1. ریونیو اور انصاف کے نظم و نسق کی علیحدگی۔
2. یورپی شہریوں کو بھی دائرہ اختیار میں لایا گیا۔
3. سرکاری اہلکار اپنی سرکاری حیثیت میں کیے گئے اقدامات کے لیے سول عدالتوں کے سامنے جوابدہ تھے۔
4. قانون کی حاکمیت کا اصول قائم ہوا۔

6.5.3 ولیم بینٹنک کے تحت اصلاحات (Reforms under William Bentinck, 1828-1835)

- چار سرکٹ کورٹس کو ختم کر دیا گیا اور ان کے کام کمشنر آف ریونیو اور سرکٹ کی نگرانی میں کلکٹر کو منتقل کر دیے گئے۔
- بالائی صوبوں کے لوگوں کی سہولت کے لیے الہ آباد میں صدر دیوانی عدالت اور ایک صدر نظامت عدالت قائم کی گئی۔
- اب تک، فارسی عدالتوں میں سرکاری زبان تھی۔ اب، درخواست گزار کے پاس فارسی یا مقامی زبان استعمال کرنے کا اختیار تھا، جب کہ سپریم کورٹ میں، انگریزی زبان نے فارسی کی جگہ لے لی تھی۔
- 1833 میں ہندوستانی قوانین کی ضابطہ بندی کے لیے میکالے کے تحت ایک لا کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں، ایک مجموعی ضابطہ دیوانی (1859)، ضابطہ تعزیرات ہند (1860) اور مجموعی ضابطہ تعزیرات (1861) تیار کیا گیا۔

6.5.4 بعد کی تبدیلیاں (Later Developments)

- 1860: یورپی شہری فوجداری مقدمات کے علاوہ کسی خاص مراعات کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے اور کوئی ہندوستانی نژاد جج ان پر مقدمہ

نہیں چلا سکتا تھا۔

- 1865: سپریم کورٹ اور صدر عدالتوں کو کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں تین ہائی کورٹس میں ضم کر دیا گیا۔
- 1935: وفاقی عدالت (1937 میں قائم) کے لئے قانون حکومت ہند محکوم کیا گیا جو حکومتوں کے درمیان تنازعات کو حل کر سکتی تھی اور ہائی کورٹس سے محدود اپیلوں کی سماعت کر سکتی تھی۔

ان اصلاحات کے نتیجے میں انگریزوں کے ماتحت عدلیہ میں کچھ مثبت اور منفی تبدیلیاں آئیں۔

مثبت پہلو:

- قانون کی حکمرانی قائم کی گئی۔
- میثاق شدہ قوانین نے حکمرانوں کے مذہبی اور ذاتی قوانین کی جگہ لے لی۔
- یورپی شہریوں کو بھی دائرہ اختیار سماعت میں لایا گیا، حالانکہ فوجداری مقدمات میں ان کا مقدمہ صرف یورپی جج ہی چلا سکتے تھے۔
- سرکاری ملازمین کو سول عدالتوں کے سامنے جوابدہ بنایا گیا۔

منفی پہلو:

- عدالتی نظام زیادہ سے زیادہ پیچیدہ اور مہنگا ہوتا گیا۔ امراء، نظام میں ہیرا پھیری کر سکتے تھیں۔
- جھوٹے ثبوت، فریب اور فریب کاری کی کافی گنجائش تھی۔
- مقدمہ بازی کو طول دینے کا مطلب انصاف کو ملتوی کرنا ہو گیا۔
- قانونی چارہ جوئی میں اضافے سے عدالتوں پر بوجھ پڑ گیا۔
- یورپی جج ہندوستانی تہذیب اور روایات سے اکثر واقف نہیں ہوتے تھے۔

6.6 تاج برطانیہ کے تحت ہندوستانی نظم ونسق (Indian Administration under the Crown)

قانون بہتر حکومت ہند بابتہ 1858 نے حکمرانی کا اختیار ایسٹ انڈیا کمپنی سے برطانوی ولی عہد کو منتقل کر دیا۔ پیچیدہ حالات میں ملک کے نظم ونسق میں کمپنی کے حدود 1857 کی بغاوت سے کھل کر سامنے آ گئے۔ اس کے علاوہ، زیادہ احتساب نہیں تھا. اب، حکومت کرنے کا اختیار ایک سیکرٹری آف اسٹیٹ کے ذریعے حاصل کیا جانا تھا (پہلے یہ اختیار کمپنی کے ڈائریکٹرز اور بورڈ آف کنٹرول کے پاس تھا)۔ سیکرٹری آف اسٹیٹ برطانوی کابینہ کا رکن ہوتا تھا، اور اسے 15 رکنی کونسل کی مدد حاصل تھی۔ وہ برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ تھا۔ تمام اقدامات اور حتمی فیصلے سیکرٹری کے پاس تھے اور کونسل کی نوعیت صرف مشاورتی تھی۔ (اس طرح پیٹ کا متعارف کردہ دوہرا نظام انڈیا ایکٹ 1784 ختم ہو گیا۔) اس کے علاوہ، ہندوستان پر حتمی طاقت پارلیمنٹ کے پاس رہی۔ ہندوستان میں حکومت پہلے کی طرح گورنر جنرل کے ذریعے چلائی جانی تھی جس کے مرتبے میں، اگرچہ اختیار میں نہیں، وائسرائے کے نئے لقب سے اضافہ کر دیا گیا۔ وائسرائے کو ایک مجلس

عاملہ سے مدد حاصل تھی جس کے اراکین مختلف محکموں کے سربراہوں کے ساتھ ساتھ وائسرائے کے سرکاری مشیروں کے طور پر کام کرتے تھے۔لندن میں مقیم سیکرٹری آف اسٹیٹ کے ہاتھ میں مرکزی عہدہ کے ارتکاز نے ایک طرف وائسرائے کو دھیرے دھیرے ایک ماتحتی کا درجہ دیااور ہندوستانی رائے عامہ کو حکومتی پالیسی سازی سے مزید دور کر دیا۔دوسری طرف، یہ ہندوستان میں حکومتی پالیسی پر برطانوی صنعت کاروں، تاجروں اور بینکاروں کے اثر ورسوخ میں اضافے کا تھا۔اس نے ہندوستانی انتظامیہ کو 1858 سے پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ رجعت پسند بنادیا۔

انڈین کونسلز ایکٹ 1861 کے ذریعے، پانچویں رکن، جو ایک قانون داں ہونا تھا، کو وائسرائے کی عاملہ کونسل میں شامل کیا گیا۔ قانون سازی کے مقاصد کے لیے، وائسرائے چھ سے بارہ اضافی اراکین کو شامل کر سکتا تھا، جن میں سے کم از کم نصف غیر سرکاری ہونا چاہیے تھا جو کہ ہندوستانی یا انگریز ہو سکتے تھے۔اس طرح تشکیل دی گئی قانون ساز کونسل کے پاس کوئی حقیقی اختیارات نہیں تھے اور وہ محض مشاورتی نوعیت کی تھی۔اس کی کمزوریاں درج ذیل تھیں۔

- یہ حکومت کی سابقہ منظوری کے بغیر اہم معاملات اور بالخصوص مالی معاملات پر بالکل بھی بات نہیں کر سکتے تھے۔
- اس کا بجٹ پر کوئی کنٹرول نہیں تھا۔
- یہ عاملہ کے اقدام پر بحث نہیں کر سکتے تھے۔
- بل کی حتمی منظوری کے لیے وائسرائے کی منظوری درکار تھی۔
- وائسرائے کی منظوری کے بعد بھی سیکرٹری آف اسٹیٹ کسی قانون سازی کو مسترد کر سکتا تھا۔
- غیر سرکاری طور پر وابستہ ہندوستانی صرف ممتاز طبقے شہزادے، جاگیردار، دیوان وغیرہ کے ممبر تھے اور ہندوستانی عوام کے نمائندے نہیں تھے۔
- وائسرائے ایمرجنسی کی صورت میں (6 ماہ کی مدت کے لئے) حکمنامے جاری کر سکتا تھا۔

قانون ساز کونسل کا واحد اہم کام سرکاری اقدامات کی توثیق کرنا اور انہیں کسی قانون ساز ادارے کے ذریعہ منظور شدہ شکل دینا تھا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت پہلے کی طرح ایک اجنبی آمریت بنی ہوئی تھی۔

6.6.1 صوبائی حکومت (Provincial Government)

انڈین کونسلز ایکٹ، 1861 نے قانون سازی کے اختیارات مدراس اور بمبئی کے صوبوں کو واپس کر دیے جو 1833 میں چھین لیے گئے تھے۔بعد میں دیگر صوبوں میں قانون ساز کونسلیں قائم کی گئیں۔بمبئی، مدراس اور کلکتہ کی تین صدارتوں کو دوسرے صوبوں کے مقابلے زیادہ حقوق اور اختیارات حاصل تھے۔صدارتوں کا انتظام ایک گورنر اور اس کی تین رکنی کونسل کے ذمے تھا جنہیں ولی عہد نے مقرر کیا تھا، جب کہ دوسرے صوبوں کا انتظام گورنر جنرل کے تقرر کردہ لیفٹیننٹ گورنرز اور چیف کمشنرز کرتے تھے۔

اگلی دہائیوں میں، مالیاتی عدم ارتکاز کی طرف کچھ اقدامات کیے گئے، لیکن یہ زیادہ تر انتظامی تنظیم نو کی نوعیت کے تھے جن کا مقصد محصولات میں اضافہ اور اخراجات کو کم کرنا تھا اور یہ کسی بھی طرح سے صوبائی خود مختاری کی طرف پیش رفت کی نشاندہی نہیں کرتے تھے۔ صوبائی حکومتوں کو پولیس، جیلوں، تعلیم، طبّی خدمات اور سڑکوں کے انتظام کے لیے مرکزی محصولات میں سے مقررہ رقم کی فراہمی 1870 میں لارڈ میو کے ذریعے مرکزی اور صوبائی مالیات کی تقسیم کی سمت میں پہلا قدم تھا۔ اب صوبائی حکومتوں سے کہا گیا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق ان خدمات کا انتظام کریں۔ لارڈ لٹن نے 1877 میں اخراجات کے بعض دیگر مدات جیسے لینڈ ریونیو، ایکسائز، جنرل ایڈمنسٹریشن اور قانون و انصاف کو صوبوں کو منتقل کیا تھا۔ اس کے علاوہ، ایک صوبائی حکومت کو اس صوبے میں حاصل ہونے والی آمدنی کا ایک مقررہ حصہ اسٹامپس، ایکسائز اور انکم ٹیکس جیسے ذرائع سے وصول کرنا تھا۔ 1882 میں، آمدنی کے تمام ذرائع کو تین زمروں میں تقسیم کر دیا گیا- عام (مکمل طور پر مرکز کے لئے)، صوبائی (مکمل طور پر صوبوں کے لئے) اور وہ جو مرکز اور صوبوں کے درمیان تقسیم کیے جائیں گے۔ اس کے باوجود مرکزی حکومت بالادست رہی اور صوبوں پر تفصیلی کنٹرول برقرار رکھا۔ یہ ناگزیر تھا کیونکہ مرکزی اور صوبائی حکومتیں مکمل طور پر سیکرٹری آف اسٹیٹ اور برطانوی حکومت کے ماتحت تھیں۔

6.6.2 بلدیاتی ادارے (Municipal Bodies)

بلدی اور ضلعی بورڈز کے ذریعے مقامی حکومت کو فروغ دے کر انتظامیہ کی تشکیل نو کا فیصلہ کیا گیا جو کہ مقامی محاصل سے مالی اعانت کے ذریعہ مقامی خدمات جیسے تعلیم، صحت، صفائی، پانی کی فراہمی، سڑکیں اور دیگر بنیادی سہولیات فراہم کرے گی۔ بہت سے عوامل تھے جن کے سبب مقامی اداروں کا قیام ہندوستان میں برطانوی حکومت کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔

1. زیادہ مرکزیت کی وجہ سے حکومت کو درپیش مالی مشکلات نے غیر مرکوزیت کو ناگزیر بنا دیا۔
2. یہ ضروری ہو گیا کہ یورپ کے ساتھ ہندوستان کے بڑھتے ہوئے اقتصادی رابطوں کو دیکھتے ہوئے یورپ میں شہری سہولیات کی جدید ترقی کو ہندوستان میں منتقل کیا جائے۔
3. اس کے ایجنڈے میں بنیادی سہولیات میں بہتری قوم پرستی کی بڑھتی ہوئی لہر کا نتیجہ تھی۔
4. برطانوی پالیسی سازوں کی ایک جماعت نے ہندوستانیوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی بیداری کا جائزہ لینے کے لئے ہندوستان میں برطانوی بالادستی کو مجروح کیے بغیر کسی نہ کسی شکل میں انتظامیہ کے ساتھ ہندوستانیوں کی وابستگی کو ایک ذریعہ سمجھا۔
5. مقامی ٹیکسوں کا مقامی فلاح و بہبود کے لیے استعمال پہلے سے بوجھ تلے دبے خزانے سے نکاسی یا طبقہ امراء پر محصول عائد کرنے میں برطانوی تذبذب کے ازالہ کے لئے معاون ہو سکتا تھا۔

6.6.3 مقامی حکومت کے ارتقاء کے مراحل (Stages in the Evolution of Local Government)

مقامی حکومت کے ارتقاء کے اہم مراحل کی نشاندہی مندرجہ ذیل طور پر کی جاسکتی ہے۔

1864اور1868 کے درمیان

بلدیاتی ادارے پہلی مرتبہ اس دور میں بنائے گئے تھے لیکن زیادہ تر معاملات میں نامزد اراکین پر مشتمل ہوتے تھے اور ان کی سربراہی ضلعی مجسٹریٹ کرتے تھے۔اس طرح،ان کو اضافی ٹیکس وصولی کے وسیلے سے زیادہ نہیں سمجھا گیا۔

میو کی قرارداد1870

مالیاتی غیر مرکوزیت ایک قانونی منتقلی تھی جس کو شروعات انڈین کونسلز ایکٹ 1861 کے ذریعے کی گئی۔ شاہی حکومت کی طرف سے سالانہ گرانٹ کے علاوہ، صوبائی حکومتوں کو اپنے بجٹ میں توازن قائم کرنے کے لیے مقامی ٹیکسوں کا سہارا لینے کا اختیار دیا گیا تھا۔ یہ انتظامیہ کے بعض محکموں جیسے طبّی خدمات، تعلیم اور سڑکوں کی صوبائی حکومتوں کے کنٹرول میں منتقلی کے تناظر میں کیا گیا۔ یہ مقامی مالیات کا آغاز تھا۔ میو کی قرارداد میں اس بات پر زور دیا گیا کہ، "تعلیم، صفائی، طبّی امداد اور مقامی عوامی کاموں کے لیے وقف فنڈز کے کامیاب نظم کے لیے مقامی دلچسپی، نگرانی اور دیکھ بھال ضروری ہے۔ "مختلف صوبائی حکومتوں جیسے بنگال، مدراس، شمال مغربی صوبہ، پنجاب، نے مذکورہ پالیسی کو نافذ کرنے کے لیے میونسپل ایکٹ پاس کیا۔

رپن کی قرارداد1882

رپن کی حکومت نے صوبائی حکومتوں سے خواہش کی کہ وہ بلدیاتی اداروں کے معاملے میں مالی غیر مرکوزیت کا وہی اصول لاگو کریں جو لارڈ میو کی حکومت نے ان کے لیے شروع کیا تھا۔ ان کی شراکت کے لیے لارڈ رپن کو ہندوستان میں مقامی خود مختار حکومتوں (Self Government) کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ قرارداد کے اہم نکات درج ذیل تھے۔

- مقامی اداروں کے فروغ کی وکالت کی گئی تاکہ انتظامیہ کو بہتر بنایا جاسکے اور اسے سیاسی اور مقبول تعلیم کا ایک وسیلہ بنایا جاسکے۔
- شہری اور دیہی بلدیاتی اداروں کے ذریعے مقامی امور کے انتظام کی پالیسی جن پر مخصوص فرائض عائد کیے گئے ہیں اور محصولات کے مناسب ذرائع دیے گئے ہیں۔
- ان اداروں میں غیر اہلکاروں (Non-officials) کی اکثریت ہوگی، اگر عہدیداروں کا خیال ہو کہ انتخابات کروانا ممکن ہے تو کس کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔
- ان اداروں کے چیئرپرسن کے طور پر کام کرنے کے لیے غیر اہلکار (Non-officials)
- سرکاری مداخلت کو کم سے کم کیا جائے اور اسے بلدیاتی اداروں کے کاموں پر نظر ثانی اور جانچ پڑتال کے لیے استعمال کیا جائے، نہ کہ پالیسیوں کو اوپر سے ٹھونسنے کے لیے۔
- بعض معاملات میں باضابطہ انتظامی منظوری کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے قرضوں میں اضافہ، میونسپل پراپرٹی کو الگ کرنا، نئے ٹیکسوں کا نفاذ، مقررہ رقم سے زیادہ لاگت کے کام شروع کرنا، قواعد وضوابط وضع کرنا وغیرہ۔

اس قرارداد کی پیروی میں 1883 اور 1885 کے درمیان بہت سے ایکٹ پاس کیے گئے جنھوں نے ہندوستان میں بلدیاتی اداروں کے آئین، اختیارات اور افعال کو بہت زیادہ تبدیل کر دیا۔ لیکن، موثر مقامی خود مختار اداروں کا دور ابھی تک ایک ادھورا خواب تھا۔ موجودہ بلدیاتی اداروں میں درج ذیل مختلف خامیاں تھیں۔

- تمام ضلعی بورڈز اور کئی میونسپلٹیوں میں منتخب اراکین اقلیت میں تھے۔
- فرنچائز بہت محدود تھا۔
- ڈسٹرکٹ بورڈز کی سربراہی ضلعی عہدیداروں کے ہاتھ میں ہی رہی، تاہم غیر اہلکار بتدریج میونسپلٹیوں کی سربراہی کرنے لگے۔
- حکومت نے سخت کنٹرول برقرار رکھا، اور وہ اپنی مرضی سے ان اداروں کو معطل یا ختم کر سکتی تھی۔

افسر شاہی، نے حقیقت میں، وائسرائے کے آزاد خیال خیالات سے اتفاق نہیں کیا اور وہ یہ سوچتی تھی کہ ہندوستانی خود مختار حکومت (Self-Government) کے لیے نااہل ہیں۔ 19 ویں صدی کے اختتامی عشرے سامراج سے عبارت تھے، اور اس تصور کے سب سے بڑے نقیب لارڈ کرزن نے در حقیقت مقامی اداروں پر سرکاری کنٹرول بڑھانے کے لیے اقدامات کیے تھے۔

رائل کمیشن آن ڈیسینٹر لائزیشن (1908)

مالی وسائل کی کمی کو بلدیاتی اداروں کے موثر کام کاج میں بڑی رکاوٹ قرار دیتے ہوئے کمیشن نے درج ذیل سفارشات پیش کیں۔

1. اس نے اس بات پر زور دیا کہ گاؤں کی پنچایتوں کو چھوٹے چھوٹے معاملات میں عدالتی دائرہ اختیار، گاؤں کے چھوٹے کاموں، گاؤں کے اسکولوں، چھوٹے ایندھن اور چارے کے ذخائر وغیرہ پر ہونے والے اخراجات جیسے مزید اختیارات سونپے جائیں۔ پنچایتوں کو آمدنی کے مناسب ذرائع فراہم کیے جائیں۔
2. اس نے سب ڈسٹرکٹ بورڈز کی اہمیت پر زور دیا کہ ہر تعلقہ یا تحصیل میں سب ڈسٹرکٹ بورڈز اور ڈسٹرکٹ بورڈز کے لیے الگ الگ فرائض اور آمدنی کے الگ ذرائع ہوں گے۔
3. اس نے ٹیکس لگانے کے ان کے اختیارات پر موجودہ پابندیوں کو واپس لینے پر زور دیا، اور اس کے علاوہ، بڑے منصوبوں کو شروع کرنے کے علاوہ صوبائی حکومتوں کی طرف سے ریگولر گرانٹ ان ایڈ کو روکنے پر زور دیا۔
4. میونسپلٹیز پرائمری اور اگر چاہیں تو مڈل مقامی اسکولوں میں تعلیم کی ذمہ داری لے سکتی ہیں، بصورت دیگر حکومت انھیں ثانوی تعلیم، اسپتالوں، ریلیف، پولیس، ویٹرنری کاموں وغیرہ کے حوالے سے کسی بھی قسم کی ذمہ داریوں سے آزاد کرے۔

حکومت ہند کی قرارداد 1915

اس قرارداد میں ڈی سینٹر لائزیشن کمیشن کی سفارشات کے بارے میں سرکاری آراء موجود تھیں لیکن زیادہ تر سفارشات کاغذ پر ہی رہیں اور بلدیاتی اداروں کی حالت وہی رہی جو لارڈ رپن نے چھوڑی تھی۔

مئی 1918 کی قرارداد

اس قرارداد میں 20 اگست 1917 کے اعلان کی روشنی میں مقامی خود مختار حکومت کے پورے سوال کا جائزہ لیا گیا، جس میں کہا گیا تھا کہ آئینی پیش رفت کی مستقبل کی سمت ہندوستان کے لوگوں کو ذمہ دار حکومت کی فراہمی کی طرف ہے اور اس آئیڈیل کو حقیقت میں بدلنے کی جانب پہلا قدم ہے جو مقامی خود مختاری کے دائرے میں ہونا تھا۔ قرارداد میں تجویز کیا گیا کہ بلدیاتی اداروں کو عوام کے حقیقی نمائندے کے طور پر بنایا جائے نہ کہ برائے نام اختیارات دیے جائیں۔

دہری حکومت

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1919 کے ذریعے مقبول وزارتی کنٹرول کے تحت مقامی خود مختار حکومت کو ایک 'منتقل شدہ' موضوع بنایا گیا، اور ہر صوبے کو صوبائی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق مقامی خود مختار اداروں کو ترقی دینے کی اجازت دی گئی تھی۔ لیکن، چونکہ فنانس ایگزیکٹو کونسلر کے تحت ایک 'محفوظ' موضوع تھا، اس لیے ہندوستانی وزراء فنڈز کی کمی کی وجہ سے مقامی خود مختاری کے دائرے میں زیادہ کام نہیں کر سکے۔ سائمن کمیشن (مئی 1930) نے یوپی، بنگال اور مدراس کے علاوہ گاؤں کی پنچایتوں کی ترقی کے فقدان کی نشاندہی کی۔ کمیشن نے بلدیاتی اداروں پر صوبائی کنٹرول بڑھانے سے پیچھے ہٹنے کی تجویز دی تاکہ کارکردگی کو بڑھایا جا سکے۔ کمیشن نے مقامی ٹیکس لگانے میں منتخب اراکین کی ہچکچاہٹ پر بھی منفی تبصرہ کیا اور کہا کہ عام طور پر 1919 کی اصلاحات کے آغاز کے بعد سے بلدیاتی اداروں کے مالیات کا انتظام بگڑ گیا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1935 اور اس کے بعد

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1935 کے ذریعے حاصل ہونے والی صوبائی خود مختاری نے ہندوستان میں مقامی خود مختار اداروں کی ترقی کو مزید تحریک دی۔ وزات فنانس کنٹرول میں ہونے کی وجہ سے اب بلدیاتی اداروں کی ترقی کے لیے فنڈز دستیاب کرائے جا سکتے تھے۔ مزید یہ کہ صوبائی اور مقامی مالیات کے درمیان ٹیکس کی حد بندی جو 1919 کی اصلاحات کے بعد سے رائج تھی اسے ختم کر دیا گیا۔ صوبوں میں بلدیاتی اداروں کو زیادہ اختیارات دینے کے لیے نئے ایکٹ پاس کیے گئے۔ تاہم، مالی وسائل اور مقامی اداروں کے ٹیکس لگانے کی طاقت کم و بیش اسی سطح پر رہی جس طرح رپن کے دور میں تھی۔ بلکہ، 1935 کے بعد، تجارت اور میونسپل پراپرٹی پر ٹرمینل ٹیکس لگانے یا بڑھانے کے لیے مقامی اداروں کے اختیارات پر کچھ نئی پابندیاں لگائی گئیں۔ ایسا لگتا ہے کہ صوبائی حکومتوں نے مقامی اداروں کو ٹیکس لگانے کے وسیع اختیارات دینے کی لبرل پالیسی کو نظر انداز کر دیا ہے جیسا کہ ڈی سینٹرلائزیشن کمیشن (1908) نے تجویز کیا تھا۔

6.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ہندوستانی انتظامی ڈھانچہ بنیادی طور پر برطانوی حکمرانی کی میراث ہے۔ انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں مختلف انتظامی ڈھانچے اور ادارے قائم کیے اور اسی انتظامی نظام کو آزادی کے بعد بھی وقت کے تقاضوں کے مطابق کچھ تبدیلیوں کے ساتھ برقرار رکھا گیا۔ برطانوی

انتظامی نظام کی اہم خصوصیات، جیسے پارلیمانی طرز حکومت، وفاقی ڈھانچہ، ریاستوں میں گورنر، سیکرٹریٹ نظام، مرکزی اور ریاستی انتظامیہ، مقامی حکومت، آل انڈیا سروسز، کام کا طریقہ کار، قانون کی حکمرانی، پولیس انتظامیہ، ریونیو ایڈمنسٹریشن وغیرہ موجودہ ہندوستانی انتظامی نظام کے اہم مرکز بنے ہوئے ہیں۔

- برطانوی سامراجیت کو نئے انتظامی ڈانچے نے کس طرح مستحکم کیا۔
- ہندوستان کے روایتی حکمرانی نظام میں کیا تبدیلیاں لائی گئی۔
- برطانوی سامراجیت اور ذات پات اور نسلی امتیاز۔

6.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

سول سوسز	:	عوامی خدمات کے لیے امتحانات کے ذریعے تقرری
پولیس	:	شہری امن وامان اور نظم وضبط کے لیے ذمے دار افراد
سپریم کورٹ	:	عدالت عظمیٰ
ہائی کورٹ	:	عدالت عالیہ

6.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

6.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. 1861 کے انڈین سول سروس ایکٹ کی تفصیلات بتائیں۔
2. آئینی سول سروس سے مراد کیا ہے؟
3. 1886 کے ایچی سن کمیشن پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔
4. 1923 کے لی کمیشن کی وضاحت کریں۔
5. 1860 کے پولیس کمیشن کی سفارشات کا جائزہ لیں۔
6. ہندوستانی عدلیہ کے حوالے سے لارڈ کارنوالس کی اصلاحات پر ایک نوٹ لکھیں۔
7. بلدیاتی اداروں سے آپ کی کیا مراد ہے؟
8. میو کی 1870 کی قرارداد پر ایک نوٹ لکھیں۔
9. لارڈ رپن کو ہندوستان میں مقامی خود حکومت کا باوا آدم کیوں کہا جاتا ہے؟
10. 1908 کے شاہی کمیشن برائے غیر مرکوزیت پر ایک نوٹ لکھیں۔

6.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. برطانوی راج کے تحت سول سروسز کے ارتقاء کا جائزہ لیں۔
2. وارن ہیسٹنگز کی طرف سے کیا عدالتی اصلاحات لائی گئیں؟
3. ہندوستان میں مقامی حکومت کے حوالے سے رپن کی 1882 کی قرارداد کیا تھی؟
4. برٹش انڈیا میں پولیس نظام کے ارتقاء کا جائزہ لیں۔
5. ہندوستانی انتظامیہ میں برطانوی راج کی وراثت کا جائزہ لیں۔

6.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. انگریزوں کے ماتحت فوجی انتظامیہ کو تفصیل سے بیان کریں۔
2. ہندوستان میں مقامی حکومت کے ارتقاء کے مختلف مراحل کو بتائیں۔
3. 1857 کی بغاوت کے بعد ہندوستان میں لائی گئی انتظامی تبدیلیوں پر ایک مضمون لکھیں۔

6.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Bernard S. Cohn, *The Development and Impact of British Administration in India*, Indian Institute of Public Administration, New Delhi, 1961.
2. Dayal Dass, *Charles Metcalfe and British Administration in India*, Criterion Publications, 1988.
3. George Anderson, *British Administration in India*, Gian Publishing House, Delhi, 1988.
4. Hoshiar Singh, *Indian Administration*, Pearson, Delhi, 2011.
5. Siuli Sarkar, *Public Administration in India*, PHI Learning Pvt. Ltd, Delhi, 2018.
6. S.R. Maheshwari, *Indian Administration*, Orient Longman Private Limited, Hyderabad, 2001.
7. Padma Ramachandran, *Public Administration in India*, National Book Trust, New Delhi, 1995.
8. Ramesh Kumar Arora and Rajni Goyal, *Indian Public Administration*: *Institutions and Issues*, Wishwa Prakashan, Delhi, 1995.
9. Sri Ram Sharma, *Public Administration in India*, S. Nagin & Co., New Delhi, 1965.
10. Upasana Singh, *British Administration in India*, Anmol Publications Pvt. Limited, New Delhi, 1992.

اکائی 7۔رجواڑہ ریاستوں سے تعلقات

(Relations with Princely States)

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 برطانوی ہند اور رجواڑہ ریاستوں کے درمیان تعلقات

7.2.1 جدوجہد برائے یکسانیت

7.2.2 حصار بندی کی پالیسی

7.2.3 ماتحتوں کو علاحدہ رکھنے کی پالیسی

7.2.4 ماتحت وفاق کی پالیسی

7.2.5 ماتحت اتحاد پالیسی

7.2.6 یکساں وفاقی پالیسی

7.3 راجواڑہ ریاستوں کی نوعیت: ایک بحث

7.4 رجواڑہ ریاستوں کی حکومت ہند میں شمولیت

7.5 اکتسابی نتائج

7.6 کلیدی الفاظ

7.7 نمونہ امتحانی سوالات

7.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

7.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

7.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

7.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

7.0 تمہید(Introduction)

رجواڑہ/شاہی ریاستیں ایسی دیسی یا مقامی ریاستیں تھیں جو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد انیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر ہند میں وجود میں آگئیں اور وقت گزنے کے ساتھ ساتھ نظام یہ ریاستیں عہد معاونت (Subsidiary Alliance) کے مطابق بڑھتے ہوئے انگریز اقتدار کے مطیع ہو گئیں۔ان ریاستوں کے حکمران ہندوستان کے مقامی راجا تھے جو اپنی پرانی قائم شدہ روائتوں اور ماتحت امدادی معاہدہ کے عائد کیے ہوگئے اصولوں کے مطابق ان ریاستوں پر حکومت کرتے تھے۔ *Imperial Gazetteer of India* کے مطابق ہندوستان میں 562 ریاستیں موجود تھیں جو نوآبادیاتی حکمرانوں کی متعدد اور مسلسل چڑھائیاں اور حملے برداشت کر رہی تھیں۔ان رجواڑہ ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست حیدرآباد تھی اور سب سے چھوٹی ریاست بلباری تھی جس میں صرف 27 لوگ رہتے تھے۔ بی۔ایل۔ گرور کہتے ہیں کہ اس بات کا اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً 202 رجواڑہ ریاستیں ایسی تھیں جن میں سے ہر ایک کا رقبہ دس مربع میل کے برابر تھا، 139 ریاستیں ایسی تھیں جن میں سے ہر ایک کا رقبہ پانچ مربع میل کے برابر تھا اور 70 ریاستیں ایسی تھیں جن کا رقبہ ایک مربع میل سے زیادہ نہیں تھا۔ کچھ مستثنیات کے بغیر یہ رجواڑہ ریاستیں ناقابل رسا یا زرخیز نہیں تھیں۔کیونکہ برطانوی حکمرانوں نے سیاسی جعلسازی سے ان علاقوں پر قبضہ جمایا تھا جو خاص طور پر زرخیز، سڑکوں، ساحلی علاقوں اور دریائوں کی وجہ سے قابل رسا اور اقتصادی وسائل کے لحاظ سے خوشحال تھے۔ برطانوی ہند نے اپنی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان ریاستوں کی تخلیق وجود میں لائی تھی۔ان ریاستوں پر برطانوی ہند کی بلاواسطہ حکومت نافذ تھی۔رجواڑہ ریاستوں کی آزاد حیثیت کو برطانوی حکمرانوں نے جزوی طور پر ایک مقدم اصول یعنی اصول بالادستی (Doctrine of Paramountcy) کے مطابق غیر واضح غیر معین اور مشکوک رکھ دیا تھا۔

حالیہ دہائیوں تک رجواڑہ ریاستوں کی تاریخ نویسی کے مطالعے کی طرف خاص دھیان نہیں دیا گیا تھا۔کیونکہ ہندوستان کی آزادی کے بعد تحقیقِ تواریخ کے دستاویز میں قومیت پسند تاریخ نویسی (Nationalist Historiography) کا رجحان غالب تھا جو صرف برطانوی ہند کی تاریخ، نوآبادی محکومیت اور برطانوی راج کے خلاف قومی جدوجہد اور مزاحمت پر زور دیتی تھی۔اس طرح قومیت پسند تاریخ نویسی نے رجواڑہ ریاستوں کا تاریخی کردار اور برطانوی ہند اور رجواڑہ ریاستوں کے درمیان تعلقات کو نظرانداز کیا تھا۔لیکن حالیہ دھائیوں سے رجواڑہ ریاستوں اور ان کے برطانوی ہند کے ساتھ تعلقات پر کافی تحقیق ہو رہی ہے۔ برطانوی حکومت ابتداء سے ہی وقتی ضرورتوں کے مطابق رجواڑہ ریاستوں کے وسائل اور توانائی سے استفادہ کرتی تھی۔ابتدا سے ہی برطانوی حکمران ہندوستان کی رجواڑہ ریاستوں سے برابری حاصل کرنے کی کوشش میں تھے۔ لیکن وقت گزنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے برصغیر ہند میں اپنی حکومت قائم کی۔ماتحت امدادی معاہدہ کے ذریعے برطانوی حکمرانوں نے رجواڑوں پر تسلّط جمایا اور ان کی فوج میں انگریزی فوجی دستہ بڑھا کر ان کو اپنے اغراض و مقاصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا۔اس کے بعد انہوں نے اپنی بالادستی ظاہر کرنے کے لیے رجواڑوں کو ماتحتی رتبہ دے کر اپنا مطیع کر لیا۔انہوں نے زیادہ سے زیادہ محصول جمع کرنے کے لیے ریاست کی بدنظمی (misgovernance) کو بہانہ بنا کر بہت ساری چھوٹی بڑی ریاستوں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

1857ء کے بعد انہوں نے جبری الحاق تدابیر کو چھوڑ کر رجواڑہ ریاستوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا مناسب سمجھا۔ تاکہ برصغیر ہند کے سیاسی نظام میں توازن قائم ہو جائے۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے رجواڑوں کے ساتھ صلح نامے کیے تھے جن کے ذریعے برطانیہ نے تجارتی منڈیوں اور شاہراہوں پر غلبہ حاصل کیا تھا لیکن محصول کے بار سے بچنے کے لیے وہ بالواسطہ حکومت نافذ کرنے سے باز رہے۔ ان صلح ناموں کے مطابق رجواڑوں نے فوجی معاونت کے بدلے میں اپنے اقتدار کو بیچ دیا تھا۔ 1857ء کی بغاوت کے دوران اپنی آزاد حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے یہ رجواڑہ ریاستیں انگریزوں کے تابع اور وفادار رہیں۔ جس کی وجہ سے آنے والے نوّے سالوں تک ہندوستانی رجواڑوں پر بلاواسطہ حکومت قائم رہی۔ علاوہ ازیں، رجواڑہ ریاستوں کے وجود سے ہی مشرقی لوگوں کو اپنانے اور ان کو مہذب بنانے کے نوآبادیاتی منصوبے پر عمل آوری ہو گئی۔ اس لیے رجواڑہ ریاستوں کی تخلیق کے مقاصد متعدد مواقع اور جگہوں پر مختلف تھے۔

7.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے برصغیر میں اقتدار حاصل کرنے سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ پہلے معاہدے اور پھر قبضوں کو سمجھ سکیں گے۔
- 1740ء سے 1947ء تک برطانوی ہند اور رجواڑہ ریاستوں کے تعلقات میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں، وضاحت کر سکیں گے۔
- رجواڑہ ریاستوں کی نوعیت، اہم خصوصیات اور آزاد ہند میں ان کی شمولیت کے بارے میں واقفیت حاصل کر سکیں گے۔

7.2 برطانوی ہند اور رجواڑہ ریاستوں کے درمیان تعلقات

(Relationship between British-India and the Princely States)

اٹھارویں صدی کے درمیانی حصے میں جب مشہور و معروف مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے زرخیز اور امیر ترین صوبہ بنگال (1757)ء پر اپنا قبضہ جما لیا اور تجارتی تعلقات بڑھانے کے لیے ساحلی علاقوں اور دیگر اقتصادی طور پر خوشحال ریاستوں کے ساتھ صلح نامے کر لیے۔ 1760ء کے بعد کمپنی نے رجواڑوں پر ماتحت امدادی معاہدہ (Subsidiary Alliance) نافذ کرنا شروع کیا۔ پہلی بار حیدرآباد نے اور اس کے بعد کوچ بہار اور کارناٹک نے ماتحت امدادی معاہدہ کو قبول کر لیا۔ ان میں سے بعض ریاستیں ایسی تھیں جو صدیوں سے مغلوں کے حملے برداشت کر رہی تھیں۔ اور بعض ریاستوں کو نئے سرے سے تشکیل دیا گیا تاکہ مراٹھا اجتماعی حکومت (Maratha Confederacy) کو کمزور اور ختم کیا جائے۔ 1857ء تک برطانوی جبری الحاق کی تدابیر جاری رہی لیکن جن ریاستوں نے برطانوی بالادستی قبول کر لی ان کو برطانیہ حکومت نے ٹھیک ڈھنگ سے حکومت کرنے کی اجازت دے دی۔ گذشتہ زمانے پر تجزیہ کرنے کے بعد برطانوی ہند اور رجواڑہ ریاستوں کے درمیان تعلقات کو مندرجہ ذیل پانچ عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے:

7.2.1 جدوجہد برائے یکسانیت (The struggle for Equality, 1740-65)

1740ء سے پہلے برطانوی کمپنی صرف ایک تجارتی تنظیم تھی۔1740ء میں جب ڈوپلے کس (Duplex) نے ہندوستان کی سیاست میں مداخلت کرنی شروع کی تو برطانوی کمپنی کے افسروں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کا خواب دیکھا۔اور 1751ء میں ارکاٹ (Arcot) پر قبضہ کرلیا۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کے نواب سراج الدّولہ کو پلاسی کی لڑائی (1757) میں ہرایا۔اس کے بعد بنگال کے نواب میر قاسم، اودھ کے نواب شجاع الدّولہ اور مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کو بکسر کی لڑائی (1764) میں شکست دے دی۔ جس کے نتیجے میں چاروں طاقتوں کے مابین الہ آباد صلح نامہ طئے ہوا۔الہ آباد صلح نامے (1765) کے تحت برطانوی کمپنی کو بہار، بنگال اور اُڑیسہ کی دیوانی مل گئی۔ لہذا 1740-65 تک کمپنی اس رتبے اور حیثیت کی طلب گار تھی جو ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے اختیار میں تھی۔

7.2.2 حصار بندی کی پالیسی (The Policy of Ring Fence, 1765-1813)

ہندوستان دیسی یا ملکی ریاستوں سے برابری حاصل کرنے کے لیے لارڈ ہیسٹنگز اور لارڈ کارنوالس نے مراٹھوں اور میسور سے کئی جنگیں لڑی۔ان جنگوں کا مقصد یہ تھا کہ ان ریاستوں پر بلاواسطہ حکومت قائم کرکے انہیں مراٹھوں اور افغان حملوں سے بچاکر حائل مملکتوں (Buffer States) میں تبدیل کیا جائے۔اس لیے انہوں نے 1856ء تک رجواڑہ ریاستِ اودھ کو اپنے قبضہ میں نہیں لیا۔ کیونکہ اس نے برطانوی ہند کے دارالخلافہ یعنی کلکتہ کے لیے حائل مملکت کا رول ادا کیا تھا۔اس لیے اس تدبیر کو حصار بندی کی تدبیر کا نام دیا گیا۔ جس کے دوران حیدرآباد، اودھ اور مراٹھوں نے ماتحت امدادی معاہدہ قبول کرلیا۔ کارل مارکس لکھتے ہیں "جب مقامی ریاستوں نے امدادی معاہدہ قبول کرلیا اسی وقت ان ریاستوں کا وجود اور آزادی ختم ہوگئی۔ مثال کے طور پر اگر آپ کسی ریاست کے محصول کو دو حکومتوں کے درمیان تقسیم کروگے تو یقیناً دونوں حکومتوں کے وسائل، مالی حالت اور اقتدار ختم ہوجائے گا۔اور نتیجے میں دونوں حکومتیں دائمی زوال اور انتہائی انحطاط اور مراجعت کا شکار ہوجائینگی"۔ برطانوی حکومت کو فروغ اور وسعت دلانے کے لیے ماتحت امدادی معاہدہ نے ایک اہم ہتھیار کا کردار نبھایا۔اس کی نمایاں صفات کچھ اس طرح ہیں :

- اقتصادی وسائل اور افرادی قوت کی قلت سے کمپنی نے زرخیز اور مالی طور پر خوشحال علاقوں پر حکومت قائم کی اور غیر زرخیز اور وسائل کے لحاظ پسماندہ ریاستیں ماتحت امدادی معاہدہ کے مطابق بلاواسطہ حکومت میں شامل کی گئیں۔
- مرکزی ہند کے ناقابل رسا، پتھریلی چٹیل زمین اور مغربی ہند کے ریگستان جو پیداوار کے لحاظ سے بہت کم تر تھے، کو بھی کئی صلح ناموں کے مطابق بلاواسطہ حکومت میں داخل کیا گیا۔ان صلح ناموں کی وجہ سے انگریز حکمرانوں کو اخلاقی اور قانونی جواز حاصل ہوگیا جس کی وجہ سے ان کو اعلی اور مقدم طاقت سمجھا جاتا تھا۔اس کے علاوہ اگر کبھی دو رجواڑہ ریاستوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوجائیں اس وقت دونوں ریاستوں کو برطانوی کمپنی کے اعلیٰ افسران بحیثیت منصف قبول کرنے ہونگے۔

مندرجہ بالا بیان کئے گئے اصولوں کے بدلے میں برطانوی کمپنی نے رجواڑہ ریاستوں کی اندرونی اور بیرونی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی۔

لہذا ماتحت امدادی معاہدہ ہندوستانی حکمرانوں کے اخراجات پر برطانیہ کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ دراصل ویلزلی (Lord Wellesley) نے ماتحت امدادی معاہدہ کو بحیثیت ٹروجنی گھوڑے کی حکمت عملی کے طور پر استعمال کیا۔ لیکن انہوں نے اپنے اس معاہدے کو دفاعی تدبیر کا نام دیا۔ کیونکہ انہوں ے حیدرآباد، میسور اور اودھ کو برطانوی بالادستی قبول کرنے کے لیے کہا لیکن ان پر زبردستی قبضہ نہیں کیا۔ منرو (Munro) کہتے ہیں کہ 'ملک بھر میں جہاں پر بھی ماتحت امدادی معاہدہ نافذ ہوگا وہاں پر زوال اور گھٹتی ہوئی آبادی کے آثار نظر آجائیں گے۔' جارج بارلو کا کہنا ہے کہ 'ہندوستان میں کوئی ایسی دیسی ریاست نہیں رہے گی جو برطانوی بالادستی کی گرفت میں نہیں آجائے گی۔' اس طرح برطانوی حکمرانوں نے میسور (1799) مراٹھوں (1803) اور ہولکاروں (1805) کو شکست فاش دے کر اپنے پائوں ہندوستان میں جمالئے۔

7.2.3 ماتحتوں کو علاحدہ رکھنے کی پالیسی (Policy of Subordinate Isolation, 1813-57)

لارڈ ہیسٹنگز کی اعلیٰ صوبہ داری میں برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے تعلقات بڑھنے لگے۔ اس عرصے میں برطانوی سامراجیت اور بالادستی کو کافی ترقی ملی۔ انہوں نے ہندوستانی حکمرانوں پر وہ صلح نامے عائد کیے جو دونوں اطراف سے برابری کے حقوق پر مبنی نہیں تھے اور ان کو برطانوی بالادستی کو قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس طرح رجواڑہ ریاستوں کو اپنا بیرونی اقتدار برطانیہ کے سپرد کرنا پڑا اور بدلے میں ان کو اندرونی خود مختاری کو برقرار رکھنے کی اجازت دی گئی۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ برطانوی حکمرانوں نے اندرونی انتظامیہ میں بھی مداخلت کی اور رجواڑہ ریاستوں کے حکومتی درباروں میں اپنے نمائندے منتخب کیے اور ان ریاستوں کو ایک دوسرے سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ اس تدبیر کو کا نام دیا گیا۔ اس تدبیر کی وجہ سے یہ نمائندے دھیرے دھیرے برطانیہ کے سفارتی کارکن بن گئے جو ہندوستان کے رجواڑہ ریاستوں کے درباروں میں غیر ملکی یعنی برطانیہ کی نمائندگی پیش کرتے تھے۔ لارڈ ہیسٹنگز کے دور سے لے کر 1857ء تک شاہی ریاستوں کے انگریزی نمائندے سفارتی کارکنوں سے حکومت کے انتظامی صیغہ میں شامل ہوگئے۔ لارڈ ہیسٹنگز اپنے جرنل میں اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ برطانوی نمائندہ ریاست کے تمام مسائل میں مداخلت کرتا تھا، مطلق العنان حکمران کی طرح اپنے احکامات صادر کرتا تھا اور اپنے اختیارات اور طاقتوں کی شاندار نمائش کرتا تھا۔ 1833ء کے چارٹر ایکٹ کے مطابق کمپنی کو تجارتی مشغولیات سے برطرف کیا گیا جس کے بعد برطانوی کمپنی نے بنیادی طور پر سیاسی پہلو پر توجہ دی۔ اسی دوران گورنر جنرل بنٹک، آکلینڈ، ڈلہوزی وغیرہ نے زیادہ سے زیادہ محصول جمع کرنے کے لیے بہت ساری ریاستوں پر قبضہ کیا۔ 1818ء تک تقریباً ہندوستان کی ساری نامور ریاستیں "جبری الحاق تدبیر (Doctrine of Lapse) کے تحت مغلوب ہو چکی تھیں۔ اس پالیسی کے مطابق گود لیے ہوئے فرزند اس کے گود لینے والے والد کی جائیداد کا حقدار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے بغیر برطانوی حکمرانوں نے اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لیے اور محصول بڑھانے کے لیے اور بھی کئی حربے اختیار کیے۔ لیکن 1857ء کی بغاوت کے بعد کوئی بھی ریاست سلطنت برطانوی ہند میں شامل نہیں کی گئی۔ البتہ کچھ ریاستیں، جیسے منی پور (Manipur) میں 1891ء سے 1907ء تک برطانوی افسران نے نظامت کا کردار ادا کیا۔

7.2.4 ماتحت وفاق کی پالیسی (Policy of Subordinate Union, 1857-1935)

1858ء کے بعد برطانوی ہند اور رجواڑہ ریاستوں کو اپنے تعلقات بڑھانے کا موقع ملا۔ کیونکہ 1857ء کی بغاوت کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے خود اس بات کا اقرار کیا کہ "ہم مقامی راجائوں کو اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ ہم کمپنی کی طرف سے کیے گئے صلح ناموں کو قبول کرتے ہیں اور آج کے بعد کسی رجواڑہ ریاست پر قبضہ نہیں کیا جائے گا"۔ دراصل برطانوی حکمران ان ہندوستانی حکمرانوں کو لوگوں کے قدرتی رہنما مانتے تھے اس لیے وہ ان کو تحفوں سے نوازتے تھے۔ علاوہ ازیں 1857ء کی بغاوت کو ختم کرنے میں تقریباً چودہ ملین ڈالر کا خرچہ آگیا۔ اس لیے برطانیہ نے مزید الحاقی تدابیر پر روک لگادی۔ ایان کو پلینڈ کہتے ہیں کہ 1861ء میں بجٹ کی حالت اتنی خستہ تھی کہ کلکتہ حکومت نے بے دھڑک مالی ذرائع کو بڑھانے کے لیے محصول آمدنی (Income Tax) کو عائد کیا۔ اس کے بغیر وہ اس بات کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ جب تک ہندوستان میں راجواڑے حکومت کرتے رہینگے تب تک برطانیہ سامراج کے خلاف بغاوت کے امکانات بہت کم ہیں۔ اس لیے ملکہ وکٹوریہ نے ڈلہوزی کی الحاقی تدبیر کو رد کر دیا اور مقامی راجائوں کی دوستی کو ترجیح دے دی۔

وہ لارڈ کیننگ کے حوالے سے اس بات کو دھراتے ہیں کہ یہ دیسی ریاستیں مستقبل میں بغاوت کے دوران طوفان میں توڑنے والی لہر (Breakwaters in the Storm) کے طور پر ثابت ہو سکتی ہیں۔ لہذا اب ریاست میں بد نظمی ہونے پر الحاقی تدابیر کو نہیں بلکہ اختیارات چھین کر بحالی کی تدبیر پر زور دیا گیا۔ اس لیے ان ریاستوں کی نظامت چلانے کے لیے اجازت دے دی گئی۔ لیکن اختیارات اور خود مختاری سے محروم کیے گئے اور ان کی وفاداری کو لازمی رکھا گیا۔ برطانوی غیر الحاقی تدبیر ہندوستانی رجواڑوں کی اُن قربانیوں کا نتیجہ تھا جو انہوں نے 1857ء کی بغاوت کو ختم کرنے کے لیے پیش کئے تھے۔

7.2.5 ماتحت اتحاد پالیسی (Policy of Subordinate Union, 1858-1935)

ماتحتی اتحاد (1858-1935) کے دوران تمام راجواڑہ ریاستیں مساوی طور پر برطانوی ہند پر منحصر تھیں۔ لارڈ ریڈنگ نے ایک بات کا ذکر کیا کہ لقب "وفادار دوست" (جس کا حامل بلند مرتبت جناب اعلیٰ نظامِ حیدرآباد ہے)، کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ برطانوی اصول بالادستی کے مطابق اپنی ریاست کو باقی رجواڑہ ریاستوں سے مختلف سمجھے۔ ان رجواڑہ ریاستوں کو لارڈ کیننگ نے "جاگیر" یا "مطیع" ریاست اور برطانوی حکمرانوں کو مسلّمہ بالادست طاقت کا نام دیا ہے۔ الغرض حکومت برطانوی ہند نے رجواڑہ ریاستوں کے اندرونی اور بیرونی اقتدار پر قبضہ قائم رکھا۔ اس لیے بٹلر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق بین الاقوامی سطح پر رجواڑہ ریاستوں کی زمین اور آبادی برطانوی ہند کی زمین اور آبادی کے برابر بیان کی گئی ہے۔ لارڈ کرزن نے رجواڑہ ریاستوں سے مزید مفادات حاصل کرنے کے لیے ان کے ساتھ کیے گئے صلح ناموں کی تعبیر نو بیان کرنی شروع کی۔ انہوں نے ہندوستان کے راجائوں کی یورپی سیر و تفریحات پر روک لگادی اور ان کی ریاستوں میں رفاہ عام اور فلاح و بہبودی کے کاموں پر زور دیا۔

1919ء کے مون ٹیگ چیلمس فورڈ اصلاحات کے مطابق ہندوستانی حکمرانوں کا ایوان (Chamber of Planner)

قیام میں لایا گیا جس نے ایک ناصحانہ اور مشاورتی تنظیم کا کردار ادا کیا۔ ایان کو پلینڈ کہتے ہیں کہ "1921ء تک رجواڑہ ریاستیں بحیثیت برطانوی راج کے تسلیم شدہ شراکت دار اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آچکی تھیں۔ علاوہ ازیں اب ان رجواڑہ ریاستوں کو حقارت کی نظروں سے نہیں، بلکہ قیمتی روایتوں کے مخزن، وفاداری اور سیاسی حکمت اور دور اندیشی کا حامل سمجھا جاتا تھے۔ لیکن جب لارڈ ریڈنگ نے کہا کہ برطانوی بالادستی نہ صرف صلح ناموں پر منحصر ہے بلکہ وقتی طور پر ان کے کیے گئے فیصلوں پر بھی منحصر ہے۔ اس وقت ہندوستانی حکمرانوں نے لارڑارون سے درخواست کی کہ برطانوی بالادستی کو سلیس اور سادہ زبان میں واضح کیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک کمیٹی بٹلر کی صدارت میں بنائی گئی۔ جس نے 1927ء میں اپنی رپورٹ کچھ اس طرح سے پیش کی۔

'برطانوی بالادستی لازماً بالادست رہے گی۔ یہ وقت کی ضروریات اور رجواڑہ ریاستوں کی بڑھوتری اور ترقی کو مدنظر رکھ کر لازماً اپنے فرائض اور عہد وپیمان حاصل کرنے کے لیے اس کی وضاحت کرنے کے بعد اپنالے گی۔' لہذا اصول بالادستی کو مشکوک، غیر واضح اور غیر معین رکھا گیا۔ برطانوی حکمرانوں نے مختلف اوقات پر رجواڑہ ریاستوں کے وسائل اور توانائی کو استعمال کیا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران ان دیسی حکمرانوں کو ہندوستانی لوگوں کے قدرتی رہنمائوں کا خطاب دیا گیا اور ابھرتی ہوئی جدید قومیت کے خلاف ان کو 'چار دیواری' کے طور پر استعمال کیا گیا۔

7.2.6 یکساں وفاقی پالیسی (Policy of Equal Federation, 1935-47)

1930ء سے 1932ء تک منعقد ہوئی تین گول میز کانفرنسوں میں رجواڑہ ریاستوں کو اپنے مسائل پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ جس میں برطانوی ہند اور رجواڑہ ریاستوں کو وفاق بنانے کی تجویز دی گئی۔ یہ تجویز تیج بہادر سپرو نے پہلی گول میز کانفرس میں پیش کی تھی جس کو رجواڑہ ریاستوں کے حکمرانوں نے رد کر دیا لیکن جب ان رجواڑوں نے مستقبل کے لیے برطانیہ سے آئینی ضمانت مانگی تو انڈین نیشنل کانگریس نے اس کی سخت تنقید کی۔

اس سلسلے میں کانگریس نے اپنے ہر پورہ اجلاس میں رجواڑہ ریاستوں میں چل رہی نامور تحریکوں کا واجبی اور اخلاقی مدد کرنے کی ضرورت ظاہر کی۔ وفاق وجود میں نہیں آسکی کیونکہ کئی ریاستوں کے منع کرنے پر اور دوسری عالمگیر جنگ کے آغاز سے یہ منصوبہ عمل میں نہیں آسکا۔ 20 فروری 1947ء کے اٹلی کے اقرار نامے سے اور آنے والے ماونٹ بیٹن پلان کے تحت برطانوی بالادستی کو ختم کر دیا گیا۔ رجواڑوں کو پاکستان اور ہندوستان میں شامل ہونے کی اجازت دی گئی۔ حیدرآباد نظام نے آزاد حیدرآباد کی درخواست کی تھی لیکن سردار پٹیل کی حوصلہ مندی اور حیدرآباد کی ناموزون جگہ کی وجہ سے یہ ریاست بھی ہندوستان میں جذب ہو گئی۔

7.3 رجواڑہ ریاستوں کی نوعیت: ایک بحث (Debate on the Nature of Princely States)

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد رجواڑے اپنی ریاستوں کا اقتدار برقرار کیوں نہیں رکھ پائے۔ بی۔ این۔ رموسک کہتے ہیں کہ 'رجواڑوں کی سیاسی نااہلی، ذاتی کم ہمتی، ہندوستانی سیاست دانوں کی عیاری اور رجواڑوں کی زیستگی کی متبادل صورت کی کمی کی وجہ

سے ان کو اپنے رجواڑے چھوڑنے پڑے۔' *Annels and Antiquities of Rajasthan,* کی پہلے جلد میں جیمس ٹاڈ، راجپوت ریاستوں میں موجود فوجی نظام کی نشاندہی کرتا ہے جو قدیم یورپ کے جاگیر دارانہ نظام سے ملتا جلتا ہے۔ رموسک کہتے ہیں کہ استعماری مورخوں نے رجواڑوں کو "فوجی دوست" یا "لوگوں کے قدرتی رہنما" کالقب دیا ہے اور ان کو بے حد اصراف کرنے والے انسانوں کے طور پر پیش کیا۔ ان کا ماننا ہے کہ تاریخ میں رجواڑوں کے کردار کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جنوبی ایشیا کی تاریخ نویسی کے مطالعے میں رجواڑہ ریاستوں کو ہندوستانی قومیت اور مذہبی فرقہ واریت کے حاشیوں پر بیان کیا گیا ہے۔

ایان کو پلینڈ، لارڈ کیننگ کا حوالہ دیتا ہے جن کا ماننا ہے کہ 'رجواڑہ ریاستوں نے طوفان کو توڑنے والی لہر (Breakwater in the Storm) کا کردار نبھایا ہے ورنہ اس طوفان نے ہم کو بڑی تیز رفتار میں سمیٹ لیا ہوتا۔' اس کے باوجود بھی برطانوی نوآبادکاروں نے رجواڑہ ریاستوں کے مستقبل کی پرواہ نہیں کی۔ اس لیے جب حیدرآباد کے نظام اور جموں وکشمیر کے مہاراجہ نے ذاتی رضامندی کے تحت آزاد رہنا چاہا۔ تب دونوں رجواڑوں میں خون ناحق بہا۔

کئی طریقوں اور کاوشوں سے برطانوی نوآبادکاروں نے ہندوستان میں ایک بہت بڑی لیکن ٹوٹی پھوٹی اور خستہ حال سلطنت قائم کی۔ استعماری مورخوں نے برصغیر ہند میں رجواڑہ ریاستوں کو سیاہ نشان، جاگیری ریاست اور پسماندہ خطوں کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کے برعکس برطانوی ہند میں جدیدیت کی ابتداء اور ترقی پذیر سرمایہ دارانہ نظام کا ذکر کیا ہے۔ لیکن بھانگیہ بھوکیہ (Bhangya Bhukya) اپنے مقالے 'Between tradition & Modernity: Nizams, Colonialism & Modernity in Hyderabad State' میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رجواڑہ ریاستیں سطحی طور پر مشرقی طرز کی دکھتی تھیں لیکن حقیقت میں وہ نو آبادی طرز پر مبنی جدید تعلیم، ہسپتال، شہر کاری، وغیرہ جیسے مغربی صفات کی حامل تھیں۔ درحقیقت نوآبادیاتی اثرات پورے جنوبی ایشیا میں داخل ہو چکے تھے لیکن رموسک اس پہلو سے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مندرجہ ذیل دی گئی تین وجوہات کی بناء پر 1860ء سے 1940ء تک رجواڑہ ریاستیں سیاسی اور اقتصادی طور پر ترقی کی راہ پر گامزن ہو چکی تھیں۔

1. پہلا یہ کہ موجودہ انتظامی ادارے پوری طرح سے جاگیر داری نظام کے حامی نہیں تھے۔
2. اگرچہ رجواڑہ ریاستیں جاگیر داری طرز پر مبنی تھیں لیکن پھر بھی وہ انتظامیہ کے مرحلے میں ملکی اور غیر ملکی شریک کار پر منحصر تھیں جس کی وجہ سے ان ریاستوں میں افسر شاہی وجود میں آگئی۔
3. رجواڑہ ریاستوں کو اپنے ذرائع اور وسائل استعمال کرنے میں روکا جاتا تھا اس کے باوجود بھی ان ریاستوں کے حکمران اور تاجر اقتصادی اور تجارتی مواقع کے تعاقب میں رہتے تھے۔

کئی رجواڑہ ریاستوں کی جدیدیت اور نئی سوچ بی۔ این۔ رموسک کے اس مقالے- 'Women Hospitals and Midwives in Mysore 1870-1920' سے معلوم ہوتی ہے جس میں وہ میسور کے حکمرانوں کی دور اندیشی اور واجب الادا یا

بالغ شعور ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے جس نے اپنی ریاست میں زچگی کے اسپتالوں کا افتتاح کیا۔ جس سے اس وقت کے برطانوی نوآبادکار بھی متاثر تھے۔ علاوہ ازیں ریاست حیدرآباد میں بھی نظام کی انتظامیہ اور حکومت کے دیگر مراحل میں جدیدیت کا رجحان نظر آرہا تھا۔ جیسے حیدرآباد میں تعلیمی نظام خصوصاً تعلیم نسواں، شہر کاری، اسپتال، ریلوے وغیرہ کے میدان میں ترقی اور بہتری کے آثار دکھائی دیتے تھے۔اس بڑھتی ہوئی جدیدیت کو مد نظر رکھتے ہوئے سالار جنگ نے بیش بہا اور قیمتی مغل تہذیب کو بچانے کے لیے بہت کوشش کی اور دونوں کے درمیان (جدیدیت اور مغل تہذیب) توازن برقرار رکھنے کے لیے اقدامات اٹھائے۔

نہرو اور سٹیوایسٹن کے بیانات، کہ رجواڑہ ریاستیں مطلق العنان حکومت کی وجہ سے خود بخود ختم ہونے والی ہیں، کا جواب دیتے ہوئے ایان کو پلینڈ کہتے ہیں کہ ان کی آگاہی میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس سے اس بات کا اشارہ ملے کہ رجواڑہ ریاستیں خود بخود زائل ہو جائینگی ۔کیونکہ کئی ریاستوں کی اقتصادی حالت برطانوی ہند سے بہتر تھی۔ ان کے پاس تجربہ کار منتظم تھے اور پرجامنڈلوں (Praja Mandals) کی صورت میں جمہوریت کا آغاز ہو رہا تھا۔

Siobhan Lambert Hurley اپنی کتاب *Muslim Women, Reform and Princely Patronage: Nawab Sultan Jahan Begum of Bhopal* میں شاہی ریاست بھوپال کی بیگمات کے کردار پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ شاہی شناخت کے مرحلے میں انہوں نے طبقہ، جنس، مذہب، عقیدہ، روایات اور جدیدیت کے درمیان تعلقات کو بیان کیا ہے۔انہوں نے حکمران کے ہم مذہب لوگوں اور انکی عورتوں، رعایا اور برطانوی افسر شاہی کی ضرورتوں کا اظہار کیا ہے۔ان کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کے راجواڑہ ریاستیں نہ صرف ہند میں بلکہ جنوبی ایشیا کی تاریخ نویسی میں بھی ایک خاص مقام کی حامل ہیں ۔چونکہ برطانوی حکمرانوں نے اکثر رعایا کے مذہب سے دور رہنے کی کوشش کی۔ لیکن رجواڑوں نے اکثر شوریدہ سری سے اپنے مذہب، مذہبی مسائل اور مذہب سے تعلق رکھنے والے اداروں میں دخل اندازی کا مظاہرہ کیا۔ جس کی وجہ سے کبھی لوگوں کے دلوں میں فرقہ وارانہ جذبات وجود میں آجاتے تھے اور اکثر ان مذہبی جذبات کو کچلا یا بھی جاتا تھا۔Mridu Rai اپنی کتاب *Hindus Rulers Muslim Subjects: Islam, Right, and the History of Kashmir* میں شاہی ریاست جموں وکشمیر کے تناظر میں کہتی ہیں کہ حکمران اور رعایا کے درمیان کوئی قدرتی تعلق نہیں ہوا کرتا تھا کیونکہ اعلیٰ طبقے کے لوگ ہندومت کے پیروکار تھے اور رعایا اسلام مذہب کی پیروکار تھی۔اس لیے حکمرانوں کے چال وچلن سے رعایا آبادی بیگانہ اور مغلوب ہو گئی۔

7.4 رجواڑہ ریاستوں کی حکومت ہند میں شمولیت

(Accession of Princely States to the Government of India)

مائونٹ بیٹن پلان کے مطابق پاکستان اور ہندوستان کی جغرافیائی قربت کو مد نظر رکھتے ہوئے رجواڑوں کو آزادی دی گئی کہ وہ ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہو جائیں۔اس لیے سردار پٹیل نے رجواڑوں کے قومی جذبات کو اجاگر کر کے ان کو حکومت ہند میں شامل ہونے

کی ترکیب دے دی۔ دسمبر 1947ء تک ساری ریاستیں ہندوستان یا پاکستان میں ضم ہو چکی تھیں، ماسوائے حیدرآباد۔ مختلف وجوہات کی بناء پر جامنڈلوں کی مخالفت اور مدافعت، آزاد ہندو پاک کی تشکیل، بڑھتی ہوئی بنیادی اور جدید قومی سیاست اور رجواڑوں کی مجبوریوں کی وجہ سے یہ ریاستیں پاکستان اور ہندوستان میں ضم ہو گئی۔ بعض ریاستیں جیسے راجکوٹ، فرید کوٹ، کاچھ، تریپورہ، منی پور، نیلگیری، بھرتپور، جوناگڑھ، جموں وکشمیر (Oct. 1947) اور حیدرآباد (Sep. 1948) کو فوجی کاروائی کے زریعیے حکومت ہند میں شامل کیا گیا۔

7.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس مضمون میں ہم نے برطانوی اور رجواڑہ ریاستوں کے درمیان تعلقات کے بارے میں پڑھا اور اس میں گذرے کئی ادوار کا بھی مطالعہ کیا۔ مزید ان ادوار میں برطانوی ہند کی طرف سے استعمال کئے گئے حربے جیسے، ماتحت امدادی معاہدہ اور جبری الحاق تدابیر پر بھی بحث کی ۔تاہم 1857ء کی بغاوت کے دوران ان ریاستوں نے برطانیہ کے تئیں وفاداری کا ثبوت دیا۔ اس لیے رجواڑہ ریاستوں کو حفاظت دلانے کے لیے اقدامات اٹھائے گئے۔ لیکن یہ رجواڑے مجموعی طور پر برطانوی بالادستی کے تابعدار بنائے گئے۔ ہندوستان میں مواصلات اور مالیات پر بڑھتا برطانوی قبضہ رجواڑہ درباروں میں محسوس کیا جاتا تھا۔ عوامی مخالفت، مسلسل جدوجہد برائے آزادی اور دوسری عالمگیر جنگ کے بعد برطانوی سامراجیت کے زوال کی وجہ سے رجواڑہ سلسلے کا خاتمہ ہو گیا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد تاریخ کے اوراق میں رجواڑہ ریاستوں کے کردار کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ لیکن حالیہ چند دھائیوں سے رجواڑہ ریاستوں پر اچھی خاصی تحقیق ہو رہی ہے۔ علاوہ ازیں رجواڑہ ریاستوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ہم مختلف نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی ارادوں اور منصوبوں کی واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ جن کے ذریعے رجواڑہ ریاستوں کو استعمال کیا گیا اور ان پر حکومت کی گئی۔ رجواڑہ ریاستوں کی تاریخ مختلف الجہات اور وسیع تر ہے جس پر کا مطالعہ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

7.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

جبری الحاق پالیسی : اصل مرد وارث کے نہ ہونے پر رجواڑے کا برطانوی ریاست کے ساتھ جبری الحاق

امدادی معاہدہ پالیسی : برطانوی حکومت کی کسی مقامی ریاست سے فوجی مدد کی پالیسی جس کے اخراجات مقامی ریاست کو اٹھانا پڑتے تھے۔

7.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

7.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. Imperial Gazetteer of India کے مطابق ہندوستان میں شاہی ریاستوں کی تعداد کتنی تھی۔
2. حیدرآباد کی شاہی ریاست کس سال ہندوستان میں ضم ہوئی۔

3. مشہور تاریخ دان (Siobhan Lambert Hurley) نے کس شاہی ریاست پر تحقیق کی ہیں۔
4. جبری الحاق تدبیر (Doctrine of Lapse) کی پالیسی کس نے شروع کی۔
5. پانچ شاہی ریاستوں کے نام بتائیں۔
6. سب سے پہلے کس تجارتی کمپنی نے ہندوستان کی سیاست میں مداخلت کرنی شروع کی۔
7. الہ باد صلح نامہ کب ہوا۔
8. عہد معاونت کی پالیسی کس نے شروع کی۔
9. تیسری گول میز کانفرس کس سال منعقد ہوئی۔
10. دو شاہی ریاستوں کے نام بتائیں جو 1947 میں فوجی کاروائی کے زریعے ہند میں ضم ہوئی۔

7.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. جدوجہت برائے یتسانیت کی پالیسی کیا تھی۔
2. 1857 کی بغاوت کے بعد برطانیہ نے شاہی ریاستوں کی طرف دوستی کا ہاتھ کیوں بڑایا۔
3. برطانوی ہند اور رجواڑہ ریاستوں کے درمیان تعلقات کے مختلف مراحل کو مختصر طور پر مرتب کیجئے؟
4. حصار بندی کی پالیسی پر روشنی ڈالیں۔
5. برطانیہ کی ابتدائی پالیسی رجواڑوں کے ساتھ کیا تھی۔

7.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. رجواڑہ ریاستوں کی نوعیت پر بحث کریں۔
2. برطانوی ہند اور شاہی ریاستوں کے درمیان تعلقات کا تنقیدی جائزہ لیں۔
3. 1857 کے بعد برطانوی ہند کی شاہی ریاستوں کے تعیں پالیسی پر بحث کریں۔

7.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, New Delhi: Orient BlackSwan, 2009.
2. B. L. Grover and Alka Mehta, *New Look At Modern Indian History*, New Delhi: S. Chand Publishing, 2018.
3. Robin Jeffrey, Ed., *People*, *Princes and Paramount Power*: *Society and Politics in the Indian Princely States*, New Delhi: Oxford University Press, 1978.

4. A.G. Noorani, *The Destruction of Hyderabad*, New Delhi: Tulika Books, 2013.
5. Pernau, Margrit, *The Passing of Patrimonialism*: *Politics and Political Culture in Hyderabad 1911-1948*, New Delhi: Manohar Publishers, 2000.
6. Sheela Raj, *Medievalism to Modernism*: *Socio-Economic and Cultural History of Hyderabad*, *1869-1911*, Bombay: Popular Prakashan, 1987.
7. Ray, Bharati, *Hyderabad and British Paramountcy*, 1858-83, Delhi: Oxford University Press, 1989.
8. Madhavi Yasin, *British Paramountcy In Kashmir*, *1876-1894*. New Delhi: Atlantic Publishers, 2004.
9. Ian Copland, *The Princes of India in the Endgame of Empire*, *1917-1947*, Cambridge: Cambridge University Press, 1999.
10. _____, *The British Raj and the Indian Princes*: *Paramountcy in Western India*, *1857-1930*, (Bombay, 1982).
11. Siobhan Lambert Hurley, *Muslim Women*, *Reform and Princely Patronage*: *Nawab Sultan Jahan Begam of Bhopal*, Routledge, 2006.

اکائی 8۔ پارلیمنٹ اور سامراج: آئینی ارتقاء

(Parliament and the Empire: Constitutional Developments)

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 کمپنی کے ابتدائی تجربات

8.2.1 بنگال میں دوہری حکومت

8.3 ابتدائی انتظامی قانون سازی

8.3.1 ریگولیٹنگ ایکٹ 1773

8.3.2 پِٹس انڈیا ایکٹ 1784

8.4 برطانوی پارلیمنٹ اور چارٹر ایکٹ

8.4.1 چارٹر ایکٹ 1793

8.4.2 چارٹر ایکٹ 1813

8.4.3 چارٹر ایکٹ 1833

8.4.4 چارٹر ایکٹ 1853

8.5 تاج برطانیہ کو اقتدار کی منتقلی

8.5.1 ایکٹ 1858

8.5.2 ملکہ وکٹوریہ کا اعلان 1858

8.6 ہندوستانی کونسل قوانین

8.6.1 انڈین کونسلس ایکٹ 1861

8.6.2 انڈین کونسلس ایکٹ 1892

8.7 آئینی حکمرانی کی ساخت میں اصلاحات

8.7.1 1909 کا ایکٹ
8.7.2 1919 کا ایکٹ
8.7.3 گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935
8.8 1935 کے ایکٹ کے مابعد
8.9 اکتسابی نتائج
8.10 کلیدی الفاظ
8.11 نمونہ امتحانی سوالات
8.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
8.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
8.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
8.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

8.0 تمہید (Introduction)

1600 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام اور 1765 میں ایک تجارتی کمپنی سے حکمران ادارے میں اس کی تبدیلی کا ہندوستانی سیاست اور حکومت پر بہت جلد اثر پڑا۔ لیکن کمپنی کے دور حکومت میں 1773 سے 1858 کے درمیان اور پھر برطانوی تاج برطانیہ کے تحت 1947 تک کے عرصے میں آئینی اور انتظامی تبدیلیوں کی بہتات ہوئی۔ ان تبدیلیوں کی نوعیت اور مقاصد برطانوی سامراجی نظریے کی خدمت کرنا تھا لیکن غیر ارادی طور پر انہوں نے جدید ریاست کے عناصر کو ہندوستان کے سیاسی اور انتظامی نظام میں داخل کر دیا۔

8.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ابتدائی انتظامی قانون سازی کے بارے میں جان سکیں گے۔
- چارٹر ایکٹ 1793، 1813، 1833 اور 1853 کے اہم دفعات جان سکیں گے۔
- کونسل ایکٹ 1861 اور 1892 کی اہم خصوصیات جان سکیں گے۔
- آئینی حکمرانی کے ارتقاء کے ایکٹ—1909، 1919 اور 1935 جان سکیں گے۔

8.2 کمپنی کے ابتدائی تجربات (Early Experiments by the Company)

بکسر کی جنگ 1764 کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی (محصول کی اصولی) کا حق مل گیا۔ مغل بادشاہ شاہ عالم دوم کو سالانہ محصول اور اودھ کے نواب شجاع الدولہ کو سالانہ وظیفہ دیا جانا تھا۔ دیوانی کے حصول کے بعد ہی بنگال کے گورنر رابرٹ کلائیو نے نئی حکومت کی تشکیل کی جس سے اصل طاقت کمپنی کو حاصل ہوئی۔ اس طرح، حقیقی اقتدار سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش میں، کلائیو نے خود سے حکومت کا ایک نظام متعارف کرایا جو دوہری حاکمیت یا (Dyarchy) کے نام سے مشہور ہے۔

8.2.1 بنگال میں دوہری حاکمیت (Dyarchy in Bengal)

بنگال کے انتظامی مسائل کو حل کرنے کے لیے رابرٹ کلائیو نے دوہرا نظام متعارف کرایا۔ اس نظام کے مطابق دائرہ اختیار کی اصل طاقت کمپنی کے پاس تھی جبکہ بنگال کے نواب کے پاس انتظامیہ کی ذمہ داری تھی۔ مغلیہ سلطنت کے عروج کے زمانے میں ایک صوبے میں مرکزی حکومت کے دو اعلیٰ افسر صوبیدار اور دیوان ہوا کرتے تھے۔ صوبیدار، انتظامی امور جیسے کہ دفاع، پولیس اور فوج کے انتظامات کی دیکھ بھال کرتا تھا، جب کہ دیوان حاکم مالیات اور محصول انچارج ہونے کے علاوہ صوبے میں شہری انصاف کا ذمہ دار تھا۔ دونوں افسران ایک دوسرے پر نظر رکھنے کے ساتھ مرکزی حکومت کو براہ راست ذمہ دار تھے۔ اس موقع پر کمپنی نہ تو براہ راست محصول وصول کرنے کے لیے تیار تھی اور نہ ہی اس کے قابل تھی۔ دیوانی امور کی انجام دہی کے لیے، کمپنی نے دو نائب دیوان، بنگال اور بہار کے لیے مقرر کیے۔ اس طرح، مکمل انتظامیہ ہندوستانیوں کے ذریعے استعمال کی گئی جب کہ اصل طاقت کمپنی کے پاس تھی۔ اس طرز حکومت کو دوہری حاکمیت یا کمپنی اور نوابی حکمرانی کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ عملی طور پر، دوہرا نظام ایک دھوکہ ثابت ہوا، کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے سیاسی طاقت کا استعمال کیا اور ہندوستانی ایجنسی کو اپنے مقاصد کے لیے محض ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کیا۔ اس کی وجہ سے انتظامی نظام درہم برہم ہو گیا۔ محصولات کی وصولی کے ساتھ معاشی بدحالی نے لوگوں کی مشکلات میں اضافہ کیا۔ تجارت میں کمپنی کے ملازمین کے شامل ہونے سے بھی برا اثر پڑا، جو بنگال کی داخلی تجارت میں اجارہ داری کر رہے تھے اور اپنی ذاتی ملکیت میں اضافہ کرنے لگے، چہ جائیکہ وہ کمپنی کی مالیت میں اضافہ کرتے۔

8.3 ابتدائی انتظامی قانون سازی (Early Administrative Legislation)

پلاسی اور بکسر کی لڑائیوں کے نتیجے میں کمپنی کی نیم خود مختار حیثیت نے کمپنی اور برطانوی پارلیمنٹ کے درمیان تعلقات سے متعلق بہت سے آئینی مسائل کو جنم دیا۔ برطانوی حکومت نے اپنے معاملات میں نظم وضبط کی بحالی کے لیے کمپنی کو منظم کرنے کا فیصلہ کیا۔

8.3.1 ریگولیٹنگ ایکٹ (Regulating Act, 1773)

1773 میں برطانوی وزیر اعظم نارتھ (North) نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاموں کو منظم اور کنٹرول کرنے کے لیے پارلیمان میں ایک بل پاس کیا جو ریگولیٹنگ ایکٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہندوستانی قانونی ترقی میں یہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ تجارتی کمپنی

کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس قانون نے سیاسی اور انتظامی کاموں کو قبول کیا۔اس ایکٹ کے ذریعے پارلیمنٹ نے کمپنی پر پارلیمانی کنٹرول قائم کرنے کی جرات مندانہ کوشش کی اور مرکزی انتظامیہ کا عنصر متعارف کرایا۔ایکٹ کی اہم دفعات یہ ہیں

- ایکٹ نے یہ حکم جاری کیا کہ مدراس اور بمبئی کے گورنر بنگال کے گورنر جنرل کے ماتحت ہوں گے۔ گورنر جنرل بمبئی اور مدراس کی حکومتوں کو کنٹرول کرنے کا مجاز تھا۔ایوان صدر کی حکومتوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ بنگال کے گورنر جنرل یا کمپنی کے ڈائریکٹرز کی سابقہ منظوری کے بغیر جنگ کا اعلان یا امن کا قیام اور نہ ہی ہندوستانی طاقتوں کے ساتھ معاہدے کریں۔
- گورنر جنرل کی معاونت کے لیے چار اراکین پر مشتمل ایک کونسل کا قیام عمل میں آیا جس کی میعاد پانچ سال کی تھی جس کے پاس اہم معاملات پر سفارش کرنے کا اختیار تھا۔
- کونسل کے گورنر کو قانون بنانے اور حکم جاری کرنے کا اختیار تھا۔
- فورٹ ولیم میں عدالت عظمی قیام عمل میں آیا۔اس میں ایک چیف جسٹس اور تین دیگر جج ہوتے تھے۔اس کے پاس دیوانی، فوجداری اور کلیسیائی کا دائرہ اختیار تھا، جو کہ ہندوستان میں موجود برطانوی عوام اور کمپنی کی ملازمین تک پھیلا ہوا تھا۔ کسی ہندوستانی اور انگریز کے درمیان تنازعہ ہو جائے اور ہندوستانی اس فیصلے کی پاسداری کرنے کو تیار ہو تو، عدالت عظمی کو اس مقدمہ کی سماعت اور فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل تھا لیکن قانونی معاملہ پانچ سو(500) روپے کے دائرے سے باہر نہ ہو۔۔
- برطانوی حکومت کی طرف سے دی جانے والی زیادہ تنخواہوں کی وجہ سے، گورنر جنرل کی کونسل کے اراکین، اور عدالت عظمی کے منصفیں کو کسی بھی قسم کے تحائف اور رشوت کو قبول کرنے اور کسی نجی کاروبار سے منسلک ہونے کی سختی سے ممانعت تھی۔
- قانون (ایکٹ) نے گورنر جنرل، ان کے کونسلروں، عدالت عظمی کے منصفیں، اور کمپنی کے دیگر ملازمین کی طرف سے کیے جانے والے جرائم کے مقدمات کی سماعت اور اس کی سزا دینے کا انتظام برطانیہ میں کیا ہے۔
- عدالت عظمی کی منظوری کے بغیر گورنر جنرل اور ان کی کونسل کی طرف سے بنایا گیا کوئی بھی قانون، آرڈیننس باضابطہ درست یا نافذ العمل نہیں ہو گا۔
- برطانیہ میں ان برطانوی لوگوں کے خلاف مقدمہ چلانے کا بندوبست کیا گیا جنہوں نے ہندوستان میں جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔

یہ ایکٹ مختلف حلقوں کی جانب سے تنقید کا نشانہ بن گیا تھا۔ خامیوں پر اس قسم کی تنقید کے ساتھ یہ ایکٹ صرف ایک گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے ساتھ 11 سال تک کار گر رہا اور اس کے بعد نئے ایکٹ کا مطالبہ کیا گیا۔

8.3.2 پِٹس انڈیا ایکٹ (Pitts India Act-1784)

اپنی ناکامی کے باوجود، ریگولیٹنگ ایکٹ، ان قوانین کے سلسلے میں پہلا تھا، جس نے حکومت ہند کے ساخت کو بدلا۔ 1781 میں پارلیمنٹ نے ایک سلیکٹ کمیٹی مقرر کی، جس نے کمپنی کے انتظامی نقائص کو بے نقاب کیا۔ بڑے غور و فکر کے بعد وزیر اعظم پٹ کے ذریعہ ایک نئے بل کی پیشکش کی گئی جسے آگسٹ 1784 میں پارلیمان میں منظور کیا گیا اور جسے پٹ ایکٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس ایکٹ نے

ہندوستان میں برطانوی انتظامیہ کے ڈھانچے میں کئی تبدیلیاں کی تھیں۔اس قانون نے کونسل کے ڈھانچے اور جنرل گورنر کے ساتھ صوبائی حکومتوں کے تعلقات میں اہم تبدیلیاں کیں۔ایکٹ کی اہم خصوصیات یہ تھیں۔ہندوستان کے معاملات کے بہتر کنٹرول کے لیے انگلینڈ میں چھ ارکان کے ساتھ ایک بورڈ آف کنٹرول قائم کیا گیا۔اس بورڈ کو تمام قوانین، کاروائیاں اور شہری و فوجی حکومت سے متعلق تمام معاملات کو حکم دینے اور انھیں کنٹرول کرنے کا اختیار تھا، اور ساتھ ہی ایسٹ انڈیز میں برطانوی ملکیت کا بھی کمپنی بورڈ پر مکمل اختیارات ک کا حامل تھا۔اس نے انگلینڈ میں دوہری حکومت کا نظام بنایا۔انگلینڈ میں دو خود مختار اتھارٹیز، بورڈ آف کنٹرول اور کورٹ آف ڈائریکٹرز کے زیر نگرانی ہندوستانی معاملات کو چلایا گیا۔ڈائریکٹرز کے ذمے کمپنی کی تجارتی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے اور ملازمین کی تقرری کا اختیار برقرار رکھا گیا تھا جبکہ بورڈ آف کنٹرول، ڈائریکٹرز کے کاموں پر نظر رکھتا تھا۔

- گورنر جنرل کی کونسل کے اراکین کی تعداد کم کر کے تین کر دی گئی۔
- صوبہ مدراس اور بمبئی پر کنٹرول کو حقیقی اور حتمی بنایا گیا۔
- گورنروں اور ڈائریکٹرز کی جانب سے تقرر کردہ ارکان کی مدد کے لیے ہر صوبے میں کونسل کے قیام کے لیے ایکٹ بنایا گیا۔
- کمپنی سے کہا گیا کہ وہ ہندوستان میں فتح اور تسلط کو بڑھانے کی اسکیموں پر عمل کرنے سے باز رہے۔
- تحفے تحائف لینے، دوسروں سے رشوت لینے کے رواج کو منع کرتے ہوئے، ایکٹ نے ہندوستان میں کمپنی کے ملازمین کے ذریعے کیے گئے جرائم کی سماعت کے لیے خصوصی عدالتوں کے قیام کا بھی بندوبست کیا۔

اس ایکٹ کی قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ کمپنی کے علاقوں کو پہلی بار 'ہندوستان میں برطانوی ملکیت' کے نام سے پکارا گیا تھا۔ کمپنی کے علاقے برطانوی سلطنت کا حصہ بن گئے۔ہندوستان کے تمام شہری، سیاسی اور فوجی امور پر تاج برطانیہ کا کنٹرول قائم ہو گیا۔

8.4 برطانوی پارلیمنٹ اور چارٹر ایکٹ (British Parliament and the Charter Acts)

ایک بار جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاقائی حصول اور انتظامی اور تجارتی کاموں پر پارلیمانی خود مختاری کا اصول مضبوط سی قائم ہو گیا تو کمپنی کے معاملات کا وقتاً فوقتاً پارلیمانی انتظام ضروری ہو گیا۔ چارٹر ایکٹ کا ایک سلسلہ 20 سالوں کے باقاعدہ وقفوں سے منظور کیا گیا- 1793، 1813، 1833، 1853۔

8.4.1 چارٹر ایکٹ (Charter Act of 1793)

1793 کا چارٹر ایکٹ پٹ (نوجوان) چھوٹے وزیر اعظم، ہینری ڈنڈاس، بورڈ آف کنٹرول کے صدر، اور گورنر جنرل کارنوالس نے پاس کیا۔ حکومت کے ڈھانچے میں، ایکٹ نے کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں کی۔اس کی بنیادی دفعات یہ ہیں:

- بورڈ آف کنٹرول کے ارکان اور اس کے عملے کی تنخواہیں ہندوستانی محصولات سے ادا کی جائیگی۔
- ہندوستان میں تاج برطانیہ افواج کے اخراجات کمپنی کو ادا کیے جائینگے۔

- تاج برطانیہ کو محصولات کو ہندوستان کے دفاع میں ضرورت کے وقت استعمال کرنے اختیار حاصل تھا۔
- گورنر جنرل کی طرح، صوبائی گورنروں کو مخصوص حالات میں اپنے کونسل کے فیصلے کو رد کرنے کا اختیار تھا۔
- خارجہ پالیسی سے متعلق معاملات میں صوبائی گورنروں پر گورنر جنرل کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا۔
- ایکٹ نے کمپنی کی تجارتی اجارہ داری کو مزید 20 سال کے لیے بڑھادیا۔
- ایکٹ نے یہ طے کیا کہ گورنر جنرل یا گورنر یا کمانڈر انچیف اپنے عہدہ کے دوران چھٹی پر ہندوستان سے باہر نہیں جائیں گے۔
- اس نے مزید دہرایا کہ تاج برطانیہ نے ہندوستان میں مزید فتوحات اور تسلط میں توسیع کی منظوری نہیں دی۔
- ایکٹ نے کونسل کے اراکین کی تعداد کم کرکے تین کردی اور کہا کہ صرف وہی لوگ اس کے اہل ہیں جنہوں نے ہندوستان میں 12 سال کی خدمات کی ہوں۔
- کمپنی کے ملازمین کی طرف سے تحائف دینا اور تحائف لینا سختی سے ممنوع تھا۔
- مقامی اداروں کو شراب کی فروخت کے لیے لائسنس دینے کا اختیار دیا گیا تھا۔
- ایکٹ نے بورڈ آف کنٹرول کے اراکین کو 6 سے کم کرکے 5 کردیا۔
- ایکٹ نے مشرقی تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری کی تجدید کے علاوہ، نجی افراد کو 3000 ٹن شپنگ تک تجارت کرنے کی بھی اجازت دی۔
- اس میں اس بات کی بھی وضاحت کی گئی تھی کہ کمپنی کے متوقع سالانہ منافع میں سے قرضوں کی ادائیگی کے لیے 5 لاکھ علاحدہ کیے جائیں اور باقی ماندہ حصص مالکان (share-holders) میں بطور منافع (dividend) تقسیم کیے جائیں۔
- ہندوستان اور انگلینڈ دونوں میں کمپنی کے معاملات کے بارے میں سالانہ تفصیلات پارلیمان میں پیش کرنا ضروری ہے۔
- اس ایکٹ کی سب سے قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ بورڈ آف کنٹرول کے تنخواہوں کے اخراجات ہندوستانی محکمہ خزانہ (عامرہ) سے حاصل کئے۔ اس نے ہندوستانی وسائل کو پوری طرح تباہ کردیا تھا جس کی وجہ سے دولت ختم ہوگئی۔

8.4.2 چارٹر ایکٹ (Charter Act of 1813)

مشرقی نصف کرہ کے تجارت پر کمپنی کا تصرف (اجارہ داری) دوسرے انگریز تاجروں کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ تھا جو کہ (laissez-faire) کے نظریہ سے متاثر تھے اور وہ معاشی آزادی اور اجارہ داری کی تجارت کا خاتمہ چاہتے تھے۔ ماحول کی بدلتی ہوئی صورت نے ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی جس سے کمپنی کی تجارتی ساکھ (position) کو شدید خطرہ لاحق ہوگیا۔ مجموعی طور پر اسے سنگ میل کے طور پر سراہا گیا ہے جس کا اثر ملک کی مستقبل کی حکمرانی پر تھا۔۔ بلاشبہ، اس نے کمپنی کی طاقت اور اختیار کے زوال کا آغاز کیا۔ ایسے پس منظر کے ساتھ 1793 کا چارٹر ایکٹ 1813 میں تجدید کے لیے آیا اور اسے منظور کرلیا گیا۔

اس کی اہم دفعات میں درجہ ذیل چیزیں شامل ہیں:

- ہندوستان کے ساتھ تجارت اور تجارتی کمپنی کی اجارہ داری کو ختم کر دیا گیا اور تجارت کو دوسرے انگریز تاجروں کے لیے برابری کی بنیاد پر کھول دیا گیا۔
- کمپنی کو مزید 20 سال، چین کے ساتھ تجارت کی اپنی اجارہ داری سے فائدہ حاصل کرنے کی اجازت دی گئی۔
- تاج برطانیہ کے زیر حکومت کمپنی کو مزید 20 سال کے لیے ہندوستانی علاقوں پر عروج اور محصولات سے فائدہ حاصل کرنے کی جازات دی گئی۔
- بورڈ آف کنٹرول کو کمپنی کے ملازمین کی شہری اور فوجی تربیت کو کنٹرول کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔
- سب سے بڑھ کر اس ایکٹ نے شعبہ تعلیم میں قابل قدر اعانت کی۔ اس نے کمپنی کو حکم دیا کہ وہ ہندوستان میں برطانوی باشندوں میں ادب کی بحالی و بہتری اور سائنسی علوم میں ترقی کے لیے سالانہ ایک لاکھ روپے مختص کرے۔
- عیسائی مشنریوں کو ہندوستان میں عیسائی مذہب پھیلانے کی اجازت دی گئی۔
- ایکٹ نے کمپنی کو اپنے علاقائی اور تجارتی اکاؤنٹس کو الگ الگ رکھنے کا مطالبہ کیا۔۔
- کونسل میں گورنر جنرل اور گورنروں تقرر کے سلسلے میں بورڈ آف کنٹرول کی منظوری کو لازمی قرار دیا گیا۔
- اس نے مقامی حکومتوں کو لوگوں پر ٹیکس لگانے اور عدم ادائیگی پر مجرموں کو سزا دینے کا اختیار دیا۔
- فوجداری انصاف کے انتظام کے سلسلے میں چوری، جعلسازی اور سکوں کی غیر قانونی ٹکسالی جیسے جرائم کے لیے خاص سزاؤں کا نظم کیا گیا۔
- ایکٹ نے کمپنی کو ہندوستانی فوجیوں کے لیے قواعد وضوابط بنانے اور مجرموں کو سزا دینے کے لیے کورٹ مارشل کرنے کا اختیار دیا تھا۔
- یورپیوں کے فائدے کے لیے کلکتہ میں ایک بشپ اور اس کے ماتحت تین آرچ ڈیکنز کی تقرری کے لیے بھی انتظامات کیے گئے ہیں۔ اس سے ہندوستان میں چرچ کے باقاعدہ قیام کا آغاز ہوا۔

اس طرح، 1813 کے چارٹر ایکٹ نے تاج برطانیہ کی خود مختاری پر زور دیا، بورڈ آف کنٹرول کی طاقت کو بڑھایا، کمپنی کے تجارتی مراعات کو کم کیا، اپنے ملک کے زیادہ اقتصادی فائدے کے لیے ہندوستان کو تمام انگریز تاجروں کے لیے کھول دیا اور ہندوستان میں مذہبی سرگرمیوں کے لیے عیسائی مشنریوں کو آنے کی اجازت دی گئی۔ مغربی تعلیم کا فروغ برطانوی حکومت کے لیے بھیس بدل کر ایک نعمت ثابت ہوا۔ اس نے انگریزوں کو سستے کلرک حاصل کرنے کے قابل بنایا۔ انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے ہندوستانی اپنی تہذیب سے نفرت کرنے لگے اور مغرب سے آنے والی ہر چیز کی تعریف کرنے لگے۔ فیاضانہ رویوں کے ذریعے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے عیسائی مشنریوں کے آنے سے لوگوں میں تبدیلی کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔ آزاد تجارت کی پالیسی ٹیکسٹائل کے صنعت کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ملک کا بنا ہوا معمولی کپڑا" لنکا شائر "مل کے بنے ہوئے کپڑے کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ٹیکسٹائل انڈسٹری کے زوال کے بدولت معیشت مکمل انحصار زراعت پر ہو گیا۔

8.4.3 چارٹر ایکٹ (Charter Act of 1833)

1813 سے 1833 کے عرصے میں کمپنی کے علاقوں میں مزید پھیلاؤ دیکھا گیا۔ برطانیہ میں سیاسی منظر نامہ یکسر بدل چکا ہے۔ جب پارلیمان میں چارٹر ایکٹ تجدید کے لیے پیش کیا گیا تھا اس وقت آڈم اسمتھ کا آزاد تجارت (*Laissez-faire*) کا نظریہ کافی مقبول ہو چکا تھا۔ ہندوستان کو بھی باوقار ادارہ قرار دینے کے حق میں رائے بڑھ رہی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے جاری رہنے کے حوالے سے ایک منقسم رائے قائم ہو چکی تھی۔ اس طرح کی الجھنوں کے درمیان، پارلیمنٹ نے 1833 کا چارٹر ایکٹ پاس کیا۔ کمپنی نے اپنی عظمت، وارثین اور جانشینوں کے اعتماد کی بنا پر ہندوستان پر حکومت کرنے کا اپنا اختیار برقرار رکھا۔ لیکن تجارتی لحاظ سے کمپنی ختم ہو گئی۔ ہندوستان میں کمپنی کی حیثیت حاکم کے طور پر باقی رہی لیکن اس کی تاجرانہ حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ اسی طرح اس نے چین کی اجارہ داری بھی کھو دی کیونکہ وہ تمام تاجروں کے لیے کھول دی گئی تھی۔ ایکٹ کی اہم دفعات یہ ہیں:

- ایکٹ نے بنگال کے گورنر جنرل کے عہدے کو ہندوستان کے گورنر جنرل کے طور پر دوبارہ نامزد کیا اور لارڈ ولیم بینٹک ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل بنے۔
- ایکٹ نے گورنر جنرل کو انتظامی، قانون سازی اور مالی معاملات میں وسیع تر اختیارات فراہم کیے ہیں۔ نظم و نسق میں اس کا اختیار تمام معاملات میں بنگال، بمبئی اور مدراس کی صوبوں پر قائم ہوا۔
- کونسل میں گورنر جنرل کو ملک کے لیے قانون بنانے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اور ہندوستان کی تمام عدالتوں کے ذریعے ان قوانین نافذ کرنا تھا۔
- گورنر جنرل تاج برطانیہ کے استحقاق اور پارلیمنٹ کے اختیارات میں مداخلت کرنے کا کوئی اختیار نہیں رہے۔، لیکن بصورت دیگر وہ ملک کے اعلیٰ قانون ساز بن جائیں گئے۔
- قانون سازی کی سرگرمیوں کے لیے تکنیکی مدد فراہم کرنے کے لیے، ایک رکن کو مجلس منتظمہ (Executive Council) میں شامل کیا گیا۔ اور لارڈ میکالے (Lord Macaulay) اس مجلس پہلے رکن تھے۔
- مرکزی حکومت نے صوبائی حکومتوں سے ٹیکس لگانے اور اخراجات سے متعلق ان کے تمام سابقہ اختیارات چھین لیے گئے۔
- پورے برطانوی ہندوستان کے محصولات کو مرکزی حکومت اپنے ہیڈ کوارٹر سے کنٹرول اور منظم کرتی تھی۔ اخراجات کی ہر چیز کے لیے حکومت ہند کی منظوری درکار تھی۔
- ایکٹ نے تجارت اور مشنری کا کام یا کسی بھی قانونی کام کے لیے ہندوستان میں برطانوی عوام کی ہجرت پر سے تمام تحدیدات ہٹا دیے۔
- اس ایکٹ نے گورنر جنرل اور گورنروں کے حق استرداد بھی (Veto Powers) کا تعین کیا۔
- ایکٹ کے مطابق تقرری کے معاملے میں ہندوستانیوں کے ساتھ کسی بھی قسم کا امتیازی سلوک کی اجازت نہیں ہے۔
- ہر صوبائی کونسل کے ارکان کو 2 سے 3 کر دیا۔
- کمپنی کی تجارتی لحاظ سے دستبرداری کے بعد اس پر واجب الادا تمام قرضوں کو ادا کرنے کا انتظام کیا گیا اور اس کے تمام قرض اور واجبات

ہندوستانی محصولات سے ادا کیے گئے۔

- بورڈ آف کنٹرول کے صدر ہندوستانی امور کے وزیر بن گئے۔اس کے تحت دو اسسٹنٹ کمشنر اور ایک سیکرٹری تھے۔
- ایکٹ نے اودھ صوبے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک نئے صوبے آگرہ کے قیام کا انتظام کیا۔

اس ایکٹ نے کمپنی کی ہیت کو جوائنٹ اسٹاک کمپنی سے ایک حکمران ادارے میں تبدیل کر دیا اور ہندوستانی انتظامیہ کو ایک مضبوط مرکزی نظام میں دوبارہ منظم کیا جس میں گورنر جنرل اس کا محور تھا۔اب ہندوستانیوں کے لیے انتظامی عہدوں، جیسے کہ ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ کے لیے دروازے کھل گئے تھے۔ قانون سازی کی مرکزیت کے ساتھ اس نے ملک میں قوانین کی یکسانیت کو یقینی بنایا۔انڈین پینل کوڈ اور ضابطہ دیوانی اور فوجداری طریقہ کار وجود میں آئے۔اس ایکٹ نے سیاسی اور جذباتی طور پر ملک کے اتحاد کو بھی فروغ دیا۔

8.4.4 چارٹر ایکٹ (Charter Act of 1853)

برطانوی پارلیمان کی جانب سے منظور کردہ چارٹر ایکٹوں میں سے یہ ایک ایکٹ آخری ہے۔ہندوستان میں کمپنی کے خلاف بڑھتے ہوئے اعتراضات اور بنگال، بمبئی اور مدراس تینوں صوبوں میں مقامی باشندوں کے احتجاج نے اس کو زک پہنچایا(متاثر کیا)۔ مدراس کے لوگوں نے اپنے عرضی میں عوامی کاموں کی تشکیل اور شعبے تعلیم میں مزید سہولیات کا پرزور مطالبہ کیا۔ بمبئی کی عوام نے بورڈ آف کنٹرول اور بورڈ آف ڈائریکٹرز کی جگہ ہندوستانی کونسل کے قیام کی خواہش کی۔بنگالی عوام کی جانب سے جو درخواست پیش کی گئی تھی اس میں اس بات کا مطالبہ تھا کہ انگلینڈ میں موجود دوہرے نظام حکومت کے بجائے ہندوستانی کونسل کی مدد سے سکریٹری آف اسٹیٹ ہونا چاہیے۔ہندوستانیوں کو اعلی عہدوں پر فائز کرنے میں کمپنی کی ناکامی پر بھی اس عرضی کے ذریعہ احتجاج کیا گیا تھا۔مزید یہ کہ ہندوستان میں جزوی مجلس مقننہ کے نمائندے کے قیام کا بھی مطالبہ کیا گیا تھا۔

اگلے 20 سال کے لیے کمپنی کے اختیارات میں کوئی توسیع نہیں ہوئی۔

ایکٹ کے اہم دفعات یہ ہیں۔

- بورڈ آف کنٹرول کے درجہ میں اضافے کے ساتھ ساتھ صدر کی تنخواہ کو بھی برطانوی کابینہ کے دوسرے پرنسپل آف سکریٹری کے برابر کر دیا گیا۔
- کورٹ آف ڈئریکٹر کے صدر کے درجہ میں مزید کمی کے ساتھ اس کے اراکین کو گھٹا کر 24 سے 18 کر دیا گیا۔چھ اراکین کا انتخاب اب بھی تاج برطانیہ کی جانب سے کیا جائے گا۔
- ایکٹ نے ہندوستانی خدمات(Indian Services)میں تقرری کے لیے مسابقتی امتحانات کا انتظام کیا۔
- اس ایکٹ نے حلقہ مقننہ (قانون سازی کے میدان) میں زبردست تبدیلی لایا۔جنرل کونسل کے گورنر کے سابقہ رکن کو انتظامی مجلس (ایگزیکیٹیو میٹنگ) میں بیٹھنے اور رائے (ووٹ) دینے کا حق دیا گیا۔جب کہ یہ حق اسے پہلے حاصل نہیں تھا۔
- قانون سازی کے مقصد کے پیش نظر گورنر جنرل کے انتظامی مجلس (ایگزیکٹیو کونسل) میں چھ نئے ارکان کا اضافہ کیا گیا۔اور وہ "ارکان

مقننہ" کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

- مقننہ کو حکومت کے انتظامی ونگ سے الگ شاخ کے طور پر تسلیم کیا گیا اور گورنر جنرل، کمانڈر انچیف، کونسل کے چار اراکین اور چھ نئے قانون ساز اراکین نے مل کر مجلس مقننہ تشکیل دی۔
- چھ ارکان مقننہ چیف جسٹس، کلکتہ کی عدالت عظمی کے منصف، اور چار سرکاری اہلکار جو چار صوبوں مدراس، بمبئی، بنگال اور شمال مغربی صوبہ کی حکومتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔
- گورنر جنرل کے بوجھ کو کم کرنے کے نام پر ایکٹ نے، خاص بنگال کے لیے ایک گورنر اور پنجاب کے لیے ایک نائب گورنر کا انتظام کیا گیا۔
- نئے صوبے جیسے آسام، وسطی صوبے، شمال مغربی سرحدی صوبہ، برما، اور برطانوی بلوچستان اور دہلی میں بنائے گئے۔
- گورنر جنرل کونسل کے ہر رکن کی تنخواہ 500 پاؤنڈ سالانہ مقرر کی گئی۔
- ماہرین کی رائے کے لئے ہر بل کو منتخب کمیٹی کے ذریعہ منتخب کردہ قوانین کے نفاذ کا برطانوی طریقہ کار متعارف کرایا گیا
- کسی بھی بل کو وضع کرنے کے لیے مجلس مقننہ کو گورنر جنرل کی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسے ویٹو پاور بھی حاصل ہے۔

اس ایکٹ کی خوش آئند خصوصیت قانون سازی کے مقاصد کے لیے گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل میں توسیع تھی۔ مقننہ ونگ نے چھوٹے پارلیمان کے طور پر کام کرنا شروع کیا اور اسی طریقہ کار کو اپنایا جو برطانوی پارلیمان میں رائج تھا۔ اس ایکٹ نے ایگزیکٹو کونسل کے ارکان کی تعداد کو بھی 24 سے گھٹا کر کے 18 کر دیا تھا جن میں سے چھ کو تاج برطانیہ نے ان افراد میں سے نامزد کیا تھا جنہوں نے کم از کم دس سال ہندوستان میں خدمات انجام دی تھیں۔ یہ کمپنی کی کم ہوتی ہوئی طاقت کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک اور فائدہ مند پہلو شہری خدمات (سول سروسیز) کے لیے امتحانات کا شروع کرنا تھا۔ لیکن یہ ایکٹ دوہری حکومت کی شکل کو ختم کرنے میں ناکام رہا کیونکہ کورٹ آف ڈائریکٹرز اور بورڈ آف کنٹرول کی بالادستی ہندوستانی معاملات میں مؤثر طریقے پر کام کر رہی تھی۔

8.5 تاج برطانیہ کو اقتدار کی منتقلی (Transfer of Power to the Crown)

1857 کی بغاوت نے قانون کی تاریخ میں نئے افکار کو جنم دیا۔ بغاوت کے نتائج اتنے شدید تھے کہ اس نے سیاسی بالادستی کو بدل کر رکھ دیا۔ اور حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے برطانوی تاج برطانیہ کو منتقل کرنے کے ساتھ اسی پس منظر میں ایک قانون وضع کیا۔ سیاسی اقتدار کا یہ بدلاؤ، طرز حکومت میں دوررس تبدیلی لانے میں مددگار ثابت ہوا۔ جو 1858 میں ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے بعد ظاہر ہوا۔

8.5.1 1858 کا قانون (The Act of 1858)

اس قانون نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے طویل دور حکومت کا خاتمہ کیا۔ اور حکومت ہند کو تاج برطانیہ کے حوالے کیے جانے کا مشورہ بھی دیا، ڈائریکٹر اور پروپرائٹر آف کورٹ کے صفائے کے بعد تاج برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کے معاملات کے انتظام کے لیے کابینہ کے وزیر

کے زیر نگرانی ایک مجلس انتظامی اقیام کیا۔اس قانون کے دفعات درجہ ذیل ہیں۔

- ملکہ کے ریاست کے پرنسپل سیکرٹری تمام اختیارات کے حامل اور ہندوستانی محصولات اور حکومت سے متعلق تمام فرائض کو انجام دیتے تھے۔جو کہ پہلے کورٹ آف ڈائریکٹر اور کنٹرول بورڈ استفادہ حاصل کرتے تھے۔اسی مقصد کے تحت ریاستی سیکرٹری کا قیام عمل میں آیا تھا۔
- ریاست کے سیکرٹری عملہ کی تنخواہ ہندوستانی محصولات سے دی جائیگی۔
- سیکرٹری آف اسٹیٹ کی امداد کے لیے ہندوستانی کونسل کے طرز پر 15 اراکین پر مشتمل ایک مجلس (کونسل) تشکیل دی گئی۔
- مؤخر الذکر کو کونسل کے صدر کی حیثیت سے کام کرنا تھا جو ہندوستانی انتظامی امور کو چلاتا تھا۔کونسل کے ارکان کی تنخواہیں ہندوستانی محصولات سے ادا کی جائیگی۔سیکرٹری آف اسٹیٹ، کونسل کو برخواست بھی کر سکتا ہے۔
- اس قانون نے ہندوستان کے گورنر جنرل کو تاج برطانیہ کا براہ راست نمائندہ بنادیا اور اسے انتظامیہ اور شہری وہ فوجی انتظام کو کنٹرول کرنے اور ان کی رہنمائی کرنے کے اختیارات عطا کیے۔
- تاج برطانیہ، گورنر جنرل اور صوبوں کے گورنروں کا انتخاب کرتا تھا،اور نائب گورنر کا تقرر،تاج برطانیہ کی اجازت سے گورنر کرتا تھا،
- ہندوستان کے مختلف کونسلوں کے اراکین کا تقرر سیکرٹری آف اسٹیٹ ان کونسل یکجانب سے ہوتا تھا۔
- سیکرٹری پارلیمان میں ہندوستانی کھاتوں اور ملک کی ترقی کی رپورٹ پیش کرتا ہے۔
- ہندوستانی کونسل ایک مشاورتی کمیٹی تھی،اور سیکرٹری آف اسٹیٹ پر اس کی رئے سے متفق ہونا لازم نہیں تھا۔
- سیکرٹری آف اسٹیٹ کونسل کے رائے کو رد کر سکتی تھی لیکن اس واقعہ کا مناسب حفاظت کرنے کے بعد۔
- سیکرٹری آف کونسل کو اعتماد میں لیے بغیر جنگ،امن یا مذاکرات سے متعلق اپنے خفیہ احکامات حکومت ہند کو بھیج سکتی تھی۔
- ہندوستانی شہری خدمات (Indian Civil Service) میں داخلے کے انتظامات کے اصول وضوابط بھی بنا سکتی تھی۔
- سیکرٹری آف اسٹیٹ قانونی،مالیاتی اقدامات،ریلوے سے پراجکٹ اور عوامی کاموں اور نئے منصوبوں کو بنانے اور حکومت کے تمام پالسی معاملات کو کنٹرول کرنے کے لیے۔

ایکٹ کے خلاف زبردست اعتراضات اٹھے۔ہندوستانیوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ حکومت کی منتقلی سے انھیں کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ پارلیمان نے اصل ذمہ داریوں کو چھوڑ کر سیکرٹری آف اسٹیٹ اور ہندوستانی وائسرائے پر مکمل بھروسہ کیا۔

8.5.2 ملکہ وکٹوریہ کا عام اعلان (Queen Victoria's Proclamation: 1858)

- یکم نومبر 1858 کو الہ آباد کے شاہی دربار میں منعقدہ تقریب میں 1858 کے ایکٹ کی بنا پر تاج برطانیہ کو حکومت سونپ دی گئی اور اسی تقریب میں لارڈ کیننگ نے ملکہ وکٹوریہ کا اعلان کیا۔
- اعلان نے لارڈ کیننگ کو ملکہ کا پہلا وائسرائے اور تمام ہندوستانی علاقوں کا جنرل گورنر مقرر کیا۔

- تاج برطانیہ مقامی شہزادوں کے اپنے حقوق، وقار اور عزت کا احترام کرے گا
- ہندوستان کے لوگوں کے حوالے سے اعلان میں کہا گیا: 'یہ ہماری مزید خواہش ہے کہ جہاں تک ہو سکے، ہماری رعایا، کسی بھی نسل یا مسلک سے تعلق رکھنے والے، ہماری خدمات کے دفاتر میں جن کے فرائض میں وہ اپنی تعلیم، قابلیت اور دیانتداری کے اعتبار سے اہل ہو سکتے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ طور پر داخل ہو سکتے ہیں۔

8.6 ہندوستانی کونسلز قوانین (Indian Councils Acts)

برطانیہ نے ہندوستان میں انتظامی امور کی ترقی کی حوصلہ افزائی کی جب بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ اس میں مزید ترقی کی ضرورت تھی۔اسی لیے سلسلہ وار طریقے سے انڈین کونسل ایکٹ کو روبہ عمل لایا گیا تاکہ ہندوستانیوں کو ہندوستانی حکومت کے قریب لایا جاسکے۔

8.6.1 ہندوستانی کونسل ایکٹ (Indian Councils Act of 1861)

وائسرائے لارڈ کیننگ ایگزیکٹو کونسل اور اس کے اختیارات سے خوش نہیں تھا بلکہ وہ تمام اختیارات اپنے اختیار میں رکھنا چاہتا تھا۔اسی غرض سے اس نے پورٹ فولیو سسٹم متعارف کرایا جس کے ذریعے مجموعی طور پر ایگزیکٹو کونسل نے وسیع پالیسی امور اور عام دلچسپی کے بڑے مسائل پر تبادلہ خیال کیا۔کونسل کے انفرادی ارکان کو معمولی محکمانہ امور کی ذمہ داری دی گئی۔اس طرح ہر ایک کے پاس ایک قلمدان تھا۔کیننگ کی اختراع کو 1861 کے انڈین کونسل ایکٹ نے قانونی حیثیت دی تھی۔اس ایکٹ کی اہم دفعات یہ ہیں:

- ایکٹ نے وائسرائے کی کونسل میں ایک عام رکن کو شامل کرکے اس کی توسیع کی تھی۔جس میں پانچواں رکن مالیاتی ماہر ہونا تھا۔
- وائسرائے کو کاروبار کے آسان لین دین کے لیے قواعد وضوابط بنانے کا اختیار دیا گیا تھا۔
- ایکٹ نے وائسرائے کو اس طاقت سے مسلح کیا کہ اگر وہ محسوس کرتے ہیں کہ ایگزیکٹو کونسل کی طرف سے منظور کردہ بل برطانوی ہندوستان کے تحفظ، امن اور مفاد کو متاثر کرتا ہے تو وہ اپنے ویٹو پاور کو استعمال کرنے کے لیے اس کی منظوری کو روک سکتا ہے۔
- وائسرائے کو انتظامی سہولت کے لیے صوبوں کی حدود میں ردوبدل، ترمیم یا ترتیب یا نیا صوبہ بنانے کا اختیار دیا گیا تھا۔
- وائسرائے کو اختیار تھا کہ اگر وہ ضروری سمجھے تو صوبے کی حدود میں ردوبدل کر سکتا ہے۔
- قانون ساز کونسل کی تنظیم نو کے لیے ایکٹ، صوبائی حکومتوں کے نمائندوں کی جگہ، قانون سازی کے مقاصد کے لیے سنٹرل ایگزیکٹو میں 6 تا 12 مزید اراکین کا انتظام کیا تھا۔اضافی ارکان میں سے نصف غیر سرکاری تھے۔
- قانون سازی کے مقاصد کے لیے ایک ایڈووکیٹ جنرل اور 4 تا 8 اراکین کے اضافے کے ذریعے مدراس اور بمبئی کی ایگزیکٹو کونسلوں کو بڑھانے کے لیے ایکٹ فراہم کیا گیا ہے۔صوبائی قانون ساز کونسل صوبے کی اچھی حکومت کے لیے قوانین بنا سکتی ہے۔
- فوج، رواج، کرنسی اور سکے، ڈاک اور ٹیلی گراف، غیر ملکی اور سیاسی تعلقات، تاہم، قانون سازی کے دائرہ کار سے باہر تھے۔گورنر کو اس کے پاس ہونے والے تمام بلوں کی منظوری کا اختیار تھا۔

- اس کے علاوہ گورنر جنرل کی منظوری بھی ضروری تھی۔

سیکرٹری آف سٹیٹ ان کونسل بھی تاج برطانیہ کی منظوری سے اس کو منسوخ کر سکتا ہے

- وائسرائے کو ایمرجنسی کے دوران فرمان جاری کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اس طرح کے قوانین کی مدت چھ ماہ تھی اور اسے ریاست کے سکریٹری اس سے پہلے بھی معطل کر سکتے تھے۔
- عوامی قرضوں، فوج، سکے اور کرنسی، غیر ملکی اور سیاسی تعلقات، پوسٹس اور ٹیلی گراف وغیرہ جیسے اہم معاملات سے متعلق بلوں کو متعارف کرانے کے لیے وائسرائے کی پیشگی منظوری ضروری تھی۔
- ہر ایوان صدر (بمبئی، مدراس، اور بنگال) کے گورنر کو قانون سازی کے مقاصد کے لیے ایڈوکیٹ جنرل کے علاوہ کم از کم چار اور زائد از زائد آٹھ اراکین کو نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔
- صوبائی قانون ساز کونسل صوبوں کی بہتری کے لیے مرکز کے مجموعی کنٹرول اور پابندیوں کے تابع قانون بنا سکتی ہے۔

ایکٹ نے انتظامیہ کے کچھ اچھے اصولوں کی بنیاد رکھی۔ مثال کے طور پر، اس نے ایک پورٹ فولیو نظام متعارف کرایا، قانون کی طاقت اور غیر سرکاری افراد کے ساتھ قانون سازی کا نظام، جو اب تک انتظامیہ کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ توقعات کو پورا کرنے میں ناکام رہا۔ اس ایکٹ کے ذریعے فراہم کردہ قانون ساز کونسلیں قانون سازی میں ایگزیکٹو کی مدد کے لیے محض کمیٹیاں بن گئیں۔ انہیں حکومت پر کسی قسم کی جانچ پڑتال کرنے کا اختیار نہیں تھا، اور نہ ہی وہ اپنی مطلوبہ معلومات طلب کر سکتے تھے۔ گورنر جنرل کو دیے گئے ویٹو پاور نے کونسلوں کی خود مختاری کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس ایکٹ نے ہندوستان میں نمائندہ حکومت کی ترقی کی طرف کوئی پیش رفت نہیں کی۔

8.6.2 ہندوستانی کونسل ایکٹ (Indian Councils Act of 1892)

19ویں صدی کے آخر تک، 1861 کے ایکٹ کے ذریعے بنائے گئے قانون ساز ادارے پرانے ہو گئے۔ وہ بہت معمولی دکھائی دیتے تھے، اور ان کی طاقتیں بہت محدود تھیں۔ ہندوستانیوں کی ابھرتی ہوئی نسل نے قانون سازی کے شعبوں میں مزید حقیقی طاقت کا مطالبہ کیا۔ انتخابی اصولوں کے حق میں آوازیں سنی گئیں۔ ایسے بدلتے ماحول میں پارلیمنٹ نے ہندوستانی کونسل ایکٹ 1892 جاری کیا۔ یہ ایکٹ لارڈ ڈفرن کی طرف سے دی گئی ہدایات کی روشنی میں نافذ کیا گیا تھا، جس نے ہندوستانیوں پر غیر دستوری حکمرانی کے تحت رکھنے کی ضرورت پر زور دیا تھا کیونکہ ان کا مقدر ایسا ہی ہے۔ یہ صرف ایک ترمیمی ایکٹ تھا، اس لیے بنیادی طور پر حکومت ہند کا ڈھانچہ وہی رہا جیسا کہ سابقہ میں نافذ العمل تھا۔ ایکٹ کی دفعات یہ ہیں:

- ایکٹ نے کونسلوں میں مزید اراکین کی تعداد میں اضافے کے لیے انتظامات کیے ہیں۔ مرکزی کونسل میں قانون سازی کے لیے اضافی اراکین کی کم از کم تعداد 8 سے بڑھا کر 10 اور زیادہ سے زیادہ 12 سے 16 کر دی گئی۔
- گورنر جنرل-ان-کونسل کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اراکین کی نامزدگی کے حوالے سے قواعد بنائے جو اپنے حق کو استعمال کرنے کے لیے

سیکرٹری آف سٹیٹ-ان-کونسل کی منظوری سے مشروط ہوں۔

- مقننہ کے ارکان کے اختیارات میں قابل تعریف اضافہ ہوا کیونکہ وہ اب بجٹ پر بحث میں حصہ لے سکتے تھے لیکن ووٹنگ کے حق کے بغیر۔
- تمام اراکین کو جنرل گورنر یا لیفٹیننٹ گورنر کے ذریعے نامزد کیا جانا تھا۔ کسی بھی جگہ خالی ہونے کی صورت میں بھی وہ اسی حق کا استعمال کر سکتے ہیں۔
- صوبائی قانون ساز کونسلوں کو گورنر جنرل کی پیشگی اجازت سے نئے قوانین بنانے یا پرانے قوانین کو منسوخ کرنے کا بھی اختیار دیا گیا تھا۔
- کونسلوں میں ایک اختیاری عنصر متعارف کرایا گیا تھا۔ منتخب ارکان حکومت کے سربراہ کی طرف سے نامزد ہونے کے بعد ہی اپنی نشست سنبھال سکتے تھے۔
- شاہی مقننہ کے معاملے میں، چیمبر آف کامرس سے کہا گیا کہ وہ ناموں کا ایک فہرست جمع کرائے جو انتخابات کے ذریعے چنے گئے ہوں اور گورنر جنرل نے مرکزی مقننہ کی رکنیت کے لیے ایک نام کی منظوری دی۔
- صوبوں میں میونسپل کمیٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈز، زمینداروں اور یونیورسٹیوں کے ایوان بالا نے گورنر کو اس شخص کی سفارش کی۔
- 1892 کے ایکٹ کے ذریعے مقننہ تشکیل دی گئی جو بعد میں کچھ سرکردہ ہندوستانیوں کے لیے مقننہ کے ممبر بننے کا پلیٹ فارم بن گئی۔ انتخابی اصول کو پہلی بار ایکٹ کے ذریعے قبول اور متعارف کرایا گیا تھا۔

ہندوستانی نژاد افراد کو وائسرائے کے ساتھ بیٹھنے اور اپنے ملک کے لیے قانون سازی کے حق کو بانٹنے کا موقع ملا۔ اس کے باوجود اس ایکٹ کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس ایکٹ میں قانون ساز کونسل کے نمائندوں کے انتخاب کا بندوبست نہیں کیا گیا۔ وہ افراد جو بالواسطہ انتخابات کے ذریعے مقننہ میں آئے انہوں نے حقیقی معنوں میں عوام کی نمائندگی نہیں کی۔ بحث کی سہولتیں محدود تھیں کیونکہ سالانہ مالیاتی گوشوارے پر بحث کے حق کی اجازت تھی لیکن اراکین کوئی قرارداد پیش نہیں کر سکے اور نہ ہی اس پر ووٹنگ کا مطالبہ کر سکے۔ حکومت ہند پر سکریٹری آف اسٹیٹ کے کنٹرول میں نرمی نہیں کی گئی تھی کیونکہ تمام غیر سرکاری بلوں کو پیش کرنے سے پہلے سکریٹری آف اسٹیٹ کی منظوری لینی پڑتی ہے۔ ممبران کا دائرہ کار بھی محدود تھا کیونکہ انہیں ضمنی سوالات نہیں پوچھنے تھے اور نہ ہی کسی سوال کے جواب پر بحث کی اجازت تھی۔ برادریوں کی نمائندگی بھی مناسب نہیں تھی۔

8.7 آئینی حکمرانی کی ساخت میں اصلاحات

(Structural Reforms towards Constitutional Governance)

1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل اور اس کی قیادت میں ہندوستانی قومی تحریک نے مزید آئینی اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ ان کے مطالبات کانگریس کی طرف سے منظور کردہ قراردادوں کی شکل میں برطانوی گورنر جنرل کو درخواست دینے کی شکل میں تھے۔ ان سب

نے انگریزوں کو ہندوستان میں آئینی طرز حکمرانی فراہم کرنے اور اس طرح معاشرے میں تعلیم یافتہ طبقات کی وفاداری حاصل کرنے کے لیے ساختی اصلاحات لانے کی ضرورت کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا۔ ان کی ذہنیت میں اس قسم کی تبدیلی نے 1909 کے ہندوستانی کونسل ایکٹ کو نافذ کیا، جو منٹو-مورلے اصلاحات کے نام سے مشہور تھا۔

8.7.1 1909 کا ایکٹ (Act of 1909)

بنگال کی تقسیم کی قرارداد کی اشاعت نے ہندوستانیوں کو وسیع پیمانے پر احتجاج کے لیے اکسایا۔ انگلستان میں لبرلز کے اقتدار میں آنے کے ساتھ ہی لوگوں کا غصہ سامنے آیا۔ وہ لبرلز جو اصولی طور پر آزادی اور خود مختاری کے لیے کھڑے تھے عوام کی شکایات پر غور کرنے پر راضی ہوئے۔ 1909 کا انڈین کونسل ایکٹ اس طرح ان حالات کا نتیجہ تھا۔ لارڈ منٹو (گورنر جنرل) اور مورلے (سیکریٹری آف اسٹیٹ) کی مشترکہ کوششوں سے یہ ایکٹ نافذ ہوا اور اس نے ایک نئی سمت دی۔ ایکٹ کا مقصد ہندوستانی مقننہ میں نمائندہ عناصر کو بڑھانا اور ان کے اختیارات میں اضافہ کرنا ہے۔ اس نے مرکزی اور صوبائی دونوں کونسلوں کو وسعت دینے کا بندوبست کیا۔ گورنر جنرل کی قانون ساز کونسل کے اراکین کی تقسیم چار اقسام پر مشتمل ہوتی ہے سابقہ اراکین، نامزد عہدیدار، نامزد غیر عہدیدار، اور منتخب اراکین۔ گورنر جنرل اور ان کے کونسلروں نے اعلیٰ ترین ایگزیکٹو کے ممبر ہونے کی وجہ سے مرکزی مقننہ کی رکنیت کا فائدہ اٹھایا۔ انہیں سابقہ ممبران کہا جاتا تھا۔ ایکٹ نے سرکاری ارکان کی اکثریت کو برقرار رکھا تاکہ سرکاری بلوں کی منظوری میں پیدا ہونے والی کسی بھی قسم کی دشواری کو روکا جا سکے۔ اگرچہ ایکٹ سرکاری اکثریت کے ساتھ منظور کیا گیا، لیکن صوبائی مقننہ میں اب بھی منتخب عناصر کی اکثریت ہونا شروع ہو گئی۔

سرکاری اور نامزد غیر سرکاری اراکین کی مشترکہ طاقت اب بھی منتخب اراکین سے زیادہ ہے۔ انہوں نے حکومت کے اقدامات کی حمایت کے لیے نئی حکومت کے لیے اتحاد تشکیل دیا۔ اس ایکٹ کی سب سے متنازع خصوصیت فرقہ وارانہ مفادات کو دی جانے والی غیر ضروری اہمیت تھی۔ اس ایکٹ نے مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے غیر متناسب نمائندگی دے کر ان کی حمایت کی۔ صدارتی کارپوریشن، یونیورسٹیوں، چیمبرز آف کامرس اور زمینداروں کو بھی علیحدہ نمائندگی دی گئی۔ ایکٹ نے قانون ساز کونسلوں کے کاموں کو وسعت دی ہے اور وہ بجٹ/مالی معاملات پر قراردادیں پیش کر سکتے ہیں، مفاد عامہ کے معاملات پر ضمنی سوالات پوچھ سکتے ہیں۔ بمبئی اور مدراس کی ایگزیکٹو کونسل کے اراکین کی تعداد چار کر دی گئی۔ ہندوستانیوں کو بھی ایگزیکٹو کونسل میں مقرر کیا گیا اور اسی کے مطابق ایس پی سنہا کو قانون کا رکن مقرر کیا گیا۔ ایکٹ نے کونسلوں میں غیر سرکاری اراکین کے زمرے میں انتخاب کا نظام متعارف کرایا تھا۔ مرکزی مقننہ کے لیے انتخابی حلقوں کی چار قسمیں تھیں—جنرل، خصوصی، طبقاتی ووٹر اور مسلمان، جبکہ صوبائی مقننہ کے لیے ووٹر کو پہلی تین اقسام میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک محدود اور امتیازی حق رائے دہی کی اجازت دی گئی تھی۔

منٹو مورلے کی اصلاحات نے نہ تو اقتدار کی منتقلی پر غور کیا اور نہ ہی کونسلوں کو حقیقی قانون ساز ادارہ بنایا تھا۔ قانون سازوں کی عددی توسیع، وائسرائے کے ایگزیکٹو میں ہندوستانیوں کی تقرری اور ایوان میں بحث کے اختیارات میں اضافہ جیسی دفعات کے باوجود اس ایکٹ کو

شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ کانگریس پارٹی کے اعتدال پسند گروپ کو مطمئن نہیں کر سکا۔اس نے حکومت کی کوئی پارلیمانی شکل قائم نہیں کی۔ کونسلوں میں مسلمانوں کے لیے مخصوص نشستوں کی شکل میں فرقہ وارانہ انتخابی حلقوں کی تشکیل کی کانگریس نے سخت مخالفت کی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمان کے درمیان خلیج کو مزید وسیع کرنے کے لیے مسلم ووٹروں کے الگ الگ حلقے بنائے گئے۔ فرقہ وارانہ مفادات کو قومی مفادات پر فوقیت حاصل تھی۔ مسلمانوں کو علیحدہ نمائندگی دینا دراصل سیاست میں فرقہ واریت کے دور کا آغاز ثابت ہوا۔اس نے دیگر فرقہ وارانہ اقلیتوں کی طرف سے اسی طرح کی مراعات کے مطالبات کو متحرک کیا - جیسے کہ سکھ، ہریجن، اینگلو انڈین، یورپی اور ہندوستانی عیسائی۔ کانگریس نے ان فرقہ پرست ووٹروں کی مذمت کی تھی۔ دوسری طرف، عملی طور پر گورنر جنرل یا گورنرز کے ویٹو پاور کی وجہ سے قانون ساز کونسل کے اراکین کے اختیارات میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں ہوئی۔ قانون ساز کونسلوں کی کارروائیوں کو چلانے والے قواعد و ضوابط اس طرح وضع کیے گئے تھے کہ اس کے اراکین کے اختیارات کو کافی حد تک محدود کر دیا گیا تھا۔

8.7.2 1919کاایکٹ (Act of 1919)

1909 کے ایکٹ نے قدرتی طور پر لوگوں کے عمومی عدم تسکین کو عملی جامہ پہنایا اور اس نے ایک اور قانون سازی کے قدم آگے بڑھانے کی ضرورت پیدا کی۔ برطانوی حکومت نے پہلی جنگ عظیم کے دوران ہندوستانی مدد اور حمایت کا بدلہ دینے کی کوشش میں کچھ اور مراعات شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس کے ضمن میں ، نئے سکریٹری آف اسٹیٹ ایڈون مونٹاگو نے 20 اگست 1917 کو ہاؤس آف کامنز میں اعلان کیا کہ برطانوی سلطنت کے اٹوٹ انگ کے طور پر ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کے ترقی پسند احساس کا ایک نظریہ کے تحت تاج برطانیہ کی حکومت انتظامیہ کی ہر شاخ میں ہندوستانیوں کی رفاقت میں اضافہ کیا جائے گا اور خود مختار اداروں کی بتدریج ترقی دی جائے گی۔

وائسرائے لارڈ چیمس فورڈ کی مشاورت سے، اصلاحات کا ایک پروگرام تیار کیا گیا تھا اور یہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1919 یا مونٹیگیو۔چیلمس فورڈ اصلاحات کی شکل میں ہے یہ ایکٹ ایک نازک موڑ پر تیار کیا گیا تھا جب برطانوی جابرانہ رویہ کے خلاف بڑے پیمانے پر تحریک چلی تھی، جس نے رولٹ ایکٹ کی شکل اختیار کر لی جس کے نتیجے میں جلیاں والا باغ سانحہ واقع ہوا۔ یہ ایکٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی درجہ بندی کرتا ہے۔ مرکزی مضامین میں دفاع، غیر ملکی تعلقات، مقامی ریاستوں کے ساتھ تعلقات، ریلوے، ڈاک اور ٹیلی گراف، کرنسی، اور سکے، آل انڈیا سروسز، سول اور فوجداری قانون اور طریقہ کار، شاہی محصولات، عوامی قرض، اور کلیسائی انتظامیہ جیسے معاملات شامل تھے۔ صوبائی مضامین میں مقامی، تعلیم، صفائی ستھرائی اور صحت عامہ، پبلک ورکس، زراعت، ایکسائز، ماہی گیری اور باہمی تعاون، قحط سے نجات، زمینی محصول انتظامیہ، آبپاشی، جنگلات، انصاف کی انتظامیہ، پولیس اور جیلیں شامل ہیں۔ جو عہدے صوبوں کو نہیں دیئے گئے وہ مرکز کے تھے۔

طاقت کے ذرائع بھی منقسم تھے۔ مرکز کی آمدنی کے ذرائع، چنگی، ریلوے، ڈاک، ٹیلی گراف، افیون اور نمک تھے۔ صوبوں کو لینڈ ریونیو، ایکسائز، آبپاشی، جنگلات، ڈاک ٹکٹ اور رجسٹریشن فیس سے آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ 1919 کا ایکٹ مرکز میں دوطرفہ ایوانی مقننہ

کے لیے فراہم کرتا ہے۔ایوان زیریں کو قانون ساز اسمبلی اور ایوان بالا کو ریاست کی کونسل کہا جاتا تھا۔ایوان بالا کی تعداد 60 تھی جس میں 33 منتخب اور 27 نامزد ارکان تھے۔ایوان زیریں میں 145 ارکان تھے جن میں سے 103 منتخب ہوئے اور باقی نامزد ہوئے۔نامزد کردہ افراد میں 25 اہلکار اور باقی غیر سرکاری تھے۔103 منتخب ارکان میں سے 51 عام حلقوں سے، 30 مسلم حلقوں سے، 2 سکھ حلقوں سے، اور 20 دیگر حلقوں سے تھے، جیسے کہ یورپی، زمیندار اور ہندوستانی تجارت۔ایوان زیریں کی مدت 3 سال اور ایوان بالا کی مدت 5 سال تھی۔انتخابات براہ راست تھے، لیکن حق رائے دہی پر پابندی تھی۔مرکزی مقننہ کو دیے گئے دیگر اختیارات کے باوجود جنرل گورنر نے قانون سازی کے معاملات کو ہند برطانوی کی حفاظت کے نام پر وسیع تر اختیارات کو برقرار رکھا۔ایگزیکٹو تسلط کے پیش نظر مقننہ بجٹ کے معاملات میں بھی لاچاری رہی۔صوبوں میں، اس ایکٹ نے حکمرانی کا ایک نیا نظام متعارف کرایا جسے دوہری حکومت (Dyarchy) کے نام سے جانا جاتا ہے تاکہ محدود مقدار میں ذمہ داری کو ہندوستانی ہاتھوں میں منتقل کیا جاسکے۔جو مکمل 8 صوبے تھے-آسام، بنگال، بہار اور اڑیسہ، وسطی صوبے، متحدہ صوبے، بمبئی، مدراس اور پنجاب جہاں دوہری حکومت کی متعارف کروائی گئی۔ان میں سے ہر ایک صوبے کو ایک گورنر کے ماتحت رکھا گیا تھا۔صوبائی مضامین کو دو گروپوں میں تقسیم کیا گیا تھا- محفوظ اور منتقل۔ مخصوص مضامین گورنر-ان-کونسل کے ہاتھ میں رکھے جاتے تھے اور منتقل شدہ عہدے گورنر اپنے وزراء کے ساتھ مل کر چلاتے تھے۔ محفوظ فہرست میں مالیاتی، زمینی محصولات، انصاف، پولیس، جیلیں، قحط سے نجات، آبپاشی اور آبی گزرگاہوں، اخبارات کا کنٹرول، پرنٹنگ پریس اور کتابیں، فیکٹریوں اور کانوں کا معائنہ، مزدوروں کی بہبود اور صنعتی تنازعات، عوامی خدمات، خارج کیے گئے علاقے، ایجنسی کے کام وغیرہ شامل تھے۔

منتقل کی گئی فہرست میں مقامی خود مختار حکومت، تعلیم، طبّی انتظامیہ، صحت عامہ اور صفائی، زراعت، ایکسائز، صنعتوں کے عوامی کاموں کی ترقی، مویشیوں کے معالج، ماہی گیری، اور معاون سماج شامل ہیں۔ مخصوص اختیارات کے انتظام میں، گورنر، جنرل گورنر، سیکرٹری آف سٹیٹ اور برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے منتخب قانون ساز کونسلوں کے ذریعے صوبوں کے رائے دہندوں کے لیے ذمہ دار رہے۔صوبائی وزراء پر برطانوی حکومت کا کنٹرول کم کر دیا گیا جبکہ مؤخر الذکر نے اپنے منتقل کردہ دائرہ اختیار میں کام کیا۔اس طرح اس نظام نے ہندوستانی قلمدانوں کو کچھ ذمہ داری دینے کا تجربہ متعارف کرایا گیا۔اس ایکٹ کے تحت گورنر ہر صوبے کے قانون ساز کونسل میں بطور خیر سگالی وزراء کا تقرر کرتا ہے جو کہ عام پارلیمانی معنوں میں کسی ایگزیکیٹو کنٹرول کے اختیارات کے بغیر اعزازی عہدہ ہوتا ہے۔ایکٹ نے گورنر کو قانون ساز کونسل کی طرف سے منظور کردہ کسی بھی بل کو منظوری دینے، اسے روکنے، واپس کرنے یا محفوظ رکھنے کے اختیارات دیتا ہے۔اس طرح گورنر اعلیٰ اختیارات کا حامل ہو جاتا ہے۔ایکٹ صوبائی مقننہ کے لیے براہ راست انتخابات کے لیے اختیارات فراہم کرتا ہے۔ لیکن اراکین کو منتخب کرنے کے لیے ووٹرز کی تعداد کم تھی۔ حق رائے دہی کے لیے اعلیٰ منصبی جائیداد کی اہلیت کا تعین کیا گیا تھا۔فرقہ وارانہ اور طبقاتی انتخابی حلقے بھی بنائے گئے جس سے بہت زیادہ تنازعات پیدا ہوئے۔لوگوں نے مسلمان، یورپی، اینگلو انڈین، اور ہندوستانی عیسائی، سکھ اور یہاں تک کہ غیر برہمن کے طور پر ووٹ دیا۔

دوہری طرز حکومت کا نظام (Dyarchy) اپنے نقائص اور خامیوں کے ساتھ ایک تجربہ ثابت ہوا۔اسے شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا

اور وہ عوام کی توقعات کو پورا کرنے میں ناکام رہا۔ رعایا کے درمیان صوبائی اختیارات کو محفوظ اور منتقل کرنے کی ظاہری تقسیم نے انتظامیہ کی ساکھ کو برباد کر دیا۔ گورنر نے اتحاد کے تحفظ کے نام پر اعلیٰ اختیارات حاصل کر لیے تھے۔ اس کے نتیجے میں دو گروہ پیدا ہوئے: ایک طرف گورنر اور اس کی کونسل اور دوسری طرف وزراء۔ گورنر اور اس کی کونسل کے دائرہ اختیار پر قابض ہونے کی وجہ سے بہت سے تنازعات سامنے آئے۔ شاہی دفاتر نے مقننہ میں ہندوستانی وزراء کے مقابلے میں ایگزیکٹو کونسل میں برطانوی اراکین سے وفاداری کا مظاہرہ کیا۔ ان کے درمیان کوئی ہم آہنگی نہیں تھی۔ کوئی اجتماعی ذمہ داری بالکل بھی نہیں تھی اور گورنروں نے ان کی حمایت نہیں کی۔ چونکہ خزانہ کا قلمدان کونسل کے پاس تھا، وزراء اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں بے بس ہو گئے۔ مقننہ کو نازک حالت میں ڈال دیا گیا، کیونکہ وہ تنقید کرنے، ان کے طرز عمل کے خلاف قرارداد یں لانے کے علاوہ کسی وزیر کو ہٹا نہیں سکتی تھیں۔ اس کے باوجود، اپنی موروثی نقائص اور عملی مشکلات کے ساتھ یہ ایکٹ حکومت کی ذمہ دارانہ شکل کو پورا کرنے کی طرف ایک اور قدم آگے بڑھا، جس نے 1935 میں شکل اختیار کی۔

8.7.3 گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (Government of India Act: 1935)

1919 اور 1935 کے ایکٹ کے درمیان کے پندرہ سالوں میں برطانوی راج کے خلاف سیاسی جدوجہد کے میدان میں قابل ذکر پیش رفت دیکھنے میں آئی۔ کانگریس نے 1919 کے ایکٹ کی مذمت کی تھی اور مزید ڈومینین اسٹیٹس کا مطالبہ کیا تھا۔ سیاسی ماحول انگریز مخالف جذبات سے بھرا ہوا تھا جس کی وجہ سے لوگ گاندھی کی قیادت میں کانگریس کی زیر قیادت کے قومی تحریک کے جھنڈے تلے آ گئے تھے۔ تاریخی غیر مشترکہ کی تحریک اور سول نافرمانی کی جدوجہد نے جب بھی ضرورت آن پڑی تب قانون کے خلاف جا کر برطانوی راج کے خاتمے کو نشانہ بنایا۔ اس قسم کے سیاسی ماحول نے آئینی اصلاحات کے ایک اور سیٹ کو نافذ کرنے کے لیے سازگار حالات پیدا کیے تھے جسے 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ہندوستان کی آئینی تاریخ میں ایک رجحان ساز آئین تھا کیونکہ یہ ایک چھوٹے آئین سے مشابہت رکھتا تھا اور اس میں بنیادی جدید آئین کی خصوصیات موجود تھیں۔ برطانوی پارلیمنٹ کے تیار کردہ آئینی اقدامات میں سے آخری مانے جانے کے بعد، 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نے ہندوستانی سیاست اور حکمرانی کے دائرے میں بہت سی ساختیاتی تبدیلیاں متعارف کروائی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے تاج برطانیہ کا اعلیٰ وقار قائم کیا اور ایک مقبول حکومت کے لیے جگہ کی اجازت دی۔ اس نے برطانوی ہندوستان اور ہندوستانی ریاستوں پر مشتمل ایک موافق حمایت کی تشکیل کی، صوبوں میں خود مختاری اور مرکز میں جزوی طور پر ذمہ دار حکومت یا (ڈائیریسی) دوہری حکومت کی تجویز پیش کی۔

نئے ایکٹ نے انڈیا کونسل ایکٹ کو ختم کر دیا اور سیکرٹری آف سٹیٹ کی طرف سے تقرری کے لیے ایک مشاورتی ادارہ قائم کیا گیا جو چھ سے زائد افراد پر مشتمل نہ ہو۔ فرقہ وارانہ رائے دہندگان کو برقرار رکھا گیا اور مراعات کے لیے پسماندہ طبقات کو شامل کر کے اس کے دائرہ کار کو مزید بڑھایا گیا۔ برما کو ہندوستان سے الگ کر دیا گیا اور عدن کو برطانوی نوآبادیاتی دفتر کے حوالے کر دیا گیا۔ اس ایکٹ کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس نے صوبائی خود مختاری کا آغاز کیا اور اس طرح یہ یقینی طور پر 1919 کے ایکٹ کی پیش قدمی تھی۔ صوبوں میں ایک مکمل ذمہ دار حکومت کا قیام عمل میں لا کر (Dyarchy) دوہری حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ایک آل انڈیا فیڈریشن کی تجویز دی گئی تھی جو 11 ضلعوں، 6

چیف کمشنر ضلعوں اور ان تمام ریاستوں پر مشتمل تھا جو اس میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ ہر یونٹ کو مکمل خود مختاری حاصل تھی۔ وفاقی مملکت اور اس کے رائے دہندوں کے درمیان تنازعات کو حل کرنے کے لیے ایک وفاقی عدالت بھی قائم کی گئی۔

Dyarchy دوہری طرز حکومت کا تجربہ مرکز میں متعارف کرایا گیا تھا۔ وفاقی اختیارات کو محفوظ اور منتقل کرنے کی ظاہری تقسیم کا تجربہ کیا گیا تھا جس کے محفوظ اختیارات کی فہرست میں دفاع، خارجی امور، کلیسیائی امور اور قبائلی علاقے شامل تھے اور ان کا انتظام گورنر جنرل کے ذریعے تین کونسلروں کی مدد سے کیا جانا تھا جو اس کے لئے متعین کئے گئے تھے۔ منتقل شدہ مضامین کے انتظام کے لیے گورنر جنرل کو وزراء کی ایک کونسل مقرر کرنی تھی جس میں ہندوستانی ریاستوں، اقلیتوں کی نمائندگی ہو۔ وزارت اجتماعی طور پر وفاقی مقننہ کی ذمہ دار تھی۔ اقلیتوں کے تحفظ کے لیے وسیع تحفظات فراہم کیے گئے، جو متنازعہ بن گئے۔ ایکٹ کو برطانوی پارلیمنٹ نے ترامیم کا نشانہ بنایا لیکن ہندوستانی مقننہ کے ذریعہ اس پر کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ فرنچائز کی توسیع اور مقننہ کے حد کو بڑھانے کیے ساتھ کل آبادی کے تقریباً دس فیصد کو ووٹ کا حق مل گیا۔ ریاستی کونسل کی تعداد 260 اور قانون ساز اسمبلی کی تعداد 375 تھی۔ وفاقی مقننہ اور گیارہ میں سے چھ صوبائی مقننہ دو ایوانی بن گئے۔ انتظامی سہولت کے لیے مضامین کو تین فہرستوں میں تقسیم کیا گیا: وفاقی فہرست جس میں 59، صوبائی فہرست 54 اور 36 کی ہم آہنگی فہرست۔ تمام اہم ہندوستانی اختیارات جیسے مسلح افواج، کرنسی، سکے، پوسٹس اور ٹیلی گراف، ریلوے، مرکزی خدمات، خارجی امور، کسٹم وغیرہ وفاقی فہرست کے تحت تھے اور وفاقی مقننہ ان پر قانون سازی کر سکتی تھی۔ صوبائی فہرست میں اسلوب عامہ، تعلیم، مقامی خود مختار حکومت، صحت عامہ، زمینی محصول، جنگلات، کان کنی اور ماہی گیری وغیرہ شامل تھے۔ ہم آہنگی فہرست میں صوبائی مفاد کے وہ مضامین شامل تھے لیکن ان کے طریقہ کار میں یکسانیت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ وفاقی اور صوبائی دونوں حکومتیں ان پر عمل کر سکتی ہیں۔ صوبائی انتخابات میں ووٹنگ کا حق منصبی جائیداد کی اہلیت پر طے کیا گیا تھا۔ قانون ساز اسمبلی کے لیے منصبی جائیداد کی سطح کو کم رکھا گیا جس کی وجہ سے فرنچائز میں اضافہ ہوا۔ تعلیمی قابلیت بھی متعارف کرائی گئی۔ لیکن دوسری طرف فرقہ وارانہ نمائندگی نے بہت سی ترقیوں کے فوائد کو کم کر دیا۔

ایکٹ کو بغیر کسی جدوجہد کے طویل مباحث کے بعد اسے قبول کر لیا گیا۔ مقننہ کا انتخاب، انتخابات کی نگرانی، بااختیار وزارتیں، حکمرانی اکثریت اور ذمہ دار حکومت کے ذریعہ جمہوری حکمرانی کی طرف ایک پیش قدمی سمجھی جاتی تھی۔ اس کے باوجود اسے کافی تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس ایکٹ نے گورنر اور جنرل گورنر کو زبردست صوابدیدی اختیارات سے مسلح کیا اور اس طرح صوبائی خود مختاری کو ایک مذاق بنا دیا۔ فیڈریشن کی مجوزہ تشکیل بھی ناقص تھی کیونکہ وفاق میں داخلہ صوبوں کے لیے لازمی تھا لیکن شاہانہ ریاستوں کے لیے رضاکارانہ تھا۔ ہریجنوں ،مزدوروں اور خواتین کو مبینہ طور پر ہندو برادری سے الگ کرنے کے مذموم ارادوں کے ساتھ فرقہ وارانہ انتخابی حلقوں کی توسیع نے وفاقی روح کو خراب کیا۔ اقلیتوں کے تحفظات کو کانگریس کی قیادت میں چلنے والی قومی تحریک کے خلاف متحرک کرنے کے آلات سے تعبیر کیا گیا۔ حق خود ارادیت دینے سے انکار پر سب کی طرف سے شدید تنقید کی گئی۔

8.8 1935 کے ایکٹ کے مابعد (Aftermath of the 1935 Act)

1935 کے بہت زیادہ تنقید شدہ ایکٹ نے، بلاشبہ، ہندوستانیوں کو سیاسی طاقت کی طرف اکسایا اور انہیں صوبائی خود مختاری کے تجربات میں حصہ لینے پر مجبور کیا جس کا تجربہ 1937 کے انتخابات میں کیا گیا تھا۔ کانگریس نے اندرونی طور پر کونسلوں کے کام کو خراب کرنے کے مقصد سے انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ مسلم لیگ اور لبرل نے بھی الیکشن میں حصہ لیا۔ انتخابات کے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ کانگریس نے مدراس، بہار، متحدہ صوبوں، بمبئی، وسطی صوبے اور اڑیسہ میں واضح اکثریت حاصل کی۔ آسام میں کانگریس 108 میں سے 35 سیٹیں جیت کر سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ میں بھی اسے 50 میں سے 19 نشستوں کا فائدہ ہوا۔ الیکشن میں مسلم لیگ بری طرح ناکام رہی۔ یہ صوبائی اسمبلیوں میں مسلمانوں کے لیے مخصوص 482 نشستوں میں سے صرف 51 ہی حاصل کر سکی۔ مسلم اکثریتی صوبوں پنجاب، بنگال اور میں بھی لیگ اپنی طاقت نہ دکھا سکی۔ صوبوں میں ذمہ دار حکومتیں دو سال تک آزادانہ طور پر کام کرتی رہیں۔ خود مختار صوبائی کے کام نے عوامی انتظامیہ میں ایک اچھے تربیتی میدان کے طور پر خدمات انجام دے کر بہترین نتائج حاصل کئے۔ صوبوں میں کانگریس کی حکمرانی کے مختصر عرصے نے لوگوں کو خود مختاری کا عادی بنا دیا جس سے مکمل آزادی کی خواہش مضبوط ہوئی اور اقتدار کی منتقلی کے طریقوں پر برطانوی حکومت اور کانگریس کے درمیان بات چیت کا راستہ اختیار کیا۔ اس نے 1942 میں کرپس مشن، 1946 میں کیبنیٹ مشن پلان اور ہندوستان کی تقسیم اور آزادی کے لیے ماؤنٹ بیٹن پلان کے نام سے ایک مکالمے کی شکل اختیار کی۔ ہندوستان کے آئین کو نافذ کرنے کے لیے دستور ساز اسمبلی کا قیام بھی عمل میں آیا اور یہ 1950 میں نافذ العمل ہوا۔

8.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

برطانوی دور حکومت نے حکومت کے ڈھانچے میں کئی بنیای تبدیلیاں کیں۔ ایک تجارتی کمپنی کی سیاسی طاقت میں بنیادی تبدیلی نے نہ صرف معاشی فوائد کو مستحکم کرنے بلکہ اقتدار میں حصہ داری کے ابھرتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بہت سے انتظامی اور آئینی اصلاحات کے آغاز کی ضرورت پیش کی۔ پہلے زمانے میں، 1773 کے ریگولیٹنگ ایکٹ سے شروع ہو کر، جسکا مقصد بہت سے انتظامی اقدامات کے پیچھے مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدنی کو منظم کرنا اور ضرورت مندوں کو انصاف فراہم کرنا تھا۔ انگلینڈ میں مختلف تجارتی گھرانوں کے دباؤ نے برطانوی پارلیمنٹ کو چارٹر ایکٹ کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرگرمیوں کو منظم کرنے میں فعال کردار ادا کرنے پر مجبور کیا اور بالآخر کمپنی کی تجارتی اجارہ داری کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ فوج میں باغی رجحانات کی پیشن گوئی کرنے میں ناکامی، جس نے آزادی کی جنگ کی شکل اختیار کر لی، بالآخر ایسٹ انڈیا کمپنی کی قسمت پر مہر ثبت کر دی اور 1858 میں حکومت کی تبدیلی کا باعث بنی۔ تاج برطانیہ کی انتظامیہ نے ہندوستانیوں کو انتظامیہ کے قریب لا کر اور انہیں قانون سازی کے امور میں حصہ لینے پر مجبور کر کے ایک مثبت منظر نامے کا آغاز کیا۔ سیاسی طاقت کے ڈھانچے کے ساتھ ہندوستانیوں کی باہمی پالیسی نے 1909 اور 1919 میں کونسل ریفارم ایکٹس کی شکل اختیار کر لی۔ ان کارروائیوں نے مرکز میں حکومت کی ایک جوابدہ شکل اور صوبوں میں حکومت کی ایک (Dyarchy) دوہری حکومت شکل بھی پیدا کی۔ مختلف اصلاحاتی اقدامات کے نتیجے میں 1935 کا ایکٹ نافذ ہوا، جو ہمارے جدید آئین سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس سے صوبوں میں صوبائی

خود مختاری اور مرکز میں نظم وضبط کا ڈھانچہ آیا۔

8.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

Dyarchy : دوہری حکومت

شمال مغربی سرحدی علاقے: موجودہ پاکستان کے خیبر پختونخواں، پشاور، بلوچستان وغیرہ کا علاقہ

8.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

8.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. بنگال میں نظام حکومت کا جائزہ لیں۔
2. چارٹر ایکٹس سے آپ نے کیا سمجھا؟
3. 1793 کے چارٹر ایکٹ کا حساب دیں۔
4. 1833 کے چارٹر ایکٹ پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔
5. 1853 کے چارٹر ایکٹ کی وضاحت کریں۔
6. ایڈم سمتھ کے نظریہ لیسیز فیئر پر ایک نوٹ لکھیں۔
7. انڈین کونسلس ایکٹ 1861 پر ایک نوٹ لکھیں۔
8. 1858 کے ایکٹ کا جائزہ لیں۔
9. فرقہ وارانہ انتخاب سے آپ کی کیا مراد ہے؟
10. دوایوانوں والی مقننہ سے آپ کی کیا مراد ہے؟

8.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. 1773 کے ریگولیٹنگ ایکٹ کی خصوصیات پر بحث کریں۔
2. Pitts India Act of 1784 کی دفعات پر بحث کریں۔
3. 1813 کے چارٹر ایکٹ پر ایک نوٹ لکھیں۔
4. ملکہ وکٹوریہ کا 1858 کا اعلان بیان کریں۔
5. انڈین کونسلس ایکٹ 1892 کا حساب دیں۔

8.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ایکٹ 1909 کی اہم دفعات کا جائزہ لیں۔
2. 1919 کی مونٹیگو۔ کیمسفورڈ اصلاحات کی اہم خصوصیات بیان کریں۔
3. ہندوستان کی آئینی تاریخ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کی اہمیت کا جائزہ لیں۔

8.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. H. V. Srinivas Murthy, *History of India*, Eastern Book Company, Lucknow, 1995.
2. L.O. Garren & Abdul Hamid, *A Constitutional History of India*, *1600-1935*, University of Edinburg Press, London, 1936.
3. Mahendra Pal Singh, *Outlines of Indian Legal and Constitutional History*, Universal Law Publishing, New Delhi, 2006.
4. M. P. Jain, *Outlines of Indian Legal History*, Wadhawa & Co., Nagpur, 1990.
5. M. Rama Jois, *Legal and Constitutional History of India* (*Ancient Legal*, *Judicial and Constitutional*), Universal Law Publishing Company, New Delhi, 2010.
6. R. R. Sethi and Vidya Dhar Mahajan, *Constitutional History of India*, S. Chand and Company, Delhi, 1956.
7. V.D. Kulshreshtha, *Landmarks in Indian Legal and Constitutional History*, Eastern Book Company, Lucknow, 2016.
8. Vibhuti Bhushan Mishra, *Evolution of the Constitutional History of India*, *1773-1947*, Mittal Publications, Delhi, 1987.

اکائی 9۔ زمینی مالگزاری بندوبست: استمراری، رعیت واری اور محل واری

(Land Revenue Settlements: Permanent, Ryotwari, and Mahalwari)

اکائی کے اجزا

9.0		تمہید
9.1		مقاصد
9.2		استمراری بندوبست
	9.2.1	فوائد
	9.2.2	نقصانات
9.3		رعیت واری بندوبست
9.4		محل واری بندوبست
9.5		اکتسابی نتائج
9.6		کلیدی الفاظ
9.7		نمونہ امتحانی سوالات
	9.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	9.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	9.7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
9.8		مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

9.0 تمہید (Introduction)

1765 میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ملنے کے بعد ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی انتظامیہ کا سب سے بڑا مقصد مالگزاری کی رقم میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا تھا۔ زراعت، معیشت کی اصل بنیاد اور آمدنی کا اہم ذریعہ تھی چنانچہ اسی لیے مالگزاری زیادہ سے بڑھانے کے لیے کئی تجربات کیے گئے۔ اگرچہ وصولی کی ذمہ داری مقامی اہلکاروں کی تھی، لیکن کمپنی کے یورپی افسران کو ان پر نگران بنادیا گیا۔ نتیجتاً یورپی افسران کے لالچ اور بدعنوانی کے ساتھ ساتھ مقامی حالات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے چند برسوں کے اندر اندر دکمپنی کے زیر انتظام صوبوں میں زرعی معیشت کا ڈھانچہ اور سماج مکمل طور پر بکھر گیا۔ 70-1769 کا تباہ کن قحط، جس میں بنگال کی ایک تہائی آبادی کا صفایا ہو گیا تھا، اس دور کی تباہ کن معاشی پالیسیوں کا صرف ایک اشارہ تھا۔ اپنے حصص مالکان کو منافع دینے سے قاصر کمپنی کے ڈائرکٹرس کم ہوتی مالگزاری اور تباہی کے اسباب کی تلاش کرنے لگے۔ ساری کمیوں اور خامیوں کا الزام انہوں نے کٹھ پتلی نواب کے سر ڈال کر اسے برطرف کر دیا۔ اب نئے گورنر وارن ہیسٹنگز کی یہ خواہش تھی کہ مالگزاری انتظامیہ کو ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے نکال کر انگریزوں کو صوبے کے وسائل کا واحد منتظم بنادیا جائے۔ اسی مقصد سے وارن ہیسٹنگز نے 1772 میں، ایک نیا نظام متعارف کروایا جسے Farming یا کاشتکاری کا نظام کہا جاتا ہے۔ اس کے تحت اب یورپی ضلع کلکٹروں کو مالگزاری اکٹھا کرنے کے ذمہ داری دی گئی جبکہ مالگزاری اکٹھا کرنے کا حق سب سے زیادہ بولی لگانے والوں کو دیا گیا۔ بندوبستوں کی مدت کے بارے میں بھی کئی تجربات کیے گئے۔ لیکن فارمنگ یا کاشتکاری نظام حالات کو سدھارنے میں ناکام رہا۔ کیونکہ فارمر یا اجارہ دار کاشتکار، پیداواری عمل کی پرواہ کیے بغیر زیادہ سے زیادہ وصولی کی کوششیں کرنے لگے۔ اس کے نتیجے میں کسانوں پر مالگزاری کی طلب کا بوجھ بڑھتا گیا اور اکثر یہ اتنا زیادہ ہو جاتا تھا کہ اسے حاصل ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بنا سوچے سمجھے تجربات کی اس پوری مدت کا مجموعی ماحصل کسانوں کی تباہی تھا۔ 1784 میں، کارنوالس کو مالگزاری انتظامیہ کو بہتر بنانے کے خاص مقصد کے ساتھ ہندوستان بھیجا گیا۔

9.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستان میں برطانوی مالگزاری نظام کو سمجھ سکیں گے۔
- مالگزاری انتظامیہ میں پھیلی بدنظمی کو روکنے کی کمپنی کی کوششوں کو سمجھ سکیں گے۔
- مالگزاری منظم کرنے کے لیے متعدد بندوبستوں کے بارے میں جان سکیں گے
- مستقل، رعیت واری اور محل واری بندوبست کے درمیان فرق کی وضاحت کر سکیں گے۔
- کیا کمپنی اور کمپنی کے اہلکاروں کی بڑھتی ہوئی دولت کی ہوس بنگال کی معاشی بدحالی کی ذمے دار تھی؟ تجزیہ کر سکیں گے۔

9.2 استمراری بندوبست (Permanent Settlement)

کارنوالس نے محسوس کیا کہ موجودہ نظام ملک کو غریب کر رہا ہے، زراعت کو برباد کر رہا ہے اور وہ بڑی اور اضافی پیداوار فراہم نہیں

کر رہا ہے جس کی کمپنی کو امید تھی۔ یورپ کو برآمد کے لیے ہندوستانی سامان کے حصول میں دشواری کی وجہ سے کمپنی کی تجارت کو بھی نقصان پہنچا۔ کمپنی کی دو بڑی برآمدات ریشم یا کپاس کی پیداوار بنیادی طور پر زراعت پر مبنی تھیں، جبکہ زراعت میں کمی نے دستکاری کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ یہ سوچا گیا کہ اس صورت حال کو بہتر کرنے کا واحد طریقہ مالگزاری کے مسئلے کو مستقل طور پر طے کرنا ہے۔ درحقیقت 1770 سے ہی یعنی کارنوالس کے آنے سے کافی پہلے کمپنی کے متعدد افسران اور الیکزینڈر ہنری پیٹلو، فلپ فرانسس اور ٹامس لا جیسے یورپی مشاہدین استمراری بندوبست کی وکالت کرتے آرہے تھے۔ اپنے الگ الگ خیالات کے باوجود اس مادی نظریے میں سب کو یقین تھا جو کسی بھی ملک کی معیشت میں زراعت کو اولیت دیتا ہے۔ یہی نظریات 1793 کے استمراری (مستقل) بندوبست کی بنیاد بنے جس نے بنگال میں 'حتمی تشخیص' کے اصول کو لاگو کیا۔ اس سے اس بدعنوانی کی گنجائش کم ہو گئی جو افسران اپنی مرضی سے تشخیص میں تبدیلی کر کے کر سکتے تھے۔ زمیندار زمین کو بہتر بنانے میں پیسہ لگائیں گے، کیونکہ ریاست کا مطالبہ مستقل ہونے کی وجہ سے ان کو ہی، پیداوار میں اضافے اور آمدنی میں بڑھوتری کا پورا فائدہ حاصل ہو گا۔ کمپنی کو باقاعدگی سے ٹیکس ملتا رہے گا۔ جیسا کہ کارنوالس کا خیال تھا کہ کمپنی حسب ضرورت کاروبار اور تجارت پر ٹیکس لگا کر اپنی آمدنی بڑھا سکتی تھی۔ 90-1789 کی تشخیص کو معیار مان کر یہ مالگزاری 268 لاکھ روپے (تقریباً 30 لاکھ پاؤنڈ) مقرر کی گئی۔ پی جے مارشل کے مطابق 1793 میں مالگزاری کا مطالبہ 1757 سے پہلے کے مقابلے میں تقریباً 20 فیصد زیادہ تھا۔ وہیں بی۔ بی۔ چودھری کے حساب سے یہ 1765 اور 1793 کے درمیان لگ بھگ دوگنی ہو گئی تھی۔

کمپنی کے لیے دوسرا مسئلہ یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مالگزاری کس سے حاصل کرنی ہے۔ نواب اسے زمینداروں سے وصول کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ بڑے جاگیر دار تھے جو بڑے علاقوں کو کنٹرول کرتے تھے اور ان کے پاس خود کے مسلح دستے تھے۔ 1790 میں بنگال کے بارہ بڑے زمینداروں نے مالگزاری کے 53 فیصد سے زیادہ حصے کی ادائیگی کی۔ دوسرے چھوٹے زمیندار، براہ راست ریاست کو یا بڑے زمینداروں کے ذریعے مالگزاری ادا کرتے تھے۔ کسان کھیتی کرتے تھے اور زمینداروں کو روایتی نرخوں پر ادائیگی کرتے تھے، جو اکثر الگ الگ تحصیلوں میں مختلف ہوتی تھی اور بعض اوقات اضافی قانونی رقم بھی وصول کی جاتی تھی جسے ابواب (*Abwab*) کہا جاتا تھا۔ کمپنی انتظامیہ نے کچھ زمینداروں کو برقرار رکھا اور دیگر کی جگہ نئے مال گزار کسانوں کو دے کر اس صورتحال کو کافی الجھا دیا۔ تشخیص کے معاملے میں بھی روایتی حقوق کو نظرانداز کر دیا گیا اور جب تک کارنوالس کی آمد ہوئی اس خطہ میں مکمل بدنظمی پھیل چکی تھی۔ برطانیہ کے زمیندار طبقے سے تعلق رکھنے کے ناطے کارنوالس فطری طور پر زمینداروں کو ترجیح دیتا تھا۔ زمینداروں سے توقع کی گئی کہ اگر ان کی ملکیت کے حقوق محفوظ کر دیے جائیں گے تو وہ زراعت کی بہتری کے لیے سرمایہ کاری کریں گے۔ بے شمار کسانوں سے آمدنی وصول کرنے کے مقابلے، جس کے لیے ایک بڑی انتظامی مشینری کی ضرورت پڑتی تھی، چند زمینداروں سے مالگزاری وصول کرنا آسان تھا اور بالآخر یہ مقامی آبادی کے ایک طاقتور طبقے کی وفاداری کو یقینی بنا سکتا تھا۔ چنانچہ 1793 میں زمینداروں کے ساتھ استمراری بندوبست کیا گیا۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کی انچ انچ زمین اب ایک زمینداری کا حصہ بن گئی اور زمیندار کو اس پر مقرر کردہ مالگزاری ادا کرنا پڑتی۔ اگر وہ ایسا کرتا تو وہ اپنی زمینداری کا مالک رہ سکتا تھا، اسے بیچ سکتا تھا، رہن رکھ سکتا تھا اور منتقل کر سکتا تھا، اور یہ زمین اس کے ورثا کو بھی مل سکتی تھی۔ لیکن مالگزاری کی ادائیگی میں ناکامی کی صورت میں

حکومت کی طرف سے زمینداری کو ضبط کر کے نیلامی کے ذریعے فروخت کر دیا جاتا تھا۔ پھر تو اس پر نئے خریدار کا مالکانہ حق ہوتا تھا۔ یہ نام نہاد نجی زمینی ملکیت کی تخلیق تھی۔

استمراری بندوبست نے زمین کی ملکیت کا حق زمینداروں کو دے دیا جو پہلے صرف مالگزاری وصول کرنے کا حق رکھتے تھے۔ اس لیے اس سارے معاملے یا بندوبست میں جن لوگوں کا نقصان ہوا وہ کسان تھے جنہیں زمینداروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان کے روایتی قبضے کے حق (occupancy rights) کو نظر انداز کر دیا گیا اور وہ کرایہ دار (tenants) بنا کر رکھ دیے گئے۔ زمیندار، پٹے (کسان اور زمیندار کے درمیان تحریری معاہدہ جس میں ادا کیے جانے والے لگان کی رقم کا ریکارڈ ہوتا تھا) پر شاذ و نادر ہی عمل کرتے تھے۔ نہ ہی حقوق اور ذمہ داریوں کے کسی بھی رسمی ریکارڈ کو کسان پسند کرتے تھے کیونکہ اس سے انہیں نقصان کا اندیشہ ہوتا تھا۔ اونچی مالگزاری کے تعین کا بوجھ کسانوں پر ڈال دیا گیا جن سے اکثر غیر قانونی اضافی رقوم ادا کرنے کا مطالبہ بھی کیا جاتا تھا۔ 1799 اور 1812 کے قوانین (regulations) نے زمینداروں کو یہ حق دیا تھا کہ وہ کرایہ دار (کسان) کی جانب سے ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں عدالت کی اجازت کے بغیر ان کی جائیداد ضبط کر سکتے تھے۔

اگرچہ یہ بندوبست زمینداروں کی حمایت کرتا تھا لیکن انہیں بھی کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جیسا کہ ڈینیل تھورنر (Daniel Thorner) نے استدلال کیا ہے، زمین کی نجی ملکیت کی تخلیق ایک غلط لفظ تھا، کیونکہ حقیقی ملکیت تو سامراجی اقتدار اعلیٰ کے ہاتھوں میں تھی۔ زمینداروں کو نام نہاد 'غروب آفتاب قانون' (Sunset Law) کے تحت ایک مخصوص تاریخ تک مالگزاری ادا کرنی پڑتی تھی، جس میں ناکامی کے نتیجے میں ان کی زمینداری نیلام کر دی جاتی تھی۔ ان کے لیے اکثر لگان وصول کرنا مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ مطالبات بہت زیادہ تھے اور فطرت کی غیر یقینی صورتحال الگ سے تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زمینداری جائیدادوں کی بڑے پیمانے پر فروخت ہونے لگی۔ 1794 اور 1807 کے درمیان بنگال اور بہار میں تقریباً 41 فیصد مالگزاری والی زمین نیلامی میں فروخت کی گئی۔ اڑیسہ میں 1804 اور 1818 کے درمیان نیلامی کی وجہ سے 51.1 فیصد اصلی زمیندار تباہ ہو گئے۔ یقیناً اس کا مطلب پرانے زمیندار طبقے کا زوال تھا لیکن پرانے مفروضوں کے برعکس جن لوگوں نے یہ زمینیں خریدیں وہ بنگال کے زرعی سماج میں ایک دم نئے نہیں تھے۔ پرانی زمینداریوں کو خود ان کے اپنے عملوں (زمینداری کارندوں)، امیر کسانوں یا پڑوسی زمینداروں نے آپس میں بانٹ لیا۔ بردوان زمینداری جیسے کچھ قدیم گھرانوں نے اپنے آپ کو شکمی زمینداری (Sub-infeudation) کے نئے طریقے کو اپنا کر بچائے رکھا، جس سے پٹے داری کی ساخت بے تکی اور پیچیدہ ہو گئی۔ نئی قانونی اصلاحات غریب کسانوں کو کوئی راحت نہیں دے سکیں۔

دوسری طرف ان اصلاحات نے صرف طاقتور امیر کسانوں کے ایک طبقہ کو مضبوط کیا جنہیں 'جوتدار' کہا جاتا تھا جو کہ حقیقت میں گاؤں کی سطح پر 'جوتوں' پر تسلط رکھتے تھے جیسا کے رجت رے (Rajat Ray) اور رتن لیکھا رے (Ratnalekha Ray) کا ماننا ہے۔ دوسری طرف زمینداروں کو صرف مالگزاری وصول کرنے کا حق حاصل تھا۔ رے کی دلیل یہ ہے کہ نوآبادیاتی پالیسیوں سے آئی تبدیلیوں کے باوجود جوتداروں کی طاقت اور دیہی سماج میں ان کی پکڑ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ساتھ ہی نوآبادیاتی بنگال کے دیہی سماج کا تسلسل اسی بات میں

تھا۔ جوت داری مفروضے(Jotedar Thesis) پر تیکھا حملہ سگاتا بوس(Sugata Bose) کی ایک تخلیق (1986)میں کیا گیاہے جنہوں نے جوتداروں کے ایسے غلبے کو شمالی بنگال تک ہی محدود پایا۔ باقی علاقوں میں انہوں نے زرعی معیشت کے دو دوسرے واضح نظاموں کا پتہ لگایاہے: مغربی بنگال میں کسانوں کی جوت اور آزاد مزدوروں کا ایک مربوط نظام، اور مشرقی بنگال میں چھوٹی جوتوں کا نظام .دونوں علاقوں میں انہوں نے 1930 کی دہائی تک زمینداروں کی طاقت کو غیر متاثر پایا اور اس نقطہ نظر کی حمایت اکینوبو کوئی(Akinobu Kawai)اور پارتھ چٹرجی(Partha Chatterjee) کی تصنیفات نے بھی کی ہے۔ جوتدار کے حق میں اپنی بعد کی ایک تحریر میں رجت رے نے یہ بات مانی ہے کہ دیہی بنگال میں زمینداروں کا اثر اور اختیار غالباً1930 کی دہائی تک بنا رہا۔ ہاں ! لیکن پھر بھی اس پورے دور میں اچھے مالدار کسانوں کا ایک حصہ ایسا بھی رہا جن کو بنگال کے گاؤں میں اچھی خاصی طاقت حاصل تھی۔ بہر کیف زمینداروں کو زمین کا مالک تسلیم کرتے ہوئے 1790 میں ان کے ساتھ دس سال کا معاہدہ کیا گیا۔ 1793 میں دس سالہ بندوبست کو استمراری(مستقل)قرار دے دیا گیااور زمیندار اور ان کے قانونی وارثین کو اپنی جائیدادیں ہمیشہ کے لیے متعین شدہ ملگزاری پر رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ ریاست کا حصہ ٪89 طے ہوااور ٪11 حصہ زمیندار کو ان کی ذمہ داری نبھانے کے عوض دے دیا گیا۔

9.2.1 فوائد (Advantages)

- مالی طور پر، استمراری بندوبست نے ریاست کے لیے ایک مقررہ اور مستحکم آمدنی طے کر دی اور ریاست کے لیے یہ آمدنی مستقل تھی چاہے فصل اچھی ہو یا نہ ہو۔ اس نے حکومت کے وہ اخراجات بچائے جو وقتاً فوقتاً تشخیص اور بندوبست کرنے میں خرچ ہوتے تھے۔
- اقتصادی طور پر، استمراری بندوبست سے زراعت کی بازارکاری کی ہمت افزائی ہوئی اور تجارت میں اضافہ ہوا۔ بنجر زمینوں پر بھی کاشتکاری شروع ہوئی اور زیر کاشت زمین کو بہتر بنایا گیا۔ زمینداروں نے کاشت کے نئے طریقے متعارف کروائے جیسے فصلوں کی ادلابدلی، کھاد کا استعمال وغیرہ۔ اس بندوبست کی بنا پر مٹی کی مکمل صلاحیت کو فروغ دینے کی کوششیں کی گئیں، جس کے نتیجے میں ایک مثبت اور صاحب تدبیر کسان طبقہ پیدا ہوا۔
- سیاسی طور پر، کارنوالس کو توقع تھی کہ استمراری بندوبست سے وفادار زمینداروں کا ایک طبقہ پیدا ہو گا جو ہر قیمت پر کمپنی کا دفاع کرنے کے لیے تیار ہوں گے کیونکہ کمپنی کی طرف سے ان کے حقوق کی ضمانت دی گئی تھی۔ بنگال کے زمیندار 1857 کی عظیم بغاوت کے دوران کمپنی کے وفادار رہے۔
- سماجی طور پر، زمیندار، کسانوں(ryot) کے فطری رہنما ثابت ہوئے اور تعلیم اور دیگر فلاحی سرگرمیوں کے پھیلاؤ میں مدد کرنے کے لیے اپنے اجتماعی جذبے کا مظاہرہ کیا۔
- بنگال کے استمراری بندوبست نے کمپنی کے قابل ترین ملازمین کو تشخیص کے جھنجھٹ سے آزاد کر دیا جس بنا پر وہ عدالتی خدمات کے لیے اپنا وقت دینے کے قابل ہو گئے۔ مزید یہ کہ اس نے عارضی بندوبست سے منسلک خرابیوں جیسے، کاشتکار کو ہراساں کرنے، کاشتکار کی جانب سے مدت کے اختتام پر زمین کو خراب ہونے کے لیے چھوڑنے تاکہ وہ تشخیص میں خراب ثابت ہو، کے رجحان سے بچایا۔

9.2.2 نقصانات (Disadvantages)

گو کہ استمراری بندوبست اپنے پہلے سالوں میں بہت کارآمد ثابت ہوا لیکن یہ جلد ہی استحصال اور جبر کے آلے میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے 'سب سے اوپر زمین دار اور سب سے نیچے غلام' پیدا کرنے شروع کیے۔ مالی طور پر، طویل مدتی لحاظ سے ریاست کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ جب زمین کے نئے قطعات زیر کاشت لائے گئے اور پہلے سے زیر کاشت زمین کی لگان میں کئی گنا اضافہ کیا گیا تو ریاست اس اضافے میں اپنے جائز حصہ کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔ 1793 میں طے شدہ ریاستی حصہ 1954 میں بھی اتنا ہی رہا۔ استمراری بندوبست نے بنگال کی معاشی ترقی کو روک دیا۔ زیادہ تر زمینداروں نے زمین کی بہتری میں کوئی دلچسپی نہیں لی بلکہ وہ کاشتکاروں سے صرف زیادہ سے زیادہ ممکنہ کرایہ حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ کاشتکار، بے دخلی کے مسلسل خوف میں رہتے تھے اور زمین کو بہتر بنانے میں ان کی کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔

زمیندار جاگیروں پر نہیں رہتے تھے بلکہ دور شہروں میں رہتے تھے جہاں وہ عیش و عشرت میں اپنا وقت اور پیسہ ضائع کرتے تھے۔ اس کے علاوہ، ریاست اور اصل کاشتکاروں کے درمیان دلال پروان چڑھے۔ زمین داروں اور کسانوں کے درمیان میں نئے ثالث (بچولیے یا گماشتے) پیدا ہوئے جنہیں اپنے منافع سے مطلب تھا اور کاشتکار کی حیثیت کم ہو کر ایک مزدور کی سی ہو گئی۔ امریکی زرعی سائنسداں جارج کارور (George Carver) لکھتا ہے کہ: 'جنگ، قحط اور وبائی امراض کے بعد، دیہی برادری کے ساتھ سب سے زیادہ خراب جو ہو سکتا تھا وہ غیر حاضر زمینداری تھی۔' سیاسی طور پر، برطانوی انتظامیہ نے عوام کی ناراضگی و بیگانگی کی قیمت پر چند زمینداروں کی وفاداریاں حاصل کیں۔ اس نظام نے دیہی سماج کو زمینداروں اور کرایہ داروں (کاشتکاروں) میں تقسیم کر دیا۔ سماجی طور پر، زمینداروں کی ملکیت کے مطلق حق کو تسلیم کرتے ہوئے، کمپنی نے کسانوں کی جائیداد یا قبضے کے حقوق کو قربان کر دیا۔ ان کے مالکانہ حقوق کو ختم کر کے اور مکمل طور پر زمیندار کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی۔ آبادی میں اضافے کے نتیجے میں زمین پر بے تحاشہ دباؤ پڑا جو کہ زمینداروں کے ہاتھ میں تھی اور اس سے کسان کی حیثیت ایک غلام کی سی ہو گئی۔ زمینداروں کو مالگزاری کے لیے مقرر کردہ آخری دن کے غروب آفتاب تک مالگزاری سرکاری خزانے میں جمع کروانا تھا جس میں ناکامی کی صورت میں زمینیں ضبط کر کے نیلام کر دی گئیں۔ اس غروب آفتاب کے قانون نے بڑی مشکلات پیدا کیں اور بہت سے زمینداروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر دیا، اور اتنا عدم تحفظ پیدا کر دیا کہ ایک وقت ایسا آیا جب کوئی بولی لگانے والا سامنے نہیں آ رہا تھا۔ زمین کی ملکیت میں متواتر تبدیلیوں نے کاشتکاروں کی حالت کو متاثر کیا۔

9.3 رعیت واری بندوبست (*Ryotwari* Settlement)

کارنوالس کو توقع تھی کہ اس کا استمراری بندوبست یا زمینداری نظام ہندوستان کے دیگر حصوں تک بھی پھیل جائے گا۔ جب ویلزلی ہندوستان آیا تو اس نے 1798 میں مدراس پریزیڈنسی تک اس کی توسیع کا حکم دیا۔ یہاں مسئلہ بنگال کی طرح قابل قدر زمینداروں کی تلاش کا تھا۔ مدراس انتظامیہ نے بڑے پیمانے پر مقامی پولیگروں کا تعارف زمیندار کے طور پر کرایا جنہیں مدراس پریذیڈنسی میں زمیندار کے طور پر تسلیم بھی کر لیا گیا۔ ایسے علاقوں میں جہاں ایسے لوگ نہیں مل سکے، دیہی جائیدادوں کو جمع کر کے سب سے زیادہ بولی لگانے والوں کو نیلامی میں

فروخت کر دیا گیا۔ برطانوی سرکاری حلقوں میں استمراری بندوبست کے بارے میں مایوسی بڑھ رہی تھی کیوں کہ اس کی وجہ سے حکومت کے پاس آمدنی بڑھانے کا کوئی ذریعہ نہیں بچا تھا۔ تھامس منرو (Thomas Munro) جس نے کمپنی کے مالگزاری نظام میں تبدیل لانے کی پہل کی تھی، ہندوستان میں حکومتی منصوبہ بندی کی پالیسی کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ ڈیوڈ ریکارڈو (David Ricardo) کا کرائے کا نظریہ موجودہ نظام پر نظرثانی کا اشارہ دے رہا تھا۔ کرایہ زمین سے حاصل ہونے والا فاضل تھا یعنی اس کی آمدنی میں سے پیداوار پر آنے والی لاگت اور مزدوری کو الگ کرنے کے بعد بچنے والی رقم اور ریاست کے پاس اس اضافی رقم پر دعویٰ جائز تھا بجائے اس کے کہ انہیں غیر پیداکاروں (ثالثوں، بچولوں، گماشتوں) کے حوالے کیا جاتا، جن کا واحد دعویٰ ان کے ملکیتی حق کی وجہ سے تھا۔ نئے بندوبست کی ایک زیادہ طاقتور وجہ مدراس پریزیڈنسی کا ہمہ وقت رہنے والا مالی بحران تھا جو جنگ کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی وجہ سے مزید گہرا ہو گیا تھا۔ یہ مدراس پریذیڈنسی میں رعیت واری بندوبست کی ابتدا تھی۔

رعیت واری کا تجربہ الیگزینڈر ریڈ (Alexander Reed) نے 1792 میں بارہ محل میں شروع کیا تھا اور اسے تھامس منرو نے 1801 سے جاری رکھا جب اسے ملحقہ اضلاع کے محصول انتظامیہ کا چارج سنبھالنے کو کہا گیا۔ زمینداروں کے بجائے اس نے براہ راست گاؤوں سے مالگزاری اکٹھا کرنا شروع کیا، اور ہر گاؤں کے ذمے ادائیگی کی رقم طے کر دی۔ اس کے بعد اس نے ہر کاشت کار یا رعیت کا الگ الگ جائزہ لیا اور اس طرح رعیت واری نظام تیار کیا۔ اس نے زمین کی ذاتی ملکیت کی تخلیق کی اور یہ زمیندار کے بجائے کسانوں کے ہاتھ میں تھی۔ منرو نے 'چار یا پانچ سو بڑے مالکان کے مقابلے میں چالیس سے پچاس ہزار چھوٹے مالکان کے ہاتھ میں' ہونے کو ترجیح دی۔ ہر کھیت پر قابل ادائیگی لگان کا فیصلہ کرنے کے لیے (Field Assessment System) یا ایک کھیت جائزہ نظام تیار کیا گیا جس میں مستقل طور پر تمام زمینوں کے عمومی سروے کے ذریعے تخمینہ لگایا جانا تھا۔ حکومت اور کاشتکار کے درمیان سالانہ معاہدے کیے جانے تھے، اور کاشتکار معاہدے کو قبول کرنے یا مسترد کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ اگر کاشتکار راضی ہوتا تو اسے ایک پٹہ ملتا، جو اسے نجی ملکیت کا حق دیتا اور اگر کوئی کاشتکار نہ ملتا تو زمین ویسی ہی پڑی رہتی۔ لہٰذا پرکشش اور قابل لحاظ ہونے کے لیے زمین کے تفصیلی سروے کی ضرورت تھی یعنی مٹی کا معیار، کھیت کا رقبہ اور زمین کے ہر ٹکڑے کی اوسط پیداوار کا تخمینہ لگا کر اس کی بنیاد پر مالگزاری کی مقدار طے کی جانی تھی۔ لیکن عملی طور پر تخمینہ، اندازے کی بنیاد پر لگایا جاتا اور حکومتی طلب اکثر اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ وہ بڑی مشکل سے حاصل ہو پاتی تھی یا بالکل ہی ناقابل حصول تھی۔ چنانچہ 1807 میں منرو کی لندن روانگی کے فوراً بعد رعیت واری نظام تقریباً ترک کر دیا گیا۔

1820 کے آس پاس جب تھامس منرو مدراس کے گورنر کے طور پر ہندوستان واپس آیا تو صورتحال بدلنا شروع ہو گئی، کیونکہ اس نے دلیل دی کہ رعیت واری قدیم ہندوستانی مالگزاری نظام تھا اور ہندوستانی حالات کے لیے بہترین طور پر موزوں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ برطانوی سلطنت کو خود مختاری کے ایک متفقہ تصور کی ضرورت ہے اور رعیت واری نظام اس کے لیے ایک بنیاد فراہم کر سکتا ہے۔ وہ یہ دلیل دے کر اپنے موقف کا جواز پیش کرتا ہے کہ ہندوستان میں تاریخی طور پر زمین ریاست کی ملکیت تھی اور ریاست نے انفرادی کسانوں سے مالگزاری وصول کرنے کے لیے افسران کے ایک سلسلے کا استعمال کیا جنہیں انعام میں زمینیں دی جاتی تھی۔ منرو نے زور دیا کہ یہ نظام کسانوں

کے لیے مالگزاری کے بوجھ کو کم کرے گا جبکہ اس سے ریاست کے لیے زمینی محصولات کی بڑی مقدار حاصل ہو گی کیونکہ اس میں کوئی بچولیہ (ثالث یا گماشتہ) نہیں ہو گا جو اضافی رقم کا حصہ دار بنے گا۔ اگرچہ اس سے حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوا، لیکن اس نے کاشتکاروں کو شدید پریشانی میں ڈال دیا۔ بہت سے علاقوں میں کوئی سروے نہیں کیا گیا تھا اور رعیت کے ٹیکس کا تخمینہ، پچھلی ادائیگیوں کے اندازے سے گاؤں کے کھاتوں کی بنیاد سے کیا جانے لگا، جسے پٹ کٹ بندوبست (Putcut Settlement) کہا جاتا تھا۔ رعیت کی طرف سے ادا کی جانے والی آمدنی ہر کھیت پر نہیں پورے فارم پر مقرر کی گئی تھی جس میں آبپاشی کی سہولیات اور پیداواری صلاحیت مختلف سطحوں کی ہو سکتی تھیں۔ کسان روز بروز مقروض ہو رہے تھے اور کھیتی کی توسیع کے لیے سرمایہ کاری نہیں کر سکتے تھے۔

رعیت واری نظام نے گاؤں کے اشرافیہ کو حکومت اور کسانوں کے درمیان بچولیے کے طور پر ختم نہیں کیا۔ چونکہ مراعات یافتہ میراثی داروں کے خصوصی حقوق کو تسلیم کیا گیا تھا اور برہمنوں کی ذات کے مراعات کا احترام کیا گیا تھا، موجودہ گاؤں کی طاقت کا ڈھانچہ شاید ہی بدلا تھا بلکہ درحقیقت نئے نظام سے اور بھی مضبوط ہوا تھا۔ میراثی دار زرعی ذاتیں تھیں جیسے کہ تامل علاقے میں ویلال۔ مالگزاری حکام نے اپنے آپ میں مالگزاری اور وصولی اور پالیسی ڈیوٹی کو یکجا کر دیا تھا جس کا نتیجہ ماتحت اہلکاروں کی جانب سے رشوت اور بدعنوانی کی صورت میں نکلا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موثر اصلاحات کی ضرورت تھی۔

مدراس کے زرعی سماج پر رعیت واری نظام کے اثرات کو مختلف طریقوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نے جائیداد کے حقوق کی تعریف کی، اس نے درحقیقت گاؤں کے طاقتور افراد کی طاقت کو اور مضبوط کیا اور اس طرح سماجی تنازعات میں شدت آئی۔ مدراس حکومت نے میراثی داری طاقت کے خلاف کرایہ داروں کی فعال لیکن بے نتیجہ مزاحمت کے باوجود ان کے حقوق کے تحفظ میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ تنجاور (تنجور) ضلع میں کاویری ڈیلٹا میراثی داروں کے 'سنہری دور' کو ظاہر کرتا ہے، جنہوں نے زمین اور مزدوروں پر اپنا تسلط جما لیا اور اس طرح 'مقامی سماج کی واضح تفریق کو تیز تر کر دیا'۔ مدراس پریذیڈنسی کے آندھرا اضلاع میں رعیت واری نظام نے کسانوں کے اندر تفریق کو فروغ دیا۔ بڑے زمینداروں کا ایک امیر گروپ تھا جسے 'کسان بورژوا' کہا جاتا تھا جو بڑے کھیتوں کو کنٹرول کرتا تھا اور اضافی زمین بے زمین کرایہ داروں اور بٹائی پر کاشت کرنے والوں کو لیز (Lease) پر دیتا تھا۔ ایک طرف بچولیے طبقہ کے معاشی حالات مستحکم تھے تو دوسری طرف غریب کسان جو کہ دیہی آبادی کی اکثریت تھی، ناسازگار حالات میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ امیر کسانوں اور قرض داروں کے ہاتھوں ان کا استحصال کیا گیا اور وہ نامساعد حالات کے باوجود مزدوری کرنے پر مجبور ہو گئے اور زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بندھے رہے۔

بمبئی پریزیڈنسی میں رعیت واری نظام کا آغاز 1803 میں اس کے گجرات میں الحاق کے بعد ہوا تھا، اور پھر جب 1818 میں پیشوا کے علاقوں کو فتح کیا گیا تھا، تو اسے منرو کے شاگرد ماؤنٹ اسٹوارٹ ایلفنسٹن (Mount Stuart Elphinstone) کی نگرانی میں ان علاقوں تک بڑھا دیا گیا تھا۔ ابتدائی طور پر، ان علاقوں میں انگریز، دیش مکھوں اور گاؤں کے سرداروں یا پٹیلوں کے ذریعے مالگزاری وصول کرتے تھے۔ لیکن اس سے اتنی آمدنی نہیں ہوئی جتنی ان کو توقع تھی۔ اسی لیے انہوں نے 14-1813 سے کسانوں سے براہ راست مالگزاری وصول کرنا شروع کیا۔ چونکہ مقرر کردہ محصولات کی شرحیں غیر معمولی طور پر زیادہ نکلیں۔ بار بار فصل کی ناکامی اور قیمتوں میں کمی کے

باعث، کسانوں کو یا تو اپنی زمینیں ساہوکاروں کے پاس گروی رکھنی پڑیں یا پھر کاشت چھوڑ کر پڑوسی ریاستوں میں ہجرت کرنا پڑی جہاں قیمتیں کم تھیں۔ یہ اسکیم، جو پہلی بار 1830 میں اِندا پور تعلقہ میں متعارف کرائی گئی تھی، جلد ہی ناقص پائی گئی اور اسے ترک کر دیا گیا۔ اسے 1835 میں دو افسران جی ونگیٹ (G. Wingate) اور گولڈاسمتھ (Goldsmith) کے ذریعہ وضع کردہ ایک اصلاح شدہ 'بامبے سروے سسٹم' (Bombay Survey System) کے ذریعہ تبدیل کر دیا گیا۔

مغربی ہندوستان کے زرعی سماج پر رعیت واری بندوبست کا اثر ایک تاریخی بحث کا موضوع ہے، کیونکہ اس نے 1875 میں بامبے اور دکن میں دیہی بغاوت کو جنم دیا تھا۔ اس نے گاؤں کے پاٹل (پٹیل) کی حیثیت کو ایک عام کسان اور حکومتی ملازم تک محدود کر دیا تھا۔ بندوبست نے تمام زمینداروں کو بھی بے گھر نہیں کیا تھا۔ گجرات میں بھاگے داروں، نرواداروں اور احمد آباد کے تعلقہ داروں کے اعلیٰ حقوق کا احترام کیا گیا، اور اس کے نتیجے میں، ان خطوں میں 'زیادہ سے زیادہ سیاسی اور سماجی استحکام کو یقینی بنایا گیا۔' صرف وسطی دکن ہی میں طاقت کا خلا پیدا ہوا، جس نے مارواڑی اور گجراتی بنیوں کے لیے زیادہ فعال کردار کے مواقع فراہم کیے۔ یہاں جو بات شاید دیکھی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ مدراس اور بمبئی دونوں میں رعیت واری نظام کے سماجی اثرات، استمراری بندوبست کے مقابلے کم تباہ کن تھے۔ لیکن اس کے 'تسلسل' کے، موضوع پر بحث کرنا مشکل ہے، کیونکہ پرانی شکلیں جو رائج تھیں، 'سامراج کے ذریعے مختلف انداز میں ترتیب دی جا چکی تھیں۔'

9.4 محل واری بندوبست (*Mahalwari* Settlement)

'گاؤں کی برادری'، جس کے بارے میں کچھ ابتدائی مغربی مبصرین نے اتنی وضاحت سے بات کی، نہ تو اس کا خیال استمراری بندوبست میں رکھا گیا اور اور نہ ہی رعیت واری نظام میں۔ تاہم، جب ان دو نظاموں پر کام کیا جا رہا تھا، شمال اور شمال مغربی ہندوستان کے وسیع علاقے جو ایک زمانے میں مغل سلطنت کا مرکز تھے، جو ہمالیہ کے دامن سے لے کر وسطی ہندوستانی پٹھار تک بشمول گنگا جمنا دوآب پھیلے ہوئے تھے۔ اس علاقے کی زرعی ساخت میں، ایک طرف، زمینداروں کا ایک چھوٹا گروہ تھا، جسے تعلقہ دار کے نام سے جانا جاتا تھا۔ سید نورالحسن (Saiyid Nurul Hasan) نے انہیں 'درمیانی زمیندار' کہا ہے، جنہوں نے 'دیے گئے علاقہ کی مالگزاری کی وصولی کے لیے ریاست کے ساتھ معاہدہ کیا۔' دوسری طرف، 'بنیادی زمینداروں' کا ایک بڑا گروہ تھا، جو 'زرعی اور رہائشی زمینوں پر ملکیتی حقوق' رکھتے تھے۔ اس گروپ میں چھوٹے مالک کسان اور کئی گاؤوں کے بڑے زمیندار بھی شامل تھے۔ بنگال طرز کو ذہن میں رکھتے ہوئے، انگریز مالگزاری کی وصولی کے لیے ابتدائی طور پر تعلقہ داروں سے رجوع ہوئے، جن میں اٹھارویں صدی کے آخر تک دو الگ الگ سماجی گروہ شامل ہو گئے تھے۔ ایک طرف مقامی طور پر 'پشتینی ریاستوں کے حکمران' تھے اور دوسری طرف مغل جاگیر دار، مالگزاری حکام اور ٹیکس دینے والے مالدار کسان جنہوں نے خود کو 'اصل راجا یا تعلقہ دار' بنا رکھا تھا۔

بہت سے بڑے تعلقہ داروں نے نئی حکومت اور اس کی اونچی مالگزاری کی مانگ کے خلاف مزاحمت کی تاہم انہیں انتہائی بے رحمی کے ساتھ کچل دیا گیا۔ بہت سے لوگوں کو بھگا دیا گیا اور ان کے کچے قلعوں کو زمین بوس کر دیا گیا۔ دیگر معاملات میں حکومت کی طرف سے محصول

نہ چکا پانے کی صورت میں جائیدادیں فروخت کر دی گئیں۔ نتیجے کے طور پر، 1820 تک، ان میں سے بہت سے لوگ 'یا تو اپنی حیثیت مکمل طور پر کھو چکے تھے یا پھر حقیر ہو کر رہ گئے تھے۔' نیلامی میں فروخت ہونے والی زمین اکثر عملہ اور تحصیلداروں کے ذریعہ خریدی جاتی تھی، جنہوں نے اپنی مقامی جانکاری اور علاقے میں کچھ بہترین جائیدادیں خریدنے کے لیے اپنی طاقت کا استعمال کیا۔ بنارس کے علاقے میں انیسویں صدی کے وسط تک زمین کے مالک بدل چکے تھے۔ وہ 'سرکاری ملازمین، ان کی اولادوں، تاجروں اور مہاجنوں' کے قبضے میں چلی گئی۔ ان لوگوں نے 'زمینداروں کا ایک نیا طبقہ' تشکیل دیا، جو دیہی برادری سے باہر تھے اور زمین کے بارے میں مختلف رویہ رکھتے تھے۔ تاہم اس صورتحال سے ایک خوف پیدا ہوا کہ زمین غیر کسان طبقوں کے ہاتھ میں جا رہی ہے۔

چنانچہ تعلقہ داروں سے انگریزوں کی ترجیح اب 'بنیادی زمینداروں' اور گاؤں کی برادریوں کی جانب منتقل ہو گئی۔ میکنزی کی سفارشات (Mackenzie's recommendations) کو 1822 کے ضابطہ نمبر VII میں شامل کیا گیا تھا، جس میں آمدنی کے جائزہ کے لیے ایک تفصیلی کھیت درکھیت سروے فراہم کیا گیا تھا۔ بندوبست، دیہی برادری کے ساتھ کیا جانا تھا یا جہاں ممکن ہو کسی تعلقہ دار کے ساتھ۔ مالکان کے حقوق کے علاوہ، رہائشی کاشتکاروں کی طرف سے ادا کیے جانے والے لگان کا بھی پتہ لگانا اور ریکارڈ کرنا تھا۔ اس طرح تعلقہ داروں کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا، لیکن جہاں ممکن ہوا زمین پر مشترکہ ملکیتی حق، گاؤں کی برادریوں کو دیا گیا۔ مالگزاری کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے ساتھ ساتھ کسان مالکان کے حقوق کے تحفظ کے لیے زراعت کی بہتری کو یقینی بنانے کی ضرورت تھی۔ اس کے بجائے 'ریکارڈین تھیوری آف رینٹ' (The Ricardian Theory of Rent) کے اثر ورسوخ نے محل واری بندوبست کے قیام کی ترغیب دی۔

رابرٹ مرٹنس برڈ (Robert Merttins Bird, 1853-1788) نے ایک بہتر اور نظر ثانی شدہ محل واری نظام پیش کیا، جس میں ایک پورے محل یا مالیاتی اکائی کی مالگزاری کا تخمینہ لگانے کے لیے تفصیلی سروے کیا جانا تھا، جو کھیت کی ممکنہ پیداوار کی نقد قدر پر مبنی تھا۔ اس طرح طے شدہ کل مالگزاری کو مشترکہ ملکیت کے ممبران میں تقسیم کیا جانا تھا۔ ریاست کو زمین کی خالص آمدنی کا دو تہائی حصہ دینا تھا اور بندوبست تیس سال کے لیے کیا جانا تھا۔ یہ دیہی طبقوں کے لیے ایک اچھا موقع تھا، جو کہ زیادہ محصول کی طلب، بڑھتے ہوئے قرضوں کے بوجھ، پچھلے محصول کے بقایاجات اور اس کے نتیجے میں ان کی جائیدادوں کی فروخت اور شہری عدالتوں کے احکام کے ذریعے ملکیت کی محرومی کی وجہ سے برباد ہو گئے تھے۔ بہت سے معاملات میں زمین ساہوکاروں اور سوداگروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ 1857 کی بغاوت میں شمالی ہندوستان کے دیہی سماج کی شکایات کا اظہار کہیں زیادہ زور وشور اور پر تشدد طریقے سے ہوا۔

9.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس طرح انیسویں صدی کے وسط تک کمپنی کی انتظامیہ نے مالگزاری بندوبست کے تین نظام وضع کیے تھے، جس میں زمین میں ذاتی ملکیت پیدا کی گئی اور وہ ملکیتی حق تین مختلف گروہوں کو دیا گیا۔ استمراری بندوبست میں یہ زمینداروں کے ہاتھ میں رکھا گیا، کیوں کہ اس کا بنیاد گذار کارنوالس خود انگلینڈ کے زمیندار طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ رعیت واری بندوبست میں یہ حق رعیت (کسانوں) کو یا کسان مالکان کو سونپا

گیا، کیونکہ اس کے بانی ریڈاور منروزمین پر اس کے جوتنے والے کے حق کو اولیت دیتے تھے اور کسی بھی بچولیے کو درمیان سے ہٹا کر سرکاری آمدنی میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف محل واری بندوبست میں گاؤں کے طبقات کو زمین کا مشترکہ مالک سمجھا گیا۔ ایک موٹے اندازے کے مطابق، 29-1928 میں ہندوستان میں قابل کاشت زمین کا تقریباً 19 فیصد استمراری بندوبست، 29 فیصد محل واری بندوبست اور 52 فیصد رعیت واری بندوبست کے تحت تھا۔ تمام بندوبست کی ایک مشترکہ خصوصیت حد سے زیادہ تشخیص تھی، بھلے ہی وہ کمپنی کے اہلکاروں کی لاپرواہی اور بدعنوانی کی وجہ سے اکثر جگہ پر سطحی یا اندازے پر مبنی ہوتی تھی، کیونکہ کمپنی کی حکومت کا بنیادی مقصد مالگزاری کی آمدنی کو زیادہ سے زیادہ کرنا تھا۔

اس کے نتائج ادائیگی کے بقایہ جات، بڑھتے ہوئے قرض، زمین کی فروخت میں اضافہ اور ملکیت سے محرومی تھے۔ جدید تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ ان تبدیلیوں کے اثرات اس سے کہیں زیادہ نتیجہ خیز تھے جیسا کہ انہیں شروع میں تصور کیا گیا تھا۔ ان میں اہم علاقائی تغیرات تھے کیونکہ زمین کی منتقلی ہر جگہ زمین کی ملکیت کے ڈھانچے کو بنیادی طور پر تبدیل نہیں کر سکی تھی۔ متعدد جگہوں پر زمینداروں نے زمین کی نیلامی میں اپنی ہی زمین کو کسی کے ذریعے دوبارہ خرید لیا تھا۔

9.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

فارمنگ نظام : وارن ہیسٹنگز نے 1772 میں، ایک نیا نظام متعارف کروایا جسے 'Farming' یا کاشتکاری نظام کہا جاتا ہے۔ اس کے تحت اب یورپی ضلع کلکٹروں کو مالگزاری اکٹھا کرنے کے ذمہ داری دی گئی جبکہ مالگزاری اکٹھا کرنے کا حق سب سے زیادہ بولی لگانے والوں کو دیا گیا۔

Occupancy Rights: روایتی قبضے کا حق جو ایسے لوگوں کا حق مانا جاتا تھا جو برسوں سے ایک زمین کی کاشت کرت آرہے تھے۔

Tenants : زمینی کرایہ دار

پٹہ : کسان اور زمیندار کے درمیان تحریری معاہدہ جس میں ادا کیے جانے والے کرایہ کی رقم کا ریکارڈ ہوتا تھا۔

عملوں : زمینداری کارندوں

Sub-infeudation: شکمی زمینداری

Sunset Law : ایک ایسا قانون جس کی رو سے مقررہ دن کو سورج ڈوبنے سے پہلے مالگزاری کی عدم ادائیگی کی صورت میں زمیندار کی زمین نیلام کر دی جاتی تھی۔

غیر حاضر زمینداری : ایسے زمین دار جو شہر میں رہتے تھے اور دیہی سماج سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا؟

9.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

9.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. فارمنگ یا کاشتکاری نظام کب لاگو کیا گیا؟
2. استمراری بندوبست میں ملکیتی حق کسے دیا گیا؟
3. جوتدار کسے کہا جاتا تھا؟
4. کھیت جائزہ نظام (Field Assessment System) کس نے لاگو کیا؟
5. عملہ کسے کہتے ہیں؟
6. شکمی زمینداری سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
7. 'غروب آفتاب قانون' کس سے متعلق تھا؟
8. غیر حاضر زمینداری سے کیا مراد ہے؟
9. پٹہ کسے کہتے ہیں؟
10. ایک بہتر اور نظر ثانی شدہ محل واری نظام کس نے متعارف کرایا؟

9.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. استمراری بندوبست کے فوائد بیان کیجیے۔
2. استمراری بندوبست کے نقصانات بیان کیجیے۔
3. رابرٹ مرٹنس برڈ کے ایک بہتر اور نظر ثانی شدہ محل واری نظام پر نوٹ لکھیے۔
4. جوت داروں کے بارے میں بحث پر مختصر تبصرہ کیجیے۔
5. زمین کی ملکیت کے تین دعویداروں پر نوٹ لکھیے۔

9.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. استمراری بندوبست پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. رعیت واڑی بندوبست پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. محل واڑی بندوبست پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

9.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition and After*: *A History of Modern India*. Orient BlackSwan, 2015.
2. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*. Cambridge University Press, 2015.
3. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
4. Gandhi, Rajmohan, *A History of Modern South India*: *A History from the 17th Century to Our Times*, Aleph Book Company, New Delhi, 2018.
5. Metcalf, Barbara D., and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).

اکائی 10۔ دولت کی نکاسی اور مقامی صنعتوں کا زوال

(Drain of Wealth, and the Decline of Indigenous Industries)

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 ابتدائی یورپی تجارت

10.3 ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا قیام

10.3.1 کمپنی کی حکمرانی

10.3.2 تاج برطانیہ کی حکمرانی

10.4 صنعت اور دستکاری کا زوال

10.5 کپڑے کی صنعت کا زوال

10.6 صنعت اور دستکاری کے زوال کے نتائج

10.7 اکتسابی نتائج

10.8 کلیدی الفاظ

10.9 نمونہ امتحانی سوالات

10.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

10.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

10.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

10.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

10.0 تمہید (Introduction)

انگریزوں نے جنوبی ایشیا میں سب سے بڑی علاقائی سلطنت قائم کی اور ہندوستان برطانیہ کے شاہی تاج میں سب سے زیادہ قیمتی ہیرے کی حیثیت سے چمکنے لگا۔ انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک انگریزوں نے ہندوستان کے تقریباً تمام معاملات پر قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی تشکیل، ریاست کی سرپرستی میں کوئی عظیم سامراجی اس کی م نہیں تھی بلکہ اس کو ایک تجارتی کمپنی برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے قائم کیا تھا، جو ایک نجی تجارتی کارپوریشن تھی۔ کچھ ہی سالوں میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی ایک طاقتور سامراجی ایجنسی بن گئی، جس نے ہندوستان میں وسیع و عریض علاقوں پر کنٹرول حاصل کیا۔ انگریزوں کے ذریعہ ہندوستان کو عالمی بازار سے ملانے کی کوششوں کے نتیجے میں ریلوے، سڑک اور نقل و حمل کے نیٹ ورک اور ٹیلی گرام وغیرہ کے آنے سے بین علاقائی رابطے بہتر ہوئے۔

ہندوستان پر برطانوی قبضے کے بعد سب سے زیادہ تباہ کن اثر یہ ہوا کہ اس نے زراعت، دیہی کاریگری اور صنعت کاری کی صدیوں پرانی روایات کو تباہ کر دیا۔ نوآبادیاتی تسلط کے نتیجے میں ہندوستان کی دستکاری بنیادی طور پر برطانوی درآمد شدہ مشین سے تیار کردہ سامان کا مقابلہ نہ کر سکی اور زوال پذیر ہو گئی۔ برطانوی صنعتوں میں کم وقت میں بڑے پیمانے پر اور بڑی تعداد میں بہت سامان تیار کرنے کی استطاعت موجود تھی، جس کے سبب سستی قیمتوں کے ساتھ ہندوستان کی منڈیوں میں بہتر درجے کا سامان فراہم ہونے لگا۔ دستکاری کے زوال کا یہ سارا عمل ہندوستان کی معاشی تاریخ کا ایک مشہور واقعہ ہے اور اسے عدم صنعتکاری (Deindustrialisation) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس اکائی میں آپ برطانوی معاشی پالیسیوں اور ہندوستان پر ان کے تباہ کن اثرات کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

10.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ابتدائی یورپی رابطے کی آمد اور ان کی تجارت سے متعلق جان سکیں گے۔
- بحر ہند میں ایشیائی آزاد تجارت کی اصل کو سمجھ سکیں گے۔
- ہندوستان کے ساتھ یورپی تجارت اور اس کی نوعیت کو سمجھ سکیں گے۔
- دستکاری پر آزادانہ تجارت کے اثرات کی وضاحت کر سکیں گے۔
- صنعتی زوال اور دستکاری کے زوال کے اسباب بیان کر سکیں گے۔
- تجارتی ضوابط اور کپڑے پر برآمد درآمد کی حکمت عملی کا تجزیہ کر سکیں گے۔

10.2 ابتدائی یورپی تجارت (Early European Trade)

1453 میں ترکوں کا قسطنطنیہ پر قبضہ جنیوا کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ کیوں کہ بحیرہ اسود کی بندرگاہیں، جو مشرقی سامان کی فروخت کا ان کا اصل بازار ہوا کرتا تھا، وہ آہستہ آہستہ ان کے لیے بند ہوتا گیا۔ یہ اور اس کے علاوہ وینس کے ساتھ ان کی پرانی دشمنی ہی وہ اہم عوامل تھے، جس کی وجہ سے جنیوا نے پرتگال اور اسپین کی، بحری جہازوں، پیسوں کے ذریعہ سمندری راستوں کی تلاش میں مدد فراہم کی۔ جیسا کہ مشہور ہے، کرسٹوفر کولمبس نے 1492 میں امریکہ کو دریافت کیا تھا، جب واسکوڈاگاما کالی کٹ پہنچا تو وہاں کے زمورین یعنی راجا نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ اس نے مسالوں کی تجارت کرنے، ایک فیکٹری اور مال کا ذخیرہ کرنے کے لیے گودام قائم کرنے کی اجازت مانگی۔ ساحل یورپ تک مسالوں کی تجارت پر پرتگالی اپنی اجارہ داری قائم کرنا چاہتے تھے۔ آہستہ آہستہ پرتگالیوں نے کالی کٹ، کوچین، گوا، دیو اور دمن میں تجارتی مراکز قائم کیے۔ پرتگال وہ پہلا یورپی ملک تھا جس نے ہندوستان جانے والے سمندری راستے کی کھوج کی تھی اور وہ پہلے یورپی شہری بھی تھے جنہوں نے سمندری راستے سے ایشیا کے ساتھ براہ راست تجارت میں سرگرم کردار ادا کیا تھا۔ ہندوستان کے مغربی ساحل پر واقع گوا کے اپنے مرکزی دفتر سے، انہوں نے ملکا کے وسطی حصے پر قبضہ کرکے روایتی تجارت اور جہاز رانی کے نیٹ ورک پر گرفت حاصل کرنے کی کوشش کی، جس نے بحر ہند کے خطے اور اس کے درمیان ایشیائی تجارتی نیٹ ورک میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔

1498 میں پرتگالی مہم جو، واسکوڈاگاما (Vasco da Gama) کی کافی مشقتوں کے بعد تین جہازوں کے ساتھ کالی کٹ پہنچنے کو عالمی تاریخ میں خاص طور پر ایشیا اور یورپ کے مابین تعلقات کے سلسلے میں ایک نئے دور کا آغاز سمجھا جاتا ہے جس سے یورپی تجارت میں اضافہ ہوا۔ اس سے پہلے سلطنت عثمانیہ نے ایشیا کے تقریباً تمام یورپی تجارتی راستوں پر کنٹرول حاصل کیا تھا اور چونکہ عثمانی بندرگاہوں سے گزرنے والے تجارتی جہازوں کو جہاز سے مال اتار کر زمین کے راستے آگے بھیجنا پڑتا تھا، جس سے لاگت اور خطرہ دونوں بڑھ جاتے تھے۔ اس لیے پرتگال اس وقت افریقہ کے آس پاس سمندر کے ذریعہ ہندوستان جانے والا تجارتی راستہ تلاش کر رہا تھا۔ پرتگال کے پرنس ہنری (Prince Henry) نے بحری مہم جوؤں کو بلا کر نئے راستوں کی تلاش کی غرض سے سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔ یہ دنیا بھر میں زبردست تحقیق کا آغاز تھا۔ تقریباً 1419 سے لے کر 1460 میں اپنی موت تک شہزادہ ہنری نے افریقہ کے ساحل پر کئی جہاز رانی مہمات کی قیادت کی۔ اس کے بعد 1481 میں پرتگال کے بادشاہ، جان دوم (John-II) نے ان کوششوں کو جاری رکھا اور افریقہ کے جنوبی ساحلوں کے آس پاس ایک سمندری راستہ تلاش کیا جاتا رہا۔ بہت سے کھوجیوں نے متعدد کوششیں کیں۔ بارتھولومیڈیاس (Bartholomew Dias)، ایک پرتگالی مہم جو تھا جس نے 1488 میں افریقہ اور بحر ہند کے آس پاس اولین بحری سفر کیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ ہندوستان تک پہنچ سکے، اسے پرتگال واپس لوٹنا پڑا۔ جب 1495 میں ایمانوئیل اول (Emmanuel-I) پرتگال کا بادشاہ بنا تو اس نے افریقہ کے آس پاس جا کر ہندوستان کے تجارتی راستے کھولنے کی کوششیں جاری رکھی۔ ایمانوئل نے بالآخر اس کام کے لیے 37 سالہ واسکوڈی گاما کو منتخب کیا۔ مالابار کے ساحل پر اس دوران واسکوڈی گاما نے اپنے سمندری کیریئر کا آغاز کیا۔ ایسٹ انڈیز تک راس امید کے راستے کی دریافت اور اسپین میں امریکی چاندی کی بڑھتی ہوئی درآمد کو سولہویں صدی میں جدید معاشی نظام کے عروج کے پیچھے دو بڑی

طاقتوں کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک، ایشیا کا بیشتر حصہ یوروپیوں کے اثر ورسوخ میں رہا۔ دنیا کی تجارت میں متعدد ایشیائی ممالک کی بڑھتی ہوئی شمولیت نے ان کی معیشتوں اور معاشروں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

نیدرلینڈ کے اسٹیٹس جنرل کے ذریعے منشور عطا کی ہوئی *Vereenigde Oostindische Compagnie* یا ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل 1602 میں ہوئی تھی۔ یہ چونکہ دنیا کی پہلی ملٹی نیشنل کارپوریشن (Multinational Corporation) اور گودام کی سہولت فراہم کرنے والی اولین کمپنی تھی۔ ڈچوں کی اصل دلچسپی ہندوستان میں نہیں بلکہ ان مصالحوں میں تھی جو زیادہ تر انڈونیشیا میں پیدا ہوا کرتے تھے۔ ڈچوں نے ہندوستان میں سورت، بھروچ، کیمبے، ناگا پٹنم، مچھلی پٹنم، چنسورا، پٹنہ اور آگرہ میں تجارتی مراکز قائم کیے۔ اس کے بعد، انہوں نے 1605 میں اپنی پہلی فیکٹری مسولی پٹنم میں قائم کی اور پرتگالیوں پر فتح حاصل کی۔ 1616 کے بعد سے پلی کٹ ان کا مرکز رہا تھا اور اس کے بعد اسے ناگا پٹنم منتقل کیا گیا۔ 16ویں صدی کے نصف آخر میں، شمالی نیدرلینڈ کے باشندے بھی اس تجارت میں داخل ہوئے اور اس کامیابی کو مورخین نے 'ڈچوں کے انوکھے کام' سے منسوب کرتے ہیں۔ اس وقت ڈچ مصالحوں کی تجارتی منڈی کے گویا تنہا مالک ہو گئے اور سادہ لوح جنوبی نیدرلینڈ والوں میں ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ لیکن شاید تقدیر نے ان کا ساتھ نہ دیا اور ان کا سنہرا دور جلد ہی روبہ زوال ہوا۔ اس زوال کے متعدد اسباب تھے۔

1595 میں پہلی مہم کے فوراً بعد ہی، ڈچوں نے ایشیا میں جاری تجارتی مقابلے میں پرتگالیوں اور دیگر یورپی ممالک پر سبقت حاصل کی۔ ایشیائی تجارتی کمپنیوں تک سفر کے لیے جہازوں پر تجارتی سامان لادنے کی غرض سے بڑے بڑے مراکز قائم کیے گئے۔ اس طرح سے تجارت میں کافی منافع ہوا اور اسے مقبولیت بھی خوب حاصل ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی توقعات بھی بڑھتی گئی اور نتیجے میں بڑے بڑے جہازوں کو ایشیا کے لیے روانہ کیا جانے لگا۔ 1602 تک، جب ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت 65 جہازوں پر مشتمل اکٹھے چودہ بیڑے بھیجے گئے تھے، جب کہ 1591 تا 1601 کے دوران پرتگالیوں نے 59 جہازوں پر مشتمل قافلہ روانہ کیا تھا۔ تاہم ڈچ قوت زوال پذیر ہونے لگی اور آخر کار 1759 میں چنسورا کی جنگ (Battle of Chinsurah) میں انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھا کر ختم ہو گئی۔ ڈچ اور برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنیوں کی ابتدائی کوششیں مسالحوں کی تجارت تک ہی محدود تھیں لیکن بعد میں یہی کوششیں کپڑے کی طرف بڑھتی گئیں کیونکہ ہندوستانی کپڑے کی یورپ میں بہت ڈیمانڈ یا طلب تھی۔

ہندوستان کے ساحل پر پہنچنے والا آخری یورپی ملک فرانس تھا۔ گو کہ وہ سولہویں صدی کے آغاز ہی سے مشرقی ممالک کے ساتھ تجارت میں مصروف تھا۔ لوئی پانزدہم (Louis- XV) کے دور حکومت میں اس کے قابل وزیر کولبرٹ (Colbert) نے 1664 میں فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی۔ فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان اور بحر الکاہل میں تجارت کے لیے 50 سال کی اجازت حاصل ہوئی۔ یہ کمپنی 1667 تک ہندوستان میں نوآبادکاری کی کوشش کے تحت اپنے وسائل کا خوب استعمال کرتی رہی۔ اسی کے تحت اس نے سورت میں ایک فیکٹری قائم کی۔ اس کے بعد 1669 میں مسولی پٹنم میں مزید ایک فیکٹری قائم کی۔ ساتھ ہی ساتھ کولکاتہ کے قریب چندر نگر میں ایک بستی بسائی۔ 1673 اور 1674 میں ان کے ذریعے پدوچیری میں فیکٹریاں قائم کی گئیں۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں

میں بھی اور خاص طور پر ساحلی علاقوں میں ماہے، کریکال، بالاسور اور قاسم بازار فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے چند اہم تجارتی مراکز تھے۔ اگرچہ برطانوی اور فرانسیسی ہندوستان میں تجارتی مقاصد سے آئے تھے، تاہم یہ دونوں اپنی روایتی دشمنی کے ساتھ ہندوستان میں اپنے اپنے اقتدار کو پھیلانے کے لیے میں ایک دوسرے سے لڑے۔ ہندوستان کی سرزمین اینگلو-فرانسیسی دشمنی کا میدان جنگ بن گئی۔ آسٹریا میں تخت نشینی کی جنگ کے ساتھ اس کا دوبارہ آغاز ہوا اور سات سالہ جنگ کے بعد یہ اختتام پذیر ہو گئی۔ خاص طور پر ہندوستان میں اس باہمی رقابت کے نتیجے میں تین جنگیں ہوئیں جس کے نتیجہ میں فرانس والوں کی ہار ہوئی اور ہندوستان پر برطانیہ کا اقتدار پہلے سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو گیا۔ ہندوستان پر اپنی بالادستی قائم کرنے میں فرانسیسی ناکام رہے۔

10.3 ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا قیام

(Establishment of the British Empire in India)

پرتگالیوں کی کامیابی اور مشرقی علاقوں میں تجارت سے زیادہ منافع حاصل ہونے کے سبب برطانوی تاجروں نے بھی ایشیائی تجارت میں قدم رکھا۔ نتیجتاً 1599 میں ان کے ایک گروہ نے اپنے آپ کو تجارتی مہم جو (Merchant Adventurers) کے نام سے موسوم کیا اور ایک کمپنی تشکیل دی۔ اس کے بعد ملکہ ایلزبتھ اول (Queen Elizabeth-I) نے 31 دسمبر 1600 کے روز ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام تجارتی حقوق کا ایک منشور (Charter) جاری کیا اور باضابطہ طور پر پندرہ سالہ اجارہ داری کو منظوری دی۔ اسی کے ساتھ مئی 1609 میں ایک نئے منشور کے ذریعے اسے غیر معینہ مدت تک بڑھا دیا گیا۔ ڈچ پہلے ہی مشرق کی جانب بہت زیادہ توجہ دے رہے تھے۔ لیکن اس سے قبل ہی برطانیہ نے کپڑے اور دیگر تجارتی مصنوعات کی تلاش میں ہندوستان کا رخ کیا۔

اٹھارویں وسط کے صدی میں اس ہنگامہ آرائی کے دوران فرانسیسی اور انگریزی حریف تجارتی کمپنیاں ہندوستان کی ساحلی منڈیوں اور تجارتی مراکز پر بالادستی قائم کرنے کے لیے باہم مقابلہ کر رہی تھیں ۔ کے این چوہدری (K.N. Chaudhry) نے اسے three 'great crafts' یا تین عظیم دستکاریوں، کپڑے (textiles)، روئی (cotton) اور ریشم (silk)، دھات (metal) اور ایشیائی چینی مٹی کے برتن (Porcelain of Asia) کے عنوان سے موسوم کیا۔ چاندی کے متبادل سامان کی خاطر یورپی منڈیوں پر ان کا تسلط قائم ہوا۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں میں ڈچ، فرانسیسی اور انگریز پرتگالیوں کے زیر سایہ ہوا کرتے تھے اور کپڑے، ریشم اور اسی کے ساتھ نمک کے کارخانے قائم کرنے کی غرض سے ساحلی اور صوبائی تجارتی مراکز کی تلاش میں تھے۔

آہستہ آہستہ انگریزوں نے اپنے تمام حریفوں کو شکست دے کر میدان سے باہر کر دیا۔ مقامی حکمرانوں کو بھی متعدد جنگوں میں شکست دے کر ہندوستان کے اقتدار اعلیٰ کی مالک بن گئی۔ اپنی سیاسی برتری کو اس نے اپنے معاشی اور تجارتی فائدے کے لیے استعمال کیا۔ ان کے نتیجے میں ہندوستان کی مالگزاری سے حاصل شدہ رقم برطانیہ بھیجنے کے لیے تجارتی سامان بہت کم قیمت پر خریدے گئے۔ بدلے میں ہندوستان کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اسے معاشی اصطلاح میں دولت کی نکاسی (Drain of Wealth) کہا گیا۔ دوسری طرف انگلینڈ میں صنعتی

انقلاب آنے سے مشین کے ذریعے پیداوار کا عمل تیز ہو گیا۔اس کے لیے کچے مال کی فراہمی اور تیار شدہ مال کی کھپت کے لیے بازار کی ضرورت پیش آئی۔ہندوستان چونکہ برطانیہ کے قبضے میں تھااور امریکی نوآبادیات چھن جانے کی وجہ سے برطانوی صنعتوں کی ان دونوں ضرورتوں کو بآسانی پورا کر سکتا تھا۔ساتھ ہی اس سے کسی مزاحمت کی توقع بھی نہیں تھی چونکہ کوئی مقامی مقتدر اعلی ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان برطانیہ کے لیے کچے مال کی فراہمی اور مشینی مصنوعات کی کھپت کا بازار بن گیا۔ہندوستانی دستکار اور صنعت کار ،مشین سے بنی سستی اور خوبصورت اشیا کا مقابلہ نہیں کر سکے اور مقامی حکمرانوں کی سرپرستی سے محروم ہونے کی وجہ سے اپنے خریدار کھو بیٹھے۔اس طرح ہندوستانی صنعت اور دستکاری کا زوال شروع ہو گیا۔اس عمل کو عدم صنعتکاری(deindustrialisation) یا مقامی صنعتوں کی تباہی کا عمل کہا جاتا ہے۔یہ معاشی تباہ کاریاں،دو مراحل میں شروع ہوی۔پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی کے دوران اور دوسرے تاج برطانیہ کی حکومت میں زوال کا یہ عمل مزید تیز ہو گیا۔

10.3.1 کمپنی کی حکمرانی (Company Rule, 1757-1858)

1757 کی جنگ پلاسی کے بعد برصغیر ہند، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت چلا گیا جسے ہندوستان میں کمپنی کی حکمرانیسے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کمپنی حکومت کے دوران سامان تجارت اور مزدوروں کو لانے لے جانے کے لیے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کئی تجارتی جہاز استعمال کرتی تھی۔جنگ پلاسی سے حاصل شدہ مال و دولت سے ہندوستانی راجاؤں کے خلاف جنگ چھیڑنے میں مدد ملی جس سے انگریزوں کی سیاسی قوت کو استحکام ملااور بالآخر برطانوی اقتدار قائم ہو گیا۔اس دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانی مصنوعات بالخصوص کپڑے پر اجارہ داری حاصل کر لی۔

انگریزوں کی اختیار کردہ معاشی پالیسیوں کے نتیجہ میں ہندوستانی معیشت تیزی سے نوآبادیاتی معیشت میں تبدیل ہو رہی تھی جس کا مزاج اور ساخت انگریزوں کی ضروریات کے مطابق تھا۔ہندوستان پر برطانوی تسلط نے ہندوستانی معیشت کی روایتی ساخت کو مکمل طور پر تہس نہس کر دیا۔1813 کے بعد برطانیہ نے ہندوستان پر یک طرفہ آزادانہ تجارت کی پالیسی تھوپ دی اور برطانوی صنعت کاروں نے بالخصوص کپڑے کی صنعت میں دخل اندازی کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔قدیم تکنیک سے تیار کردہ مصنوعات،بھاپ پر چلنے والی مشینوں سے بڑے پیمانہ پر تیار کردہ مصنوعات سے مقابلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

1856 میں اودھ کے برطانوی حکومت کے ماتحت چلے جانے کے بعد ہمالیہ تک برصغیر ہند کا پورا علاقہ اور برما کا بیشتر حصہ کمپنی کی حکومت میں یا پھر ان مقامی حکمرانوں کے تحت چلا گیا جن کا کمپنی کے ساتھ الحاق ہو چکا تھا۔اپنے دور حکمرانی میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں صوبہ بنگال (Bengal Presidency)،صوبہ بمبئی(Bombay Presidency) ،صوبہ مدراس (Madras Presidency)اور شمال مغربی صوبہ جات(North West Provinces)کے نام سے چار اہم صدر مقام قائم کر لئے تھے۔ کمپنی کا اقتدار اور برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی توسیع کا یہ مرحلہ 1857 کی ہندوستانی بغاوت تک جاری رہا۔ 1857 کے بعد

بالآخر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1858 کے ساتھ کمپنی کا اقتدار ختم ہو گیا۔ حالانکہ ایسٹ انڈیا کمپنی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت 1874 میں تحلیل ہوئی۔

10.3.2 تاج برطانیہ کی حکمرانی (Rule by the Crown of Great Britain, 1858-1947)

1858 سے ہندوستان ملکہ برطانیہ کی بادشاہت کے تحت چلا گیا۔ اس حکمرانی میں ریاست کے محصول میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی لیکن اس کے سبب برطانوی سلطنت کی معیشت دور دراز کے علاقوں میں پہونچ گئی۔ نتیجتاً برطانوی تجارت کی توسیع، سرمایہ کی روانی اور مقامی دستکاری میں تنزلی ظاہر ہونے لگی۔ ہندوستانی معیشت جمود کی حالت میں پہنچ گئی اور صنعتی زوال کا شکار ہو گئی جب کہ برطانوی معیشت ترقی پاکر صنعتی انقلاب کے دور سے گذر رہی تھی۔ انگریزوں کی نافذ کردہ متعدد معاشی پالیسیوں کے سبب ہندوستان کے دستکاری شعبہ میں تنزل واقع ہوا۔ اس کے نتیجہ میں ملازمتوں اور خدمات میں کمی واقع ہوئی۔ مجموعی طور پر نوآبادیاتی حکومت نے ہندوستان پر گہرے معاشی اثرات مرتب کیے۔ انیسویں صدی کے درمیانی حصہ میں تجارت کے حجم میں اضافہ ہوا لیکن تجارت کا توازن اب بدل چکا تھا اور یہ برطانیہ کے حق میں ہو گیا تھا۔ ماضی میں ہندوستان کپڑے کا برآمد کنندہ ملک تھا لیکن اب یہ برطانیہ کو زرعی اشیاء اور کچے مال فراہم کرنے والا اور وہاں سے تیار شدہ مصنوعات درآمد کرنے والا ملک بن گیا تھا۔ کچی سوت اور غذائی اجناس نے سامراجی تجارت میں اہم رول ادا کیا۔ ہندوستان میں ریلوے کے نظام کی توسیع کے لیے نجی اور سرکاری انگریز سرمایہ کاروں نے بڑی مقدار میں سرمایہ کاری کی جس کے سبب اعلیٰ درجہ کی تجارت اور فوج کے استعمال میں مدد ملی۔ 1853 میں ریلوے کا آغاز ہوا اور اس میں بتدریج اضافہ ہوا اور اس کے بعد برصغیر کے دور دراز علاقوں تک رسائی ممکن ہوئی۔

10.4 صنعت اور دستکاری کا زوال (Decline of Industry and Handicrafts)

جدید ہندوستان ایک صنعتی ملک نہیں تھا۔ لیکن سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے معیارات کے مطابق غالباً یوروپی اقوام کی آمد سے قبل ہندوستان دنیا کی صنعتی کارگاہ تھی۔ ہندوستان کی روایتی معیشت، زراعت اور دستکاری کا ملا جلا بہترین نمونہ تھی۔ برطانوی حکومت نے اس کی صنعت اور زراعت کی تباہی میں اہم رول ادا کیا۔ برطانوی حکومت کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہندوستانی معیشت کی ساخت اور کارکردگی میں تبدیلی کی گئی جس کے نتیجے میں ہندوستانی معیشت پوری طرح تباہ ہو گئی اور یہ ایک نوآبادیاتی معیشت (Colonial Economy) میں تبدیل ہو گئی، جس کا مقصد رمادر وطن (Mother Country) کے فائدے کے لیے کام کرنا تھا۔ انگریزوں نے جان بوجھ کر روایتی ہندوستانی صنعتوں کو تباہ کرنے والی پالیسیاں اپنائی۔ انگریز تاجروں اور صنعت کاروں کے دباؤ میں آکر برطانوی حکومت نے ہندوستانی صنعت کاروں پر برطانوی کارخانہ داروں کو ترجیح دی اور اس کے خراب اثرات کو یکسر نظرانداز کر دیا۔ ہندوستان کو مشینوں سے تیار کردہ برطانوی مصنوعات کا بڑا بازار بنانا ہی ان کا مقصد تھا۔ اس کے نتیجہ میں بالآخر ہندوستان صرف زرعی خام مال فراہم کرنے والا ملک بن کر رہ گیا اور اس طرح ہندوستان برطانیہ کی خام مال کی بڑھتی ہوئی ضروریات پوری کرنے کے کی حد تک محدود ہو گیا۔ یہ دونوں مقاصد کا حصول

اسی وقت ممکن تھا جب کہ دستکاری کی صنعت کا خاتمہ ہو جائے۔اب ہندوستان کو مصنوعات کے لیے برطانیہ سے درآمدات پر انحصار کرنا پڑا۔1800 میں ہندوستان کی روایتی مصنوعات کی تیاری میں بڑی حد تک کمی واقع ہوئی اور یہاں سے زرعی پیداوار کی برآمد میں اضافہ ہوا۔اب برصغیر ہند پوری طرح سے برطانوی صنعتوں کے تابع ہو گیا۔اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں صنعتی اشیاء کی تیاری اور روزگار میں کمی کو عدم صنعت کاری کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے دوران ہندوستان، دنیا میں ایک نمایاں تیار کنندہ ملک کی حیثیت سے جانا جاتا تھا جب کہ اس کی 15 سے 20 فیصد آبادی یا دوسرے لفظوں میں ڈیڑھ سے دو کروڑ افراد مقامی صنعتوں سے منسلک تھے۔یہاں کی اہم صنعتوں میں کپڑے کی کتائی بنائی، چمڑا اور اس کی اشیاء کی تیاری، دھاتوں کے کام، قالین اور شالوں کی تیاری شامل تھی۔ان تمام صنعتوں میں مشینوں کا استعمال نہیں ہوتا تھا اور یہ بڑے کارخانوں کی صورت میں منظم نہیں تھیں اور نہ ہی یہ انگلینڈ کی طرح کسی طرح کے قوانین کی تابع تھی۔یہ زیادہ تر خاندانی کاریگروں اور گھریلو عورتوں کے ذریعے پر کی جاتی تھی جنہیں روایتی صنعتوں(Traditional Industries)کا نام دیا گیا۔اس دوران ہندوستان اور عالمی تجارت میں ڈرامائی اضافہ ہوا اور ہندوستانی روایتی صنعتوں کو برطانیہ کی جدید صنعتوں سے سخت مقابلہ کرنا پڑا۔برطانیہ میں مشینوں سے تیار کردہ کپڑے نے ہندوستان میں ہاتھ سے تیار کردہ دھاگے اور کپڑے سے مقابلہ شروع کیا۔مورخین کے مطابق ہندوستان میں مستحکم صنعتی تیاری کی روایت تھی،ان روایتی صنعتوں کو نوآبادیاتی دور میں زوال واقع ہوا۔ان کی جگہ حاصل کرنے والی جدید صنعتوں نے روزگار اور آمدنی میں نقصانات کی بھرپائی نہیں کی۔صنعتی زوال کے نہایت منفی اثرات مرتب ہوئے۔اس نظریہ کو چار نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

1. ہندوستان میں روایتی صنعتوں کا زوال
2. تکنیکی فرسودگی کے سبب زوال
3. ہاتھ سے تیار کردہ اشیاء اور مشینوں سے تیار کردہ اشیاء میں غیر مساوی مقابلہ آرائی
4. بازار کا برطانیہ کی ضروریات کے مطابق چلنا

ان وجوہات کے سبب برطانیہ سے نزدیکی معاشی رشتے استوار ہوئے۔یہ پورا عمل نوآبادیاتی پالیسیوں کے سبب قائم رہا اور ہندوستانی نوآبادی کو اس کی وجہ سے معاوضہ سے محروم ہونا پڑا۔سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے دوران ایشیا سے وسیع پیمانے پر کاروبار میں مصروف کمپنیاں اجارہ دار کمپنیاں تھیں جن کا تعلق یورپ کے شمال مغرب کے متعدد ممالک سے تھا۔یورپ میں ایسٹ انڈیا کمپنیاں قائم ہوئی اور مغربی بازار میں مشرق کی پر تعیش مصنوعات کی طلب میں اضافہ ہوا کیونکہ یورپ میں ان کی بڑی مانگ تھی۔ابتدائی قوم پرست مورخ رمیش چندر دت(Romesh Chunder Dutt)کے مطابق 'آزاد تجارت نے روایتی دستکارانہ صنعت کو ختم کر دیا اور ہندوستان کو مزید غریب بنا دیا۔'ان کے مطابق ہندوستانی صنعتکاروں سے برطانوی کارخانہ داروں کی طرف تبدیلی برطانوی ہند کی تاریخ کا ایک دردناک باب ہے۔

ہندوستان میں صنعتی زوال کی متعدد وجوہات حسب ذیل ہیں۔

- برطانوی فیکٹریوں نے سستا کپڑا بنایا اور ہندوستان میں اس کا سیلاب آگیا۔ صنعتی انقلاب کے ساتھ برطانیہ نے کپڑے کی تیاری کے لیے جدید ٹکنالوجی اور مشینیں متعارف کیں ۔اس وجہ سے اشیاء کی تیاری میں آسانی ہوئی اور برصغیر ہند میں انگریزی کپڑے کی کثرت ہو گئی۔ یہ کپڑا سستے داموں پر فروخت ہوتا اور اس طرح ہندوستان کی روایتی صنعت تباہ ہو گئی۔
- 1853 میں ریلوے نظام متعارف ہوا جس کے سبب ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک برطانوی اشیاء کی رسائی ممکن ہو گئی۔
- ہندوستانی دستکاری کی حفاظت کے لیے نرخ کی پالیسیوں کی عدم موجودگی۔ انگریزوں نے برطانوی مصنوعات کے فروغ کے لیے برطانوی مصنوعات کے ہندوستان میں داخلہ کو آسان بناتے ہوئے اس پر عائد ٹیکسوں میں کمی کی، جب کہ ہندوستانی مصنوعات کی برآمدات پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس عائد کیا۔ اس پالیسی کو تجارتی تحفظ پسندی (Mercantilism) کی پالیسی کہا گیا۔ بین الاقوامی بازار، بین الاقوامی تاجروں کے کنٹرول میں تھا جس کے سبب دستکاروں کو ان تاجرین کے رحم و کرم کا محتاج ہونا پڑا۔ دیگر اقوام کے مقابلہ میں ہندوستان میں دستکاروں کی تنظیمیں کمزور ہو گئی۔
- برطانوی اقتدار کے سبب کاریگروں کے لیے مقامی بادشاہوں کی سرپرستی میں کمی آگئی جو قدیم زمانے سے ان کے بڑے خریدار اور سرپرست رہے تھے۔ اس کے نتیجہ میں دستکاری زوال کا شکار ہوئی۔
- ہندوستان اور برطانیہ کی مصنوعات میں مقابلہ آرائی کے لیے غلط قوانین ہندوستان پر مسلط کیے گئے۔ ناانصافی اور غیر برابری پر مبنی پالیسیوں جیسے ہندوستانی اشیاء پر پابندی، گھریلو بازار میں بھاری قیمت اور آزاد تجارت کے نام برطانوی تاجروں کے لیے ہندوستانی بازار میں آزادی، وغیرہ کے ذریعہ ہندوستانی کارخانہ داروں کے لیے انگلینڈ کے بازار تک رسائی کو محدود کیا گیا۔
- 1848 سے ہندوستان سے انگلینڈ کے لیے برآمدات پر زیادہ ٹیکس عائد کیا گیا اور گھریلو چنگیوں (Inland Customs) اور ترسیلی محصول نظام (Transit Duty System) کے ذریعہ ہندوستانی بازار کو محدود کر دیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا سیاسی اثر ورسوخ استعمال کر کے کاریگروں اور کپڑا بنکروں پر اجارہ دارانہ کنٹرول قائم کیا اور، انہیں سستی اشیاء کی تیاری یا پھر اس میں ناکامی کی صورت میں اپنے آبائی پیشے کو چھوڑنے پر مجبور کیا۔

10.5 کپڑے کی صنعت کا زوال (Decline of the Textile Industry)

15 ویں صدی میں انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں سوتی کپڑے کی تیاری نے ایک ممتاز شکل اختیار کر لی تھی جس کے سبب ہندوستان سے زمینی اور سمندری راستہ کے ذریعہ بڑے پیمانے پر مشرق میں انڈونیشیاء اور جاپان جیسے ایشیائی ممالک اور عرب، ایتھوپیا، مصر اور مغربی افریقہ تک تجارت کے لیے وسیع بنیاد فراہم ہوئی۔ ہندوستانی تاجر سوتی کپڑے کی مختلف اقسام کی تجارت کرتے تھے جس کے عوض وہ متعدد اشیاء جیسے کھانے پینے کی اور پر تعیش اشیاء خریدتے تھے۔ مغربی ہندوستان میں گجرات کا علاقہ، شمال میں کورومنڈل اور بعد ازاں بنگال بڑے تجارتی مراکز بنتے جا رہے تھے۔ یوروپی اقوام بھی اس طرح کی بڑے پیمانہ پر تجارت سے کافی حیرت زدہ تھے۔ بحری سیاحوں نے بھی ناگا

پٹنم، سینٹ تھامس اور مسولی پٹنم میں تیار کیے جانے والے مہین کپڑے کا مشاہدہ کیا۔ یہ سوتی کپڑے اپنے رنگ اور مختلف طریقوں کی بنائی اور نقش و نگار کے لیے مشہور تھے جو بہت مہین اور نزاکت سے تیار کردہ تھا اور ہندوستان میں عام طور سے استعمال ہوتا تھا۔ ہندوستانی سوتی کپڑے بحر ہند کے علاقہ میں زیادہ تر ممالک تک رسائی رکھتے تھے۔ سترہویں صدی کی ابتداء میں بڑی مقدار میں یہ ہندوستانی سوتی کپڑے ایران کے شمالی ساحل پر مستقلاً فروخت ہوتے تھے اور ہندوستانی تاجروں کے ذریعہ زمینی اور سمندری راستہ سے فارس، بغداد اور بصرہ جاتے تھے جب کہ شام کے راستہ قسطنطنیہ تک پہنچتے تھے۔ براعظم ایشیاء کے دیگر ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کرنے میں دیگر مصنوعات کے ساتھ کپڑے نے بھی اہم رول ادا کیا۔ یہاں تک کہ 1660 کے دہے میں بیک وقت 25 تا 30 ہزار اونٹوں پر سوار کپڑے کی مصنوعات ہندوستان سے ہر سال ایران روانہ کی جاتی تھی۔ سترہویں صدی کی ابتداء سے یورپ، ہندوستانی کپڑے کا نیا بازار بن چکا تھا۔ حالانکہ بنگال، گجرات اور کورومنڈل بین الاقوامی تجارت کے مراکز بنے رہے لیکن ان کی اہمیت میں کمی واقع ہوئی اور صرف بنگال کافی اہمیت اختیار کر گیا۔ 1700 تک ہندوستانی بحری تجارت، ہند یورپی نوعیت کی حامل تھی اور اس تجارت کی اہم ترین مصنوعات کپڑا بن گیا تھا۔ اس نے چاول اور مسالوں کی جگہ لے لی تھی جس کا اب تک بحری تجارت پر غلبہ تھا۔

ہندوستان اور چین سے پرتعیش اشیاء کی یورپ درآمد نے اٹھارہویں صدی کے آخر میں یورپی معیشت کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ پرتعیش اشیاء کی صورت میں کپڑے نے مغربی صارفین اور صنعتوں تک رسائی حاصل کر لی۔ ایشیاء سے درآمدی اشیاء کی طلب صرف دربار اور امیر افراد تک محدود نہیں رہی بلکہ فیشن انڈسٹری میں بھی اس کی طلب میں اضافہ ہوا۔ یوروپی یہ مصنوعات درآمد کرتے تھے۔ طلب اور رسد میں غیر معمولی اضافہ اور دیگر ایشیائی مصنوعات کے یورپی بازار میں رسائی کے سبب انیسویں صدی کے آخر تک آسان تکنیک پر مبنی کپڑے کی صنعت نے بین الاقوامی بازار پر غلبہ بنائے رکھا۔ ابتداء میں یورپی کمپنیوں کو کپڑے برآمد کرنے کے لیے مناسب درآمدی سامان تلاش کرنے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ طلب قیمتی سونے اور چاندی کی تھی جس کے سبب ہندوستان میں بلین (*Bullion*) یا سونے اور چاندی کی بڑے پیمانہ پر ترسیل کا آغاز ہوا۔ 1757 میں برطانیہ کے سیاسی اقتدار کے حصول تک یہ رجحان جاری رہا۔ اس کے بعد سونے کی ترسیل رک گئی اور اس کی جگہ کمپنی کو حاصل ہونے والے زمینی محصول نے لے لی۔ کمپنی نے زمینی محصول میں اضافہ کر دیا اور کپڑے پر بھی محصول نافذ کر دیا۔ ہندوستانی کپڑے کو بین الاقوامی بازار میں سوتی کپڑوں کے معیار اور ڈیزائن نیز کاریگروں کی کم اجرت پر دستیابی کے سبب مسابقتی فوائد حاصل ہوئے۔ اٹھارہویں صدی کے درمیانی عرصہ میں ہندوستانی کپڑے کی مصنوعات، برطانیہ میں صنعتی انقلاب آنے سے مشین سے تیار کی جارہی مصنوعات کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہو گئی۔ حالانکہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے برآمدات کے لیے ادائیگی کے ذریعہ اس مسئلہ کے حل کی کوشش کی لیکن کپڑے کی صنعت کو ایک بڑا دھچکا لگا جس کے سبب بین الاقوامی بازار میں ہندوستان کے مقام کو کافی نقصان پہنچا۔ انیسویں صدی کے آخر تک ہندوستانی دستکاری صنعت، زوال کا شکار ہوئی اور اس کے ختم ہو جانے کی نوبت آپہنچی۔

برطانیہ میں کاریگروں کی اجرت ہندوستان کے مقابلہ میں پانچ گنا زیادہ تھی اس لیے وہاں ہندوستانی تکنیک سے کپڑے کی تیاری کافی مہنگی تھی۔ صنعتی انقلاب کی کم محنت طلب تکنیک کے سبب یہ حالات تبدیل ہو گئے اور مشینوں کے ذریعہ سوتی کپڑوں کی تیاری سے اس کی

قیمتوں میں کافی کمی واقع ہوئی۔ ہندوستانی کاریگر اس قیمت پر کپڑے تیار نہیں کر سکتا تھا اور ادھر برطانیہ میں تیزی سے کپڑے کی تیاری جاری رہی، جس کے سبب برطانوی بازار میں ہندوستانی کپڑا مقابلہ نہیں کر پایا۔ ادھر اندرون ملک بھی ہندوستانی مصنوعات کو برطانوی مصنوعات سے مقابلہ پیش آیا۔ انیسویں صدی کے درمیانی عرصے میں رفتہ رفتہ ہندوستانی مصنوعات کی جگہ برطانوی مصنوعات نے لے لی۔ دستکاری سے تیار کردہ مصنوعات، صنعتی انقلاب کے سبب مشینوں سے تیار کردہ مصنوعات کا مقابلہ نہیں کر پائی اور ہندوستانی صنعت اور دستکاری زوال کا شکار ہو گئی۔ ایسا اس وجہ سے بھی ہوا کیوں کہ ہندوستانی دھاگہ نے ہندوستانی کپڑے پر اپنا قابو کھو دیا۔ ہندوستان میں تکنیکی تبدیلیوں کی رفتار کافی سست تھی اور ہندوستانی بنکروں نے گھریلو تیار کردہ دھاگے کی جگہ اب سستے اور ٹکاؤ باہر سے منگائے ہوئے دھاگے کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہندوستانی کپڑے کی صنعت کی جگہ انگریزی ملوں میں تیار کردہ کپڑے نے لے لی تھی، جس کے سبب 1830 اور 1880 کے درمیان ہندوستانی کپڑوں کی مصنوعات کے گھریلو استعمال میں کمی واقع ہوئی۔ سال 1828 میں سوتی کپڑوں کی سالانہ درآمدات 40 لاکھ سے زائد تھی جو مجموعی درآمدات کا 8 فیصد تھی۔ 1867 اور 1886 کے دوران سوتی کپڑے کی درآمدات 95.8 کروڑ گز سے بڑھ کر 215.6 کروڑ گز تک پہنچ گئی۔ سال 1870 میں ان مصنوعات کی درآمدات مجموعی درآمدات کی 47 فیصد تک پہنچ گئی اور 1960 میں یہ 230.9 کروڑ گز تک پہنچ گئی۔

10.6 صنعت اور دستکاری کے زوال کے نتائج

(Consequences of the Decline of Industry and Handicrafts)

جدید صنعتی ترقی کی جانب انگریزوں نے کسی طرح کے اقدامات نہیں کیے تھے۔ روایتی زندگی ہندوستان میں صنعت کاری سے ماورا نہیں رہ پائی جو اسی دوران انگلینڈ اور دیگر صنعتی ممالک میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ اس کے سبب ہندوستان میں عدم صنعت کاری ہوی جب کہ یورپ میں صنعتی انقلاب پوری شدت کے ساتھ ترقی کر رہا تھا۔ یہ تمام سرگرمیاں اس وقت ہو رہی تھیں جب کہ ہندوستانی کاریگر اور دستکار پہلے ہی زمینداروں اور مقامی حکمرانوں کی سرپرستی سے محرومی کے سبب بحران کا شکار تھے جو اب نئے مغربی اقتدار کے زیر اثر آچکے تھے۔ اس عمل کے نتیجہ میں دیہاتوں کی جانب واپسی کا عمل شروع ہوا۔ ہزاروں بنکر اپنی گذر اوقات سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایک تخمینے کے مطابق بنگال میں 1801 میں صنعتی روزگار میں 9 فیصد کے مقابلہ 1901 میں 21 فیصد کی گراوٹ درج کی گئی۔ مجموعی افراط زر میں صنعت و تجارت کے شعبہ میں بھی کمی واقع ہوئی۔ انیسویں صدی کے دوران شہروں میں سکونت اختیار کرنے کے رجحان میں 15 سے 9 فیصد کی گراوٹ درج ہوئی۔ اس دوران ہندوستان کی مصنوعات کی تیاری کی بین الاقوامی حصے داری میں 2 سے 27 فیصد تک کی گراوٹ درج ہوئی۔ ہندوستان جو ماضی میں صنعتی اشیاء کا برآمد کنندہ ملک تھا، آہستہ آہستہ زرعی پیداوار کا برآمد کنندہ ملک بن گیا اور برطانوی سلطنت کی بین الاقوامی معیشت سے مربوط ہو گیا۔ 1880 میں سوتی کپڑے کا مقامی مصرف 60 فیصد برطانوی درآمدات کی صورت میں درج ہوا۔ چونکہ درآمد کردہ سوتی کپڑا سستا تھا لہٰذا فی کس آمدنی میں بھی اضافہ درج ہوا۔ ہندوستانی اشیا کی تیاری بھی زوال کا شکار ہوئی اور تیار شدہ اشیاء اس کی فہرست برآمدات سے خارج ہو گئی۔ 1880 کے بعد جدید کپڑے کی صنعت کی ترقی کے ساتھ ہندوستانی کپڑا بنانے والے بازار میں حصص (shares) حاصل کرنے میں

ناکام رہے۔ کپڑا بنکروں اور کاریگروں کی بے روزگاری میں اضافہ ہوا جس کے سبب وہ گذر اوقات کے لیے زراعت کی جانب متوجہ ہوئے لیکن اس کے سبب کاریگروں کے مجموعی معیار زندگی پر برے اثرات مرتب ہوئے۔ 1901 تک 1.3 کروڑ صنعتی مزدوروں کی ایک تہائی تعداد دستکاروں پر مشتمل تھی۔ متعدد کاریگر، کمپنی حکومت کے تحت کم سے کم اجرت اور جابرانہ پالیسیوں کا شکار ہوئے۔ کاریگروں اور بنکروں کو کم سے کم اجرت دی جاتی تھی اور ان کی تیار کردہ اشیاء کم قیمت پر فروخت کرنے کے لیے انہیں مجبور کیا جاتا۔ اس کے سبب زرعی زمینوں پر بوجھ میں اضافہ ہوا۔ برطانوی دور حکومت میں غربت کی ایک بڑی وجہ زرعی شعبے پر اضافی بوجھ بھی تھی جس کی وجہ سے دیہاتوں کا معاشی نظام بھی متاثر ہوا۔

10.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

برطانوی نوآبادیاتی حکومت کے سبب ہندوستان میں روایتی صنعت ختم ہوگئی۔ یہ بازار کی ضروریات کے مطابق، تیار کردہ مصنوعات کے انگلینڈ سے ہندوستان آنے کے سبب ہوا جس نے ہندوستانی دستکاروں اور کارخانہ داروں پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے۔ انیسویں صدی کے درمیانی عرصہ میں ہندوستان میں برطانوی استعماریت متعدد معاملات میں کامیاب تھی۔ جب کہ اس کی ترقی اور صنعتی انقلاب کی ایجادات نے ہندوستان کو تیار کنندہ ملک سے بدل کے خام مال برآمد کرنے والا ملک بنا دیا تھا۔ یہ عدم صنعت کاری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہندوستانی دستکاری کی تباہی و بربادی کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے دوران درآمد شدہ مصنوعات پر برطانیہ کی نرخ کی پالیسی (tarrif policy) نے ہندوستان میں برطانوی مصنوعات کی توسیع میں کافی مدد کی۔ روایتی صنعت کاری اور زراعت کو انہوں نے نقصان پہنچایا اور عمومی زراعت کے طرف بڑھتے ہوئے رجحان کے سبب زرعی شعبے پر روزگار کی فراہمی کا بوجھ بڑھ گیا۔ ہندوستان جو یورپ کے لیے سوتی کپڑوں کی مصنوعات کا بڑا برآمد کنندہ ملک تھا اب برطانوی سوتی کپڑوں کا درآمد کنندہ اور زرعی خام مال کا برآمد کنندہ ملک بن گیا تھا۔

10.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

تجارتی تحفظ پسندی : اپنی ملکی تجارت کو بیرونی مصنوعات کے مقابلے میں چنگیوں کے ذریعے تحفظ دینا۔

درآمدات : (import) جو چیز ملک میں کہیں باہر سے آئے۔

برآمدات : (export) جو چیز ملک سے کہیں باہر جائے۔

بلین : سونا چاندی اور قیمتی پتھر

ادائیگی : (payment) تجارت میں کسی شے کی قدر کا مبادلہ

نرخ کی پالیسی : (Tarrif Policy) چنگی کی پالیسی، جو کسی چیز کی درآمد یا برآمد پر محصول لگا کر اپنائی جاتی ہے جس سے مقامی تجارت اور صنعت کو تحفظ دیا جا سکے۔

10.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

10.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ترکوں نے قسطنطنیہ پر کس سال میں قبضہ کیا؟
2. کرسٹوفر کولمبس نے 1492 میں کس ملک کو دریافت کیا تھا؟
3. ہندوستان میں سب سے آخر میں آنے والے یورپی کون تھے؟
4. 1759 کی چنسورا کی جنگ میں ڈچوں کو کس نے شکست دی؟
5. ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد کس سال میں پڑی؟
6. تجارتی تحفظ پسندی (Mercantilism) کی پالیسی سے کیا مراد ہے؟
7. درآمدات کسے کہتے ہیں؟
8. برآمدات کسے کہتے ہیں؟
9. بلین کسے کہتے ہیں؟
10. نرخ کی پالیسی (Tarrif Policy) سے کیا مراد ہے؟

10.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. یوروپی ممالک مشرق کے لیے بحری راستہ کی تلاش میں کیوں تھے؟ واضح کیجیے۔
2. یوروپیوں کی ہندوستان کے ساتھ ابتدائی تجارت کی نوعیت کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
3. کمپنی کی حکومت پر مختصر نوٹ لکھیے۔
4. تاج برطانیہ کی حکومت پر مختصر نوٹ لکھیے۔
5. صنعت اور دستکاری کے زوال کے نتائج پر نوٹ لکھیے۔

10.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے قیام پر تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. روایتی صنعتوں پر برطانوی نوآبادیاتی حکومت کے نتائج کا جائزہ لیجیے۔
3. کپڑے کی صنعت کے زوال پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

10.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Chandra, Bipan, *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India*. Anamika Publishers & Distributors Pvt., Ltd., 2016.
2. Kumar, Dharma, and Desai, Meghnad. (eds.), *The Cambridge Economic History of India*, *Volume II*: *c.1757-2003*, Orient Longman, Hyderabad, 2005.
3. Tharoor, Shashi, *An Era of Darkness*: *The British Empire in India*. Aleph, 2016.
4. *Robb*, *Peter*, *A History of India*. Cambridge University Press, 2011.
5. Roy, Tirthankar, *Traditional Industry in the Economy of Colonial India*. Cambridge University Press, 1999.

اکائی 11۔نوآبادیاتی معیشت کی خصوصیات

(Characterising the Colonial Economy)

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید

11.1 مقاصد

11.2 ماقبل برطانوی دور: مالگزاری اور زراعت

11.3 ہندوستان میں نوآبادیت کے مراحل

11.3.1 تجارتی سرمایہ داری کا مرحلہ

11.3.2 صنعتی سرمایہ داری کا مرحلہ

11.3.3 مالیاتی سرمایہ داری کا مرحلہ

11.4 دولت کی نکاسی کا نظریہ

11.4.1 ابتدا اور ارتقا

11.4.2 دولت کی نکاسی کے اسباب

11.4.3 دولت کی نکاسی کے نتائج

11.4.4 دولت کی نکاسی کے طریقے

11.4.5 دولت کی نکاسی کے بارے میں مورخین کے خیالات

11.4.6 نکالی گئی دولت کی مقدار اور نوعیت

11.5 جدید صنعتوں کا ارتقا

11.6 زرعی معیشت اور زراعت کی تجارت کاری

11.6.1 دیہی مقروضیت

11.6.2 زرعی مزدوروں میں اضافہ

11.7 اکتسابی نتائج

11.8 کلیدی الفاظ
11.9 نمونہ امتحانی سوالات
11.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
11.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
11.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
11.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

11.0 تمہید (Introduction)

زراعت ہندوستان کی دو تہائی آبادی کو ضروریات زندگی فراہم کرتا تھا ۔ برطانوی راج کے قائم ہونے کے بعد 1860 اور 1920 کے درمیان قابلِ کاشت اراضی میں 50 فیصد کا اضافہ ہوا۔ تاہم اس سے دیہی معیشت اور کسانوں کی حالت میں کچھ زیادہ سدھار نہیں آیا۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان میں اراضیات اور زراعت نے دو بڑی بیرونی طاقتوں کا سامنا کیا جو دیہی معیشت پر اثرانداز ہوئیں۔ پہلی، جنگوں کی وجہ سے ملک کی معیشت پر بڑھنے والا دباو تھا اور آبادی میں اضافہ۔ ریاست اپنی زیادہ تر فوجی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے دیہی معیشت کے وسائل کو ہی استعمال کرتی۔ نتیجتاً ہندوستان میں نئے اراضی محصولات کا نظام رائج کیا گیا جس میں مالکانہ حقوق میں تبدیلی کی گئی اور جنہیں نئے قوانین اور جدید عدالتوں کا تحفظ حاصل تھا۔ مالکانہ حقوق سے متعلق احکام ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں مختلف تھے۔ مثال کے طور پر، بنگال میں مستقل سٹلمنٹ یا زمینداری سٹلمنٹ (1973) کے ذریعہ ثانوی ملکیت فراہم کی گئی۔ دیگر سٹلمنٹ میں مدراس پریزیڈنسی کیلئے رعیت واری سٹلمنٹ اور محل واری نظام برائے شمالی علاقہ جات متعارف کئے گئے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں ان زرعی و اراضی محصولات کی پالیسیوں نے دیہی علاقوں میں زرعی پیداوار، روزگار، کمرشیل فصلوں میں وسعت، اور کسانوں کی طرز زندگی پر کافی وسیع اثر ڈالا۔

11.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- برطانوی راج سے پہلے کے مالگزاری نظام اور معاشی حالات کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ہندوستان میں نوآبادیت کے مراحل کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ہندوستان میں دولت کی نکاسی کا نظریہ کا جائزہ لے سکیں گے۔
- جدید صنعتوں کے ارتقا کو سمجھ سکیں گے۔

- زراعت کی بازار کاری کے نتائج کے بارے میں جان لیں گے۔
- دیہی مقروضیت کے بارے میں وضاحت کر سکیں گے۔
- زرعی مزدوروں میں اضافہ کا تجزیہ کر سکیں گے۔

11.2 ماقبل برطانوی دور میں مالگزاری اور زراعت

(Revenue and Agriculture in Pre-British India)

سامراجی نظام سے پہلے، زرعی پیداوار بازار میں بڑے پیمانے پر فروخت ہوا کرتیں۔ بازار زیادہ تر ایک علاقہ تک محدود ہوتے اور اوزان و پیمائش کے آلے ہر علاقہ میں الگ الگ ہوتے۔ حمل و نقل زیادہ تر بیل گاڑیوں پر ہوتا کیونکہ طویل فاصلہ میں تجارت کرنا کشتیوں کے ذریعہ ممکن نہیں تھا۔ تاہم انیسویں صدی میں بازار کی توسیع کافی الگ تھی۔ ریلوے لائن کے قیام نے ان رکاوٹوں کو دور کر دیا تھا۔ ہندوستان' عالمی تجارتی نظام کا ایک اہم حصہ بن گیا۔ برطانیہ صنعتی پیداوار میں آزمودہ ملک بن گیا جبکہ غذائی اجناس وہ یوروپ کے باہر ملکوں سے خرید رہا تھا۔ سال 1870 اور 1914 کے درمیان ہندوستان سے برآمدات میں 500 فیصد کا اضافہ ہوا۔ غیر صنعتی اشیا کی برآمدات جملہ برآمدات کا 70 تا 80 فیصد تھیں۔ زرعی اشیا کی قیمتیں صنعتی اشیا سے بھی زیادہ ہو گئیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں زیر کاشت اراضی میں بھی اضافہ ہوا۔ اقتصادی فصلیں جیسے گیہوں' کپاس' تیل کے بیج' گنا اور تمباکو اس سارے نظام کا اہم حصہ بن گئیں۔ ان تبدیلیوں کے علاوہ اراضیات کے کرائے و قیمتیں' قرضہ جات' اراضیات کی منتقلی' اور زرعی مزدوروں کی گشتی میں اضافہ ہوا۔

زراعت' ہندوستان کی ایک بڑی اکثریت کا ذریعہ روزگار بن گیا۔ چھوٹے کسانوں کیلئے زراعت ہی سب سے اہم کام ہوا کرتا جس میں ان کے افراد خاندان بھی کام کرتے۔ ہندوستان کے روایتی انتظام میں زمین' کسان کی ملکیت ہوتی۔ اور حکومت کسانوں سے ان کی فصل کا کچھ حصہ حاصل کرتی۔ زرعی پیداوار کا یہ نظام جو دیہی ہندوستان کے زیر انتظام تھا صدیوں سے بنا کسی تبدیلی کے چلا آرہا تھا۔ ریاست کسی بھی اراضی کی فصل میں کچھ حصہ لیا کرتی نہ کہ زمین کی ملکیت میں اور اس سے روایتی حقوق کو کوئی دھکا نہیں لگا تھا۔ یوروپ میں دیہی اراضیات بھی کسی زمیندار کی ملکیت ہوتے ہیں اور اس کے برعکس ہندوستان میں صدیوں سے کسی بھی سیاسی تبدیلیوں کا کسانوں کے حق ملکیت پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انگریزوں کی آمد سے ملک میں زمینداری نظام رائج ہوا اور انہیں چند دیہاتوں کے محصولات وصول کرنے کا اختیار دیا گیا۔ بادشاہ یا ریاست ان اراضیات کی مالک نہیں تھی لیکن زمینوں سے حاصل ہونے والی آمدنی پر کچھ حصہ ٹیکس وصول کرتی۔ اس وجہ سے کسان دیہی اراضیات کی ملکیت سے محروم ہوتے گئے۔ ریاست کی جانب سے دیہی اراضیات پر نئے سود لئے جانے لگے اور دیہی معیشت میں پیسے کا نفوذ شروع ہو گیا۔ نئے اراضی محصولی نظاموں جیسے مستقل (زمینداری)' رعیت واری اور محل واری اراضی مالیہ نظام کی وجہ سے روایتی طریقہ کار ختم ہوتے چلے گئے۔

11.3 ہندوستان میں نوآبادیت کے مراحل (Stages of Colonialism in India)

ہندوستان میں نوآبادیت کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا گیا ہے، یہ مراحل درج ذیل ہیں۔

1. تجارتی سرمایہ داری کا مرحلہ (1757 سے 1813 تک کا مرحلہ)
2. صنعتی سرمایہ داری کا مرحلہ (1813 سے 1857 تک کا مرحلہ)
3. مالیاتی سرمایہ داری کا مرحلہ (1858 سے 1947 تک کا مرحلہ)

11.3.1 تجارتی سرمایہ داری کا مرحلہ (Stage of Mercantile Capitalism)

نوآبادیاتی نظام کے پہلے مرحلے میں انگریزوں نے معاشی لوٹ مار پر توجہ مرکوز کی۔ کمپنی ہندوستان کے ساتھ تجارت پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی اور برطانوی یا یورپی تاجر یا تجارتی کمپنی نہ ہو۔ کمپنی کو دیگر یورپی اقوام کو ہندوستان سے دور رکھنے کے لیے فرانسیسی اور ولندیزیوں کے ساتھ شدید جنگ لڑنی پڑی۔

11.3.2 صنعتی سرمایہ داری کا مرحلہ (Stage of Industrial Capitalism)

یہ مرحلہ 1813 کے منشور ایکٹ کے ذریعے ہندوستان کے ساتھ تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری کے خاتمے کے ساتھ شروع ہوا۔ 1813ء کے منشور ایکٹ سے پہلے ہندوستان کی تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری تھی۔ کمپنی کے علاوہ یورپ کا کوئی اور تاجر ہندوستان کے ساتھ کاروبار نہیں کر سکتا تھا۔ اس اجارہ داری کو قائم کرنے کے لیے کمپنی نے فرانسیسی، پرتگالیوں اور ولندیزیوں کو شکست دی اور انہیں ہندوستان سے نکال دیا گیا اور جو باقی رہ گئے وہ انتہائی محدود علاقوں میں رہنے پر مجبور ہو گئے۔ برطانوی پارلیمنٹ میں 1813ء کے منشور ایکٹ کے ذریعے ایک قانون پاس کیا گیا، اسے 1813ء کا منشور ایکٹ کہا جاتا ہے۔ منشور ایکٹ ہر 20 سال کے وقفے سے جاری کیا جاتا تھا۔ اس سے پہلے 1793ء کا منشور ایکٹ تھا۔ منشوروں کو پاس کرنے کا مقصد برطانوی حکومت کی طرف سے علیحدہ قانون سازی کے ذریعے کمپنی پر اپنا کنٹرول قائم کرنا تھا۔ 1813ء میں منظور کیے گئے منشور ایکٹ کے ذریعے برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے کمپنی کی اجارہ داری ختم کر دی گئی۔ 1813ء میں منظور ہونے والے منشور ایکٹ کے مطابق اب کمپنی کی یہ اجارہ داری صرف دو شعبوں تک محدود تھی۔

1. چائے کی تجارت پر
2. چین کے ساتھ تجارت پر

برطانیہ میں صنعتی کارخانوں میں بڑے پیمانے پر پیداوار شروع ہوئی۔ وسائل کی تکنیکی دریافتوں کی وجہ سے بڑے پیمانے پر پیداوار کی وجہ سے اب برطانوی کمپنیوں کے سامنے دو طرح کے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ تیار کردہ سامان کو کس طرح استعمال کیا جائے۔ پیداوار میں اضافے کی وجہ سے خام مال کی سپلائی کو کیسے بڑھایا جائے۔

مندرجہ بالا وجوہات کی بناپر 1813 کے منشور ایکٹ کے ذریعے ہندوستان کی تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری کو سب سے پہلے ختم کر دیا گیااور ہندوستانی منڈیاں تمام تاجروں کے لیے کھول دی گئیں۔اب ہندوستان کو برطانوی کارخانوں میں تیار ہونے والی اشیا کی بازار کے لیے تیار کیا گیا۔ ہندوستان کو برطانوی صنعتوں کے لیے خام مال کی فراہمی کا ذریعہ بھی بنایا گیا تھا۔1813 میں ،ہندوستانی بازار برطانوی فیکٹریوں میں تیار ہونے والے سستے کپڑوں سے بھر گیا،کارخانوں میں بنی چیزیں موثر اور سستی تھیں ۔ہندوستان میں ہاتھ سے بنے کپڑے برطانوی کپڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔اس طرح ہندوستانی کپڑے اور دستکاری کی صنعتوں کو بڑا دھچکا لگا اور ہندوستان میں بے روزگاری بڑھنے لگی۔ یہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری 1857ء کے انقلاب کا پس منظر بن گئی۔1813 عیسوی کے ہندوستان میں غذائی اجناس کی پیداوار کی حوصلہ شکنی کی گئی کیونکہ اگر اناج پیدا ہوگا تو کارخانوں کے لیے خام مال کیسے پیدا ہوگا؟کارخانوں اور نقد فصلوں کے لیے خام مال کی فراہمی کے لیے اناج کی پیداوار کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ کھیتوں میں اگائی جاتی تھی۔ مثلاً کپاس،انڈ گو، چائے، ربڑ وغیرہ کی پیداوار کو فروغ دیا گیا۔ہندوستان میں ان نقد آور فصلوں کی پیداوار کی وجہ سے غذائی اجناس کی پیداوار گرنے لگی،غذائی اجناس کی قیمتوں میں کمی کے باعث ہندوستان ی منڈیوں میں غذائی اجناس کی قیمتیں بڑھنے لگیں،اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں غذائی قلت بھی بڑھ گئی۔ہندوستان میں خام مال کی پیداوار میں اضافہ ہوا،اس کے ساتھ ساتھ سوتی کپڑوں کی درآمد میں بھی اضافہ ہوا،ہندوستان میں خام مال کی برآمد میں اضافے کے ساتھ ہندوستان میں غیر ملکی کپڑوں کی درآمد میں بھی اضافہ ہوا۔

ہندوستانی باغانوں سے تیار ہونے والا خام مال بندرگاہوں پر بھیجا جاتا تھا اور بندرگاہوں کے ذریعے یہ خام مال لوڈ کر کے برطانیہ بھیجا جاتا تھا،اب ہندوستان میں پیدا ہونے والے خام مال کو تیزی سے بندرگاہوں تک بھیجنے کے لیے نقل و حمل کے ذرائع تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ محسوس ہونے لگا ہندوستان میں 1853 عیسوی میں ریلوے کی ترقی شروع کی گئی تاکہ ہندوستانی باغانوں سے خام مال کو برطانیہ کی اندرونی منڈیوں تک پہنچایا جاسکے۔ہندوستان میں ریلوے کی ترقی کے بنیادی طور پر تین مقاصد تھے۔

1. ہندوستان سے بندرگاہوں تک خام مال کی نقل و حمل۔
2. انگلینڈ کے تیار کردہ سامان کو بندرگاہوں سے ہندوستان کی اندرونی منڈیوں تک پہنچانا۔
3. کسی بھی بغاوت کی صورت میں ملک کے کسی بھی حصے میں فوج کی تیز رفتار نقل و حرکت۔

11.3.3 مالیاتی سرمایہ داری کا مرحلہ (Stage of Finance Capitalism)

برطانیہ میں صنعتی پیداوار کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ کمپنی کی جانب سے ہندوستانی منڈیوں کے استحصال سے برطانیہ میں بہت بڑا سرمایہ جمع ہو گیا۔ محنت کش طبقہ اپنے فائدے کے لیے منظم ہو گیا، رفتہ رفتہ برطانوی سرمایہ دار طبقہ خوف زدہ ہونے لگا، چنانچہ صنعت کاروں نے سوچا کہ برطانوی سرمایہ کو برطانیہ میں لگانا سود مند نہیں ،اس لیے اب انہوں نے برطانوی سرمایہ کو ہندوستان میں لگانے کا منصوبہ بنایا۔ہندوستان میں برطانوی حکومت کو ریلوے کی ترقی کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی،اس لیے برطانوی سرمایہ داروں نے عوامی قرضوں

کے ذریعے ہندوستان کو سرمایہ دیا۔ اس عوامی قرض پر نہ صرف سود ادا کرنا تھا بلکہ حکومت ہند کو ریلوے کے منافع کا حصہ بھی دینا تھا۔ سال 1939 تک حکومت ہند پر عوامی قرضوں کا بوجھ 88 ملین پاؤنڈ تک پہنچ چکا تھا۔ برطانوی سرمائے کی سب سے بڑی سرمایہ کاری ہندوستان میں ریلوے کی ترقی میں کی گئی۔ ہندوستان میں ریلوے کے بعد برطانوی سرمائے کی دوسری بڑی سرمایہ کاری تھی۔ چائے، کافی، ربڑ اور نیل کی پیداوار میں بنایا گیا، یہی وجہ تھی کہ مالیاتی سرمایہ داری کے دور میں ہندوستان میں ربڑ، چائے، کافی اور نیل کے بڑے بڑے باغات لگائے گئے۔

11.4 دولت کی نکاسی کا نظریہ (Theory of the Drain of Wealth)

11.4.1 ابتدا اور ارتقا (Origin and Development)

برطانوی ہندوستان میں، جس طرح ہندوستانی مصنوعات سیاسی وجوہات کی بنا پر انگلینڈ کی طرف جارہی تھی، جس کے بدلے ہندوستان کو کچھ نہیں ملتا تھا، اسے دولت کی نکاسی (Drain of Wealth) کے نظریے کا نام دیا گیا تھا۔ دولت کی نکاسی کا تصور، تجارتی فکر کے دوران پروان چڑھا۔ اس وقت کے بہت سے معاشی مورخوں نے دولت کی نکاسی کے اصول پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں سب سے پہلے دادا بھائی نوروجی (Dadabhai Naoroji) نے معاشی اخراج کا تصور اپنی کتاب *Poverty and Un-British Rule in India* میں پیش کیا۔ اس نے دولت کی نکاسی کو تمام برائیوں کی برائی کہا ہے۔ 1905 میں انہوں نے کہا تھا کہ 'دولت کا بہاؤ تمام برائیوں اور ہندوستانی غربت کی جڑ ہے۔' رمیش چندر دت، مہادیو گووندر اناڈے اور گوپال کرشن گوکھلے جیسے قوم پرست مفکرین نے بھی دولت کی نکاسی کے اس عمل پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق حکومت آبپاشی کے منصوبوں پر خرچ کرنے کے بجائے ایسی چیزوں پر خرچ کرتی ہے جس کا براہ راست تعلق سامراجی حکومت کے مفادات سے ہو۔ دولت کی نکاسی کے اہم عناصر برطانوی انتظامی اور فوجی افسران کی تنخواہ اور بھتے، ہندوستان کے بیرونی ملک سے لیے گئے قرضوں پر سود، شہری اور فوجی محکمے کے لیے برطانوی اسٹوروں سے خریدی گئی اشیا، جہاز رانی کمپنیوں اور غیر ملکی بینکوں کو ادائیگیاں اور بیما کے منافع شامل تھے۔ ہندوستانی دولت انگلینڈ کی طرف جانے کی وجہ سے ہندوستان میں سرمائے کی تشکیل اور ارتقا نہیں ہو سکا، جب کہ اس دولت سے انگلینڈ میں صنعتی ترقی کے ذرائع اور رفتار بہت بڑھ گئی۔ اس دولت سے برطانوی معیشت کو جو منافع ملا وہ سرمائے کی صورت میں ہندوستان میں دوبارہ لگایا گیا اور یوں ہندوستان کا استحصال بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس دولت کے ضائع ہونے کا ہندوستان میں روزگار اور آمدنی کے امکانات پر بہت برا اثر پڑا۔ دولت کا یہ بے تحاشا بہنا ہندوستان کو اندر سے کمزور بنا رہا تھا۔

تجارتی نظام کے تحت، دولت کی نکاسی اس صورت حال کو کہا جاتا ہے جب سونا، چاندی جیسی قیمتی دھاتیں (*Bullion*) منفی تجارتی توازن کی وجہ سے ملک سے باہر چلی جاتی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ پلاسی کی جنگ سے 50 سال قبل برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانی اشیا کی خریداری کے لیے دو کروڑ روپے کی قیمتی دھات ہندوستان لائی تھی۔ کمپنی کے اس اقدام پر برطانوی حکومت نے تنقید کی لیکن کرناٹک کی جنگوں اور پلاسی اور بکسر کی لڑائیوں کے بعد صورتحال ڈرامائی طور پر بدل گئی۔ برطانوی کمپنی کو بنگال کی دیوانی کے حصول کے ساتھ، کمپنی نے اپنی سرمایہ کاری کا مسئلہ حل کر لیا۔ اب اندرونی تجارت سے حاصل ہونے والی دولت کا ایک حصہ، بنگال کی لوٹ مار سے حاصل ہونے والی

دولت اور بنگال کی دیوانی سے حاصل ہونے والی دولت کو ہندوستانی سامان کی خریداری میں لگایا جانے لگا۔اس طرح ہندوستان نے برطانیہ کو جو کچھ برآمد کیا اس کے بدلے ہندوستان کو کوئی معاشی، جسمانی یا مالی فائدہ نہیں ملا۔ لیکن بنگال کی دیوانی سے حاصل ہونے والی آمدنی کا ایک حصہ سامان تجارت کی شکل میں ہندوستان سے برطانیہ منتقل ہوتا رہا۔اسے برطانیہ کے حق میں ہندوستان سے دولت کی منتقلی کہا جاسکتا ہے۔ یہ سلسلہ 1813 تک جاری رہا لیکن 1813 کے منشور کے تحت کمپنی کا مالگزاری کھاتا اور کمپنی کا کاروباری کھاتا الگ کر دیا گیا۔

1813 کے منشور کے تحت برطانوی سامان کے لیے ہندوستان کا راستہ کھول دیا گیا اور ہندوستان میں کمپنی کی تجارتی اجارہ داری ختم کر دی گئی۔اسے ایک اہم تبدیلی کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ صورتحال اس وقت مزید تشویشناک ہو گئی جب کمپنی کی جانب سے ہندوستان سے تیار مال کی برطانیہ اور یورپ کو برآمد (export) کی بھی حوصلہ شکنی کی گئی۔ نتیجے کے طور پر، کمپنی کو اب اپنے حصص مالکان کو ادا کیے جانے والے منافع کے مسئلے کا سامنا ہوا۔ ابتدائی طور پر کمپنی نے نیل اور روئی کو برآمد کر کے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی لیکن کیریبیائی مصنوعات اور سستی مزدوری کی وجہ سے ہندوستانی نیل اور کپاس کم قیمت امریکی مصنوعات کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔اس لیے برآمدی اداروں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ یہی وجہ تھی کہ کمپنی نے متبادل کے طور پر ہندوستان میں افیون کی پیداوار پر اصرار کیا۔ پھر بڑی مقدار میں افیون چین کو برآمد کی گئی۔افیون کی برآمد کمپنی کی تجارتی صحت کے لیے اتنی ہی ضروری تھی جتنی چینی لوگوں کی صحت کے لیے وہ خراب تھی۔افیون کی تجارت کی مخالفت کے بعد بھی برطانوی کمپنی نے زبردستی یہ مہلک زہر چین پر مسلط کر دیا۔ برطانیہ ہندوستان سے چین کو افیون برآمد کرتا تھا اور اس کے بدلے میں ریشم اور چائے جمع کرتا تھا اور منافع کماتا تھا۔اس طرح ہندوستان سے برآمدات تو ہوتی رہیں لیکن درآمدات اس تناسب سے تبدیل نہ ہو سکیں۔

یہ مسئلہ اپنی بدلی ہوئی شکل کے ساتھ 1858ء کے بعد بھی جاری رہا۔1858 میں ہندوستان کا انتظام انگریزوں نے کمپنی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔اس تبدیلی کے تحت، ہندوستان کی انتظامیہ کے لیے *Secretary of State for India* کا عہدہ تشکیل دیا گیا تھا۔ ہندوستان کے سکریٹری اور ان کی کونسل کے اخراجات ہندوستانی کھاتے میں منتقل کر دیے گئے۔ جو دولت 1857ء کی بغاوت کو دبانے میں خرچ کی گئی تھی، وہ بھی ہندوستانی کھاتے میں منتقل کر دی گئی۔اس سے بھی زیادہ قابل غور حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی حکومت ہر سال ایک مخصوص دولت گھریلو اخراجات (Home Charges) کے طور پر برطانیہ بھیجتی تھی۔ اخراجات کی اس مد میں بہت سی چیزیں شامل تھیں، جیسے کہ ریلوے پر ضمانت شدہ سود، سرکاری قرضوں پر سود، برطانیہ میں ہندوستان کے لیے فوجی سامان کی خریداری، ہندوستان سے ریٹائر ہونے والے برطانوی افسران کی پنشن وغیرہ۔اس طرح گھریلو اخراجات کی رقم بھی، دولت کی نکاسی کے طور پر شمار کی گئی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ 19ویں صدی میں دولت کی نکاسی میں نہ صرف گھریلو اخراجات شامل تھے بلکہ اس میں کچھ دیگر اشیاء بھی شامل کی گئیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں کام کرنے والے انگریز افسروں کی تنخواہ کا وہ حصہ جو ہندوستان سے بچا کر برطانیہ بھیجا گیا اور نجی برطانوی تاجروں کا منافع جو ہندوستان سے برطانیہ بھیجا گیا۔ پھر، جب 1870 کی دہائی میں برطانوی پاؤنڈ کے مقابلے میں روپے کی قدر میں کمی ہوئی تو ترسیلات زر کی اصل دولت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔

11.4.2 دولت کی نکاسی کے اسباب (Causes of the Drain of Wealth)

دادابھائی نوروجی نے 6 وجوہات بتائی ہیں جن کی وجہ سے دولت کی نکاسی کے نظریہ کو تقویت ملی۔

1. ہندوستان میں غیر ملکی حکمرانی اور انتظامیہ۔
2. معاشی ترقی کے لیے جو پیسہ اور محنت درکار تھی وہ غیر ملکی لائے تھے۔ لیکن پھر غیر ملکیوں نے ہندوستان پر زیادہ توجہ نہیں دی۔
3. تمام برطانوی شہریوں کی انتظامیہ اور فوج کے اخراجات ہندوستان ادا کرتا تھا۔
4. ہندوستان اندر اور باہر تعمیر کا بوجھ اٹھا رہا تھا۔
5. ہندوستان کی طرف سے ملک کی آزاد تجارت کو کھولنے کا زیادہ فائدہ برطانیہ کو تھا۔
6. برطانوی دور حکومت میں ہندوستان میں بڑے سرمایہ کار غیر ملکی تھے۔ انہوں نے ہندوستان سے جتنا بھی پیسہ کمایا، وہ کبھی کچھ خریدنے کے لئے ہندوستان میں سرمایہ کاری نہیں کرتے تھے۔ پھر وہ اس دولت کے ساتھ ہندوستان چھوڑ جاتے تھے۔

11.4.3 دولت کی نکاسی کے نتائج (Consequences of the Drain of Wealth)

معیشت پر اثر

1. دولت کی نکاسی کے نتیجے میں ہندوستان میں سرمایہ جمع نہیں ہو سکا۔ سرمایہ جمع نہ ہو سکا تو صنعتی ترقی بھی نہیں ہوئی۔
2. عوام کا معیار زندگی مسلسل گرتا رہا اور غربت میں اضافہ ہوا۔
3. دولت کی نکاسی سے عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ بہت بڑھ گیا۔
4. اس کے ساتھ دستکارانی صنعتیں تباہ ہو گئیں اور زراعت پر دباؤ بڑھتا گیا جس سے بے زمین زرعی مزدوروں کی تعداد بڑھتی گئی۔

سیاست پر اثر

دولت کی نکاسی کے نظریہ کی تائید کرتے ہوئے، قوم پرست مفکرین نے سامراج اور قوم پرستی کے تضاد کو تسلیم کیا اور اس طرح معاشی قوم پرستی کا تصور پیدا ہوا۔ اس سے برطانوی حکومت کے تمام دعووں کو مسترد کرنے میں مدد ملی، جیسے افادیت پسندی، جدیدیت کی علامتیں، مقامی خود حکومتی، تعلیم وغیرہ۔ معاشی قوم پرستی کا یہ شعور 1906 میں سودیشی تحریک میں ابھرنا شروع ہوا جب غیر ملکی اشیاء کے بائیکاٹ اور دیسی اشیا کے فروغ کا نعرہ بلند ہوا۔

معاشرے اور ثقافت پر اثر

دولت کی کمی سے ریشم کی صنعت، تجارت، زراعت وغیرہ میں سرمایہ کاری نہیں ہوئی۔ نتیجتاً عوام کی فی کس آمدنی کم ہونے لگی۔ قحط کے تسلسل نے ان کی زندگی کو مزید خوفناک بنا دیا۔ اس طرح یورپ کی دیگر ریاستوں کے مقابلے میں ہندوستان کے لوگوں کا معیار زندگی اور زندگی کی توقع دونوں میں کمی واقع ہوئی اور یہی استحصال شدہ لوگ بعد میں ہندوستانی قوم پرستی کی سماجی بنیاد بن کر ابھرے۔

11.4.4 دولت کی نکاسی کے طریقے (Methods of Drain of Wealth)

1. کاروباری اجارہ داری سے حاصل کردہ منافع
2. کمپنی کے ملازمین کی تنخواہ اور پنشن
3. کمپنی کے سرمایہ کاروں کو ادا کردہ منافع
4. کمپنی کے لندن آفس اور اس سے متعلقہ ملازمین پر اٹھنے والے اخراجات
5. کمپنی کے فوجی اور شہری امور سے متعلق سامان ہندوستان کے بازار سے نہیں بلکہ لندن کے بازار سے خریدا جاتا تھا جسے 'اسٹور پر چیز' کہا جاتا تھا، تاکہ وہاں کے تاجروں کو فائدہ ہو۔
6. عوامی اخراجات کے لیے لندن سے لیے گئے قرض پر سود کی ادائیگی، جیسے: نہری اسکیم، قحط انتظامیہ، فوج، ریلوے وغیرہ سے متعلق اخراجات۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عوامی قرض کا بہت کم حصہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا گیا۔ تقریباً 40 فیصد حصہ فوج اور ریلوے پر خرچ ہوا۔ اور یہ فوج سلطنت کی حفاظت کے لیے استعمال کی جاتی تھی اور ہندوستان کا ریلوے کے ذریعے معاشی طور پر استحصال بڑھ گیا۔ بیرونی سرمایہ کاری پر ادا کردہ سود اور اس سرمایہ کاری سے حاصل ہونے والے منافع دونوں کا اخراج، جیسے: ہندوستان میں برطانوی حکومت، ہندوستانی ریلوے کی ترقی میں سرمایہ لگانے والی برطانوی کمپنیاں، ۔ان کے کل سرمائے کے 5 فیصد سود کی حقدار تھیں۔ جبکہ برطانیہ میں یہ منافع کی شرح صرف 2 فیصد تھی۔

11.4.5 دولت کی نکاسی کے بارے میں مورخین کے خیالات

(Historians' Views on the Drain of Wealth)

سامراجی اور قوم پرست مورخین دولت کی نکاسی کے حوالے سے مختلف آراء پیش کرتے ہیں۔

سامراجی مورخین

جان سٹریچی جیسے سامراجی مورخین کا کہنا ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان کی دولت نہیں لوٹی بلکہ برطانیہ نے ہندوستان میں اچھی انتظامیہ، سیکورٹی اور بنیادی ڈھانچہ تیار کیا اور اس کے بدلے میں معاوضہ (دولت) حاصل کیا۔ اس سلسلے میں مورس ڈی مورس کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا کردار ایک چوکس چوکیدار جیسا ہے جس نے ہندوستان میں ترقی کے امکانات کو چھتری فراہم کی۔

قوم پرست مورخین

دولت کی نکاسی کے عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے قوم پرست دانشوروں نے یہ حقیقت شائع کی ہے کہ برطانوی حکومت کی استحصالی معاشی پالیسیاں ہندوستان کی پسماندگی اور صنعتی، ثقافتی، پسماندگی کی براہ راست ذمہ دار ہیں۔ قوم پرست مصنفین کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی غربت اور پسماندگی نہ تو خدائی غضب ہے اور نہ ہی کوئی تاریخی ورثہ۔ ان کے نزدیک جس سماجی، سیاسی، ثقافتی اور معاشی عمل نے برطانیہ میں

صنعتی انقلاب کو جنم دیا، اس کی ثقافتی ترقی کی راہ ہموار کی، اسی عمل نے پسماندگی، غربت، قحط، تجارت اور صنعتوں کی تباہی وغیرہ کو جنم دیا۔ ہندوستان میں. دیا.

دادابھائی نوروجی پہلے قوم پرست رہنما تھے جنہوں نے دولت کی نکاسی کے عمل کی نشاندہی کی اور بتایا کہ برطانوی حکومت کس طرح آمدنی، صنعت، تجارت وغیرہ کے ذرائع سے ہندوستانی دولت کو نکالتی ہے۔ نوروجی کے مطابق اس سامراجی حکومت کی معاشی پالیسیوں کا سب سے مکروہ پہلو یہ ہے کہ یہاں کا پیسہ باہر نکال کر برطانیہ چلا گیا اور وہی دولت ہمیں قرض کی صورت میں دستیاب کرائی گئی جس کے لیے ہمیں بھاری دولت ادا کرنی پڑی۔ دلچسپی کا نوروجی کے مطابق، برطانوی حکومت نہ صرف ہندوستانی دولت کو ضبط کرتی ہے بلکہ اخلاقیات کو بھی ضبط کرتی ہے کیونکہ یہ ہندوستانی عوام کو ان کے حقوق سے محروم کرتی ہے۔ اس تناظر میں عالم سلیوان کا بیان سامراجی ذہنیت کو بے نقاب کرتا ہے۔: 'برطانوی حکومت کا نظام اسفنج کی طرح ہے جو گنگا کے پانی کو جذب کر کے دریائے ٹیمز میں نچوڑ دیتا ہے۔'

11.4.6 نکالی گئی دولت کی مقدار اور نوعیت (Amount and Nature of the Wealth Extracted)

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی ولی عہد کی طرف سے ہندوستان سے نکالی گئی دولت کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ مختلف علماء نے مختلف اعداد و شمار بیان کیے ہیں-

1. صوبہ بنگال میں موصول ہونے والی آمدنی اور اخراجات کی تفصیلات کے مطابق، کمپنی نے پہلے 6 سالوں (1765 سے 1771) کے دوران 1,30,66,991 پاؤنڈ خالص آمدنی حاصل کی، جس میں سے 90,27,609 پاؤنڈ خرچ ہوئے۔ دیا. بقیہ 40,39,152 پاؤنڈ کا سامان انگلینڈ بھیج دیا گیا۔
2. ولیم ڈگبی کے مطابق 1757 سے 1815 تک ہندوستان سے 50 سے 100 ملین پاؤنڈ کی دولت انگلینڈ بھیجی گئی۔
3. 1828 میں مارٹن منٹگمری نے اندازہ لگایا کہ ہر سال 30 ملین پاؤنڈ ہندوستان سے باہر جاتے ہیں۔
4. جارج ونسنٹ کے 1859 میں لگائے گئے تخمینے کے مطابق 1834 سے 1851 تک ہر سال تقریباً 42 لاکھ پاؤنڈ ہندوستان سے باہر گئے۔

11.5 جدید صنعتوں کا ارتقا (Evolution of Modern Industries)

ہندوستان میں جدید صنعتی ترقی کا آغاز بمبئی (1854) میں پہلی سورت کپڑا مل کے قیام سے ہوا۔ اس فیکٹری کے قیام میں ہندوستانی سرمایہ اور ہندوستانی انتظام اہم عوامل تھے۔ جوٹ صنعت کا آغاز 1855 میں کولکتہ کے قریب وادی ہگلی میں ایک جوٹ مل کے قیام سے ہوا، جس میں سرمایہ اور انتظامی کنٹرول دونوں غیر ملکی تھے۔ کوئلے کی کان کنی کی صنعت سب سے پہلے 1772 میں رانی گنج (مغربی بنگال) میں شروع ہوئی۔ پہلی ٹرین 1854 میں شروع ہوئی۔ ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل پلانٹ 1907 میں جمشید پور (ریاست جھارکھنڈ) میں قائم کیا گیا تھا۔ ان کے بعد سیمنٹ، شیشہ، صابن، کیمیکل، جوٹ، چینی اور کاغذ وغیرہ جیسے کئی درمیانے اور چھوٹے صنعتی یونٹس قائم ہوئے۔ آزادی سے پہلے

کی صنعتی پیداوار نہ تو کافی تھی اور نہ ہی متنوع۔ آزادی کے وقت، ہندوستان کی معیشت پسماندہ تھی، ہندوستان کی جی ڈی پی میں زراعت کا حصہ 60 فیصد سے زیادہ تھا اور ملک کی برآمدات کی زیادہ تر آمدنی زراعت سے آتی تھی۔ آزادی کے 60 سال بعد ہندوستان نے اب ایک اہم اقتصادی طاقت بننے کے آثار دکھائے ہیں۔ ہندوستان میں صنعتی ترقی کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے مرحلے (1947-80) کے دوران، حکومت نے آہستہ آہستہ مختلف اقتصادی شعبوں پر اپنا کنٹرول بڑھایا۔ دوسرے مرحلے میں (1980-97)، معیشت کو مختلف اقدامات کے ذریعے (1980-1992 کے درمیان) آزاد کیا گیا۔ ان اقدامات کے ذریعے لبرلائزیشن فوری اور عارضی بنیادوں پر کی گئی۔ اس لیے 1992 کے بعد لبرلائزیشن کے عمل پر زور دیا گیا اور نقطہ نظر کی نوعیت میں بھی بنیادی فرق لایا گیا۔

11.6 زرعی معیشت اور زراعت کی تجارت کاری

(Agrarian Economy, and Commercialisation of Agriculture)

برطانوی دور اقتدار میں تجارتی فصلوں کی داغ بیل پڑی۔ برطانوی صنعتوں کے لیے خام مال اور غذا کی طلب کی بدولت ہندوستانی زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ ہندوستانی صنعتوں کے لیے زراعت کو بطور تجارت نہیں بنایا گیا بلکہ برطانوی صنعتوں کی ضروریات کی تکمیل کے لیے یہ وقوع ہوا۔ یورپی بازار میں ہندوستانی زرعی اشیا جیسے کپاس، شکر، چائے اور جوٹ وغیرہ برطانیہ کے تجارتی منافع کا سبب بنے۔ برطانیہ کی صنعتوں کی جانب سے بھی ہندوستانی خام اشیا کے لیے دباو پایا جاتا۔ مانچسٹر سوت سپلائی ایسوسی ایشن کا بطور تحریک ہندوستان میں کپاس کی کاشت کو توسیع دینے سے یہ صاف ظاہر ہے۔ جسکے نتیجہ میں برطانیہ کے حکمراں ہندوستان میں زرعی شعبہ کے قیام کے لیے کوشاں ہوگئے۔ جسکے پیش نظر رائل کمیشن برائے زراعت نے کمرشیل فصل کے مسائل کے حل اور اسکی پیداوار میں اضافہ کے اقدامات کی تجویز کے لئے 1869 میں ہندوستان میں ایک سروے منعقد کیا۔ ہر صوبہ میں ایک علیحدہ زرعی شعبہ قائم کیا گیا تاہم یہ زرعی شعبے برطانیہ کی ضروریات کو پورا کرتے اور تجارتی فصل کے فروغ میں معاون ہوتے۔ برطانیہ کے حکام کپاس کی کاشت پر خصوصی توجہ دیتے چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے یہ ایک نہایت اہم فصل تھی۔ 1788 کے ابتدا میں ایسٹ کمپنی کے ڈائیریکٹرس نے بھی اس پیداوار کی حوصلہ افزائی پر زور دیا۔ حکومت نے بارہ امریکی ماہرین نباتات کو مقامی کاشت کاروں کو کپاس اگانے اور اس کی صفائی کی تربیت کیلئے روانہ کیا۔ ان تمام اقدامات کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ برطانوی ٹیکسٹائیلس کو بہترین کوالٹی کا کپاس فراہم کیا جائے۔ بتدریج ہندوستان میں کپاس کی کاشت اور اس کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ نیل۔ چائے اور کافی کی کاشت کاری کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی کیونکہ ان اشیا کی خوب مانگ تھی۔ جوٹ ایک اور کمرشیل فصل تھی جس پر برطانوی آقاؤں کی نظر گئی کیونکہ جوٹ کی اشیا کیلئے امریکہ اور یوروپ میں کافی بڑی بازار تھی۔ برطانیہ ان زرعی اشیا کی پیداوار پر خوب توجہ دی کیونکہ انہیں اپنی صنعتوں کو چلانا تھا اور اس کے ذریعہ زبردست منافع بھی ہو رہا تھا۔

ہندوستان میں زرعی شعبہ کی اقتصادیت نے برطانوی کاشت کاروں، ساہوکاروں اور دیگر تاجرین کو فائدہ پہنچایا۔ اس کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ دیگر تغذیہ سے منسلک فصلوں کی کاشت کم ہوگئی۔ اقتصادی مفادات کو آگے بڑھایا گیا۔ مثال کے طور پر 1892 تا 1893 اور 1919 تا

1920 تغذیاتی فصلوں کی کاشت کا علاقہ صرف سات فیصد تھا جبکہ اقتصادی فصلیں 43 فیصد علاقہ پر پھیلی ہوئی تھیں ۔ سال 1934 تا 1935 اور 1939 تا 1940 اقتصادی فصلوں کی کاشت کا علاقہ 1.6 ملین ایکڑ تک پھیل گیا اور تغذیاتی فصلوں کا علاقہ 1.5 ملین ایکڑ تک سکڑ گیا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت اقتصادی فصلوں کی بے دریغ پیداوار کی گئی اور انہیں برآمد کیا گیا۔ کپاس کی برآمدات میں سال 1900-1901 اور 1901 کے درمیان میں 1,78,000 ٹن سے سال 1936-37 میں 7,62,133 ٹن کا اضافہ ہوا جو کہ 328 فیصد کا اضافہ تھا۔ چائے کی برآمدات میں سال 1900-1901 میں 190 ملین پائونڈ سے لے کر سال 1939-40 میں 359 ملین پائونڈ کا اضافہ ہوا۔ اس کے نتیجہ میں ہندوستان کی عوام کو تغذیہ کی کمی کا سامنا کرنا پڑا جبکہ آبادی میں اضافہ ہوا۔ جس کے بعد اراضیات کا بٹوارہ ہوا جو کہ کسی طرح کی ٹکنالوجی کے بغیر ہوا۔

11.6.1 دیہی مقروضیت (Rural Indebtedness)

برطانوی حکمرانوں نے نئی ریونیو پالیسیاں بنائی اور اراضی کی تقسیم کی جس کی وجہ سے زرعی شعبہ پر دبائو میں اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ حکومت اور کسانوں کے مابین درمیانی افراد کا بھی اضافہ ہوا۔ جس کے نتیجہ میں زرعی شعبہ سے وابستہ افراد کی غربت میں اضافہ ہوا کیونکہ ان کی کافی دولت خرچ ہو جاتی۔ اس طرح دیہی مقروضیت میں اضافہ ہوا اور کسان قرضوں کے جال میں پھنستے چلے گئے۔ یہ صورتحال 1870 میں آبادی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ مزید خراب ہوتی چلی گئی۔ دوسری جانب پیسہ بازار میں مشغول ہو گیا اور کسان قرضوں کے بحران سے نکل نہیں سکے۔ اس کے علاوہ برطانوی حکومت کی پالیسیاں کسان مخالف ہی تھیں اور دیہی کاشت کاروں کے بارے میں اس کا نظریہ منفی ہی تھا۔ بڑھتی ہوئی آبادی، ناقص زرعی سہولتیں اور قدیم زرعی طریقے دیہی مقروضیت کے اضافہ کی اہم وجوہات تھیں ۔ ان تمام حالات نے زرعی پیداوار میں کمی کر دی اور اخراجات میں اضافہ ہوا۔ اور یہی دیہی مقروضیت کی وجوہات ثابت ہوئیں۔

11.6.2 زرعی مزدوروں میں اضافہ (Increase in Agricultural Labour)

برطانوی پالیسیوں کی وجہ سے زرعی مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ برطانوی حکومت کی زمین داری، مہالواری اور رعیت واری ریونیو پالیسیوں کا مقصد کسانوں سے زیادہ سے زیادہ زر کمانا تھا اور یہ نئے قوانین کسانوں کی پٹہ داری حقوق کی ضمانت نہیں دیتے تھے۔ کاشت کاروں کی آمدنی میں کمی، قرض کی وجہ سے زمینات کو چھوڑ دینا اور زمینات سے بے دخلی کی وجہ سے پٹہ داری حقوق کا خاتمہ ہوتا گیا اور یہ تمام عوامل زرعی مزدوروں کی تعداد میں اضافہ کا سبب بنے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کو غیر زرعی سیکٹر میں شامل نہیں کیا جا سکا۔ 1833 سے برطانوی پالیسی برائے شرح قیمت برائے تجارت نے زراعت کی اقتصادیت کی حوصلہ افزائی کی اور جس نے دستی مصنوعات کو نقصان پہنچایا۔ دستی صنعت بھی برطانوی اشیا کی درآمدات کی وجہ سے شدید نقصان سے دوچار ہوئی۔ ہندوستانی دستی صنعت کی اشیا برطانوی صنعتوں میں تیار اشیا سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں اور جس کے نتیجہ میں ایک غیر مساوی مقابلہ شروع ہوا۔ جبکہ 1833 سے برطانوی قیمتوں کی شرح پالیسی نے دیہی دستی صنعت کو تباہ کر دیا۔ ہندوستان میں صنعتی ترقی سے متعلق برطانوی لاپرواہی نے مقامی عوام میں غربت میں اضافہ کیا اور گزر بسر کیلئے کوئی ذریعہ نہیں بچ سکا۔ عوام کی ایک بڑی تعداد جو زمینات سے محروم ہو گئی تھی زرعی مزدوری کو اپنانے پر مجبور ہوئی۔

11.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

سامراجی دور میں زرعی شعب کو شدید نقصانات کا سامنا تھا۔ برطانوی اراضی محصولاتی قانون اور زرعی پالیسیاں زیادہ تر برطانوی صنعتوں کیلئے خام مال فراہم کرنے اور ان کے مفادات کی حوصلہ افزائی کرتیں جبکہ ہندوستان محض برطانوی اشیا کی کنزیومر بازار بن کر رہ گیا تھا۔ جدید ٹکنالوجی کی عدم موجودگی اور اختراعی طریقوں کی کمی سے زرعی شعبہ انحطاط کا شکار تھا۔ محکمہ مال کاشت کاروں سے زیادہ سے زیادہ مال بٹورنے کیلئے ہی استعمال کیا گیا اور کاشت کاروں کے پاس کوئی دولت نہیں بچ پاتی۔ برطانوی زرعی پالیسیوں نے دیہی معیشت کو بچانے کی نہیں بلکہ برطانوی معاشی مفادات کے حق میں کام کیا۔ کنڑاکٹس کا قرار پانا' کسانوں اور درمیانی افراد کے درمیان تنازعات کا حل' اراضی محصولات اور تمام برطانوی حکومت کے نئے قوانین کے تحت آگئے۔ یہ تمام مال داری قوانین نئے طریقوں اور اصولوں پر چلنے لگے۔ آخر کار ہندوستان میں زرعی شعبہ زبردست تباہی سے دوچار ہوا اور دستی صنعت 'دیگر مقامی صنعتوں کو بھی نقصان ہوا اور یہ سلسلہ 1947 میں انگریزں کے راج کے اختتام تک چلتا رہا۔

11.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

زراعت کی تجارت کاری : نقد فصلیں اگانا جو بازار کے لیے اگائی جاتی ہیں جیسے نیل، کپاس، گنا وغیرہ

11.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

11.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مستقل نوآبادیات کی اہم خصوصیات بتایے۔
2. برطانوی ہندوستان میں رعیت واری اور مستقل نوآبادیات کا تقابل کیجیے۔
3. محل واری نظام کیا ہے؟ اور بتایے یہ مستقل نوآبادیات سے کس طرح مختلف تھا؟
4. ہندوستان میں زرعی سیکٹر پر برطانوی زمینی محصولی نظاموں کے اثرات بیان کیجیے۔
5. زرعی اور شجر کاری معیشت کے تجارتی کرن پر نوٹ لکھیے۔
6. زرعی مزدوری کے فروغ کی وضاحت کیجیے۔
7. کس کمیشن نے ہندوستان میں تجارتی فصلوں کی اصلاح کے اقدامات تجویز کیے۔
8. (الف) رائل کمیشن (ب) ہسٹنگز کمیشن (ج) انڈین کمیشن (د) بوسٹن کمیشن
9. آزاد تجارت کی برطانوی پالیسی کب شروع ہوئی؟
10. کس پریسیڈنسی میں تھامس منرو نے رعیت واری نظام متعارف کروایا؟

11.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. دولت کی نکاسی کے نتائج پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. وہ زرعی اشیا ہیں جنہوں نے یورپی بازار میں برطانوی تجارتی منافع میں اضافہ کیا۔
3. ہندوستان میں زرعی نظام کا تجارتی کرن نوآبادیاتی دور میں کے لیے ہوا۔
4. دولت کی نکاسی کے بارے میں مورخین کے خیالات بیان کیجیے۔
5. جدید صنعتوں کے ارتقا پر ایک نوٹ لکھیے۔

11.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. کب، کہاں اور کس نے رعیت واری اراضی ریونیو قانون متعارف کروایا گیا؟
2. برطانوی حکومت نے کن علاقوں میں مہالواری نظام رائج کیا تھا؟
3. زرعی معیشت اور زراعت کی تجارت کاری پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

11.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Chandra, Bipan, *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India*. Anamika Publishers & Distributors Pvt., Ltd., 2016.
2. Kumar, Dharma, and Desai, Meghnad. (eds.) *The Cambridge Economic History of India,* Volume II: *c*.1757-2003, Orient Longman Private, Limited, Hyderabad 2005.
3. Tharoor, Shashi, *An Era of Darkness*: *The British Empire in India*. Aleph, 2016.
4. Robb, Peter, *A History of India*. Cambridge University Press, 2011.
5. Roy, Tirthankar, *Traditional Industry in the Economy of Colonial India*. Cambridge University Press, 1999.

اکائی 12۔ جدید تعلیم کا آغاز

(Rise and Growth of Modern Education)

اکائی کے اجزا

12.0	تمہید
12.1	مقاصد
12.2	ہندوستان میں تعلیم
12.3	حکومت کا کردار
12.4	انا جیل پرست اور مستشرقین کا قضیہ
12.5	ووڈس ڈسپیچ
12.6	ہنٹر کمیشن
12.7	ریلے کمیشن
12.8	سیڈلر کمیشن
12.9	ہارتوگ کمیشن
12.10	وارد ھا اسکیم
12.11	سرجینٹ یوجنا
12.12	رادھا کرشنن کمیشن
12.13	اکتسابی نتائج
12.14	کلیدی الفاظ
12.15	نمونہ امتحانی سوالات
12.15.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
12.15.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
12.15.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
12.16	مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

12.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان میں جدید تعلیم بالخصوص انگریزی تعلیم کا آغاز برطانوی سرکار کی رہین منت ہے۔ اس کی ترویج واشاعت میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے ملازمین نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ابتدا سے ہی جدید تعلیم کی مخالفت بھی شروع ہوگئی تھی لیکن راجہ رام موہن رائے اور سرسید احمد خان جیسے روشن خیال مصلحین نے اس کی پرزور حمایت کی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کی ترقی کا دارومدار جدید اور سائنسی علوم کے حصول پر ہے۔ انگریزی تعلیم حاصل کیے بغیر کوئی بھی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ جدید تعلیم کی اشاعت کے لیے حکومت نے بھی ایک سازگار ماحول تیار کیا اور لوگوں کو اس کے فوائد سے روشناس کرایا۔

12.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستان میں جدید تعلیم بالخصوص انگریزی تعلیم کے آغاز اور اس کے اغراض ومقاصد کے بارے میں واقفیت
- جدید تعلیم کی ابتدا اور اس سے متعلق مسائل کے بارے میں جانکاری
- جدید سائنسی علوم کے فروغ کے بارے میں حکومت کے نظریہ اور کارکردگی سے متعلق معلومات
- جدید تعلیم سے متعلق کمپنی کے حکام کے درمیان اختلاف رائے کی واقفیت
- حکومت کی اہم پالیسیوں اور ان کے نتائج کے بارے میں معلومات
- جدید تعلیم کے آغاز کے بعد ہندوستانی سیاست میں تبدیلیوں کے متعلق واقفیت

12.2 ہندوستان میں تعلیم (Education in India)

ہندوستان میں علمی سرگرمیاں زمانہ قدیم سے جاری رہی ہیں۔ ریاضی، علم نجوم، فلکیات، قواعد، قانون، فلسفہ اور طب وغیرہ علوم عہد عتیق سے رائج ہیں۔ عہد وسطیٰ میں بھی یہ علوم رائج تھے اور ان کو حکومت کی سرپرستی حاصل رہی۔ لیکن علمی مشاغل ایک خاص طبقہ تک ہی محدود تھے۔ عوام اس سے محروم تھے۔ تجرباتی اور سائنسی علوم قدرے محدود تھے۔ چوں کہ سنسکرت اعلا طبقہ کی زبان تھی اور علمی سرمایہ اسی زبان میں تھا اس لیے عوام کا ایک بڑا طبقہ علوم وفنون سے محروم تھا۔ ہندوئوں میں علم کی ترویج واشاعت کے لیے پاٹھ شالا ہوا کرتے تھے جو زیادہ تر مندروں سے منسلک ہوتے تھے۔ مسلمانوں میں ابتدائی تعلیم کا ذریعہ مکتب اور مدرسے ہوتے تھے جو مساجد سے منسلک ہوتے تھے۔ ذریعہ تعلیم فارسی اور عربی ہوا کرتی تھی۔ جدید تعلیم جیسے تصورات ان کے پیش نظر نہیں تھے۔

ہندوستان میں علم وہنر روایتی انداز کا تھا۔ اٹھارہویں صدی کا ہندوستان تعلیم کے لحاظ سے غیر ترقی یافتہ تھا۔ سیاسی انتشار، اقتصادی بدحالی، دانش ورانہ استعداد کی کمیوں نے اس شعبے کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ برطانوی حکومت کے قیام کے بعد جدید تعلیم کا آغاز ہوا۔ حکومت،

عیسائی مشنریوں اور ملک کے روشن خیال لوگوں نے مغربی تعلیم کی اشاعت میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ابتدائی ایام میں عیسائی مشنریوں نے اسکول قائم کر کے لوگوں کو حصول تعلیم کے لیے راغب کیا۔ یورپی تجارتی کمپنیاں ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئی تھیں۔ ان کے ساتھ عیسائی مشنریاں بھی آئیں جن کا مقصد عیسائی مذہب کی تبلیغ تھی۔ انھوں نے ملک میں مغربی تعلیم کو رائج کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس سلسلے میں سیرام پور مشنری کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے بنگال میں اسکول قائم کیے۔ مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انھوں نے عورتوں کی تعلیم پر بھی زور دیا۔ بنگال کے علاوہ عیسائی مشنریاں مدراس اور بمبئی میں بھی سرگرم تھیں۔ ان مشنریوں نے علاقائی زبانوں کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے بائبل کا علاقائی زبانوں میں ترجمہ کیا جس کی وجہ سے عیسائیت کے فروغ میں بہت مدد ملی۔ انھوں نے روشن خیال ہندوستانیوں کی حوصلہ افزائی کی تاکہ وہ مذہبی، سماجی اور اصلاحی تحریکوں کے ذریعہ معاشرے میں اصلاح کر سکیں۔ اصلاحی تحریکوں سے جدید مغربی تعلیم کی ترویج واشاعت میں بہت مدد ملی۔

12.3 حکومت کا کردار (Role of the Government)

چارٹر ایکٹ (1813) کے نفاذ سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین نے ذاتی دل چسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ تعلیمی اداروں کا آغاز کیا۔ وارن ہسٹنگز نے 1781 میں مسلم قانون اور عربی اور فارسی کے مطالعہ اور تدریس کے لیے کلکتہ مدرسہ قائم کیا۔ جوناتھن ڈنکن نے 1791 میں ہندو قانون اور فلسفہ کے مطالعہ کے لیے بنارس میں سنسکرت کالج قائم کیا۔ دونوں اداروں کا قیام اس مقصد سے کیا گیا تھا کہ ان سے کمپنی کی عدالتوں کو محکمہ انصاف کے لیے باقاعدہ طور پر لائق وفائق ہندوستانی مل سکیں۔ ولیم جونس نے 1784 میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی تاکہ ایشیا کی تہذیب وتمدن، سائنسی علوم، ادب وفلسفہ اور تاریخ وسیاسیات پر تحقیق کی جاسکے۔ لارڈ ولزلی نے 1800 میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ اس کے قیام کا مقصد انگریز سول سرونٹس کو تربیت دینی تھی۔ فورٹ ولیم کالج اور اس کالج کے پرنسپل جان گلکرسٹ نے ہندوستانی ادب بالخصوص ہندی اور اردو کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ قیام کے دوسرے سال یہ کالج بند ہو گیا۔ برطانوی سامراج کی توسیع پسندانہ پالیسی کی وجہ سے انتظامی امور کے لیے اسے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بڑی تعداد کی ضرورت تھی۔ اس لیے کمپنی اس طرح کی تعلیم عام کرنا چاہتی تھی جس سے اس کو اپنے مقصد کی حصول یابی کے لیے تعلیم یافتہ افراد مل سکیں۔

برطانوی حکومت نے 1813 کے چارٹر ایکٹ کے ذریعہ کمپنی کی حکومت کو تعلیمی مصارف کے لیے ایک لاکھ روپے مختص کیے۔ بدقسمتی سے ایسٹ انڈیا کمپنی 1823ء تک یہ رقم خرچ نہیں کر سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے خرچ کرنے کے لیے حکومت کے پاس کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ 17 جولائی 1823 کو گورنر جنرل ان کونسل نے ایک کمیٹی ''جنرل کمیٹی آن پبلک انسٹرکشن'' قائم کی۔ ایچ۔ ٹی پرنسپ اور ایچ۔ ایچ ولسن اس کے ممبر نامزد کیے گئے۔

12.4 اناجیل پرست اور مستشرقین کا قضیہ (Anglicanists and the Orientalists)

1813ء کے چارٹر ایکٹ میں تعلیمی مصارف کے لیے ایک لاکھ روپے کی رقم طے کی گئی لیکن کسی ٹھوس منصوبے کی کمی کی وجہ سے

یہ رقم خرچ نہ کی جا سکی۔ذریعہ تعلیم کے معاملے میں کمیٹی کے ارکان دو گروپ میں منقسم ہو گئے۔ایک گروپ اس رقم کو مشرقی علوم پر خرچ کرنے کا حامی تھا۔ یہ گروپ مستشرق (Orientalists) کہلایا۔ اس میں نمایاں نام پرنسپ اور ولسن کا تھا۔ دوسرا گروپ (Anglicists) تھا جو انگریزی اور مغربی تعلیم کا حمایتی تھا۔1833 کے چارٹر ایکٹ نے تعلیم کے فروغ کے لیے 10 لاکھ روپے سالانہ کی رقم مختص کی۔اس کی وجہ سے مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو گیا کیوں کہ دونوں گروپ رقم کو اپنے لحاظ سے خرچ کرنا چاہتے تھے۔اس تنازعے کی وجہ سے تعلیمی سرگرمیوں کو نقصان پہنچا۔

اس تنازعہ کے حل کے لیے حکومت نے بالآخر 1835ء میں لارڈ میکالے کو جنرل کمیٹی کا صدر مقرر کیا۔ میکالے گورنر جنرل کی ایگزیکیوٹو کونسل کا رکن تھا۔ وہ ایک ماہر قانون کے علاوہ بااثر شخص بھی تھا۔اس کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا۔اس نے باہم گفت وشنید کے بعد 2 فروری 1835 کو ایک رپورٹ شائع کی جو میکالے منٹ (Minute of Mecauley) کے نام سے مشہور ہے۔ میکالے نے انگریزی تعلیم کی حمایت کی۔ مستشرقین نے اس کی مخالفت کی۔اس کی خوش قسمتی سے اس وقت کا گورنر جنرل ولیم بنٹنک بھی انگریزی تعلیم کا حامی تھا۔ لہٰذا اس نے 7 مارچ 1835 کو انگریزی تعلیم کی حمایت میں ایک ریزولوشن پاس کر دیا۔اس کی رو سے پورے ملک میں انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا۔اس ریزولوشن کا مقصد ہندوستانیوں کو مغربی زبان اور جدید سائنسی علوم سے روشناس کرانا تھا اور حکومت کی طرف سے طے کی گئی رقم کو انگریزی تعلیم کی ترقی اور اس کی ترویج واشاعت پر خرچ کرنا تھا۔

یہ ریزولوشن ہندوستان کی تاریخ میں بہت ہی اہمیت کا حامل تھا۔اس کی بدولت ہندوستان میں انگریزی اور جدید سائنسی علوم کا فروغ ممکن ہو سکا۔ یہ تعلیمی پالیسی کا پہلا ریزولوشن تھا جس کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہندوستان میں نافذ کرنا چاہتی تھی۔اس ریزولوشن کی وجہ سے مشرقی علوم پر خرچ کی جانے والی رقم روک دی گئی اس طرح مشرقی علوم کے مراکز کو سرکاری امداد بند ہو گئی۔اس ریزولوشن کی وجہ سے ہندوستان میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم تسلیم کر لیا گیا۔ 1837 میں فارسی کو سرکاری زبان کے حاصل درجہ سے محروم کر دیا گیا۔ عدالتوں میں فارسی کی جگہ انگریزی زبان نے لے لی۔1844ء میں لارڈ ہارڈنگ نے ایک دوسرا ریزولوشن پاس کر کے سرکاری ملازمت کی اہلیت کے لیے انگریزی زبان کی استعداد کو لازمی قرار دیا۔اس سے ہندوستان کا ایک بڑا فارسی داں طبقہ سرکاری ملازمتوں سے محروم ہو گیا۔اس طرح انگریزی تعلیم اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے سلسلے میں پیش رفت ہوئی۔

انگریزی تعلیم کی ترقی اور فروغ کے معاملے میں انگریزوں کی اس کوشش میں ان کی خود غرضی شامل تھی۔ان کو انتظامی امور کی دیکھ ریکھ کے لیے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک نسل درکار تھی۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کے ذریعہ وہ اپنے مذہبی عقائد کی تبلیغ اور اشاعت کرنا چاہتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ عیسائیت کو آسانی سے قبول کر سکے گا۔ وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ جدید تعلیم کے فروغ سے ملک میں روشن خیال طبقہ پیدا ہو سکے گا اور یہ طبقہ برطانوی حکومت کا معاون و مددگار ثابت ہو گا۔اس طرح ہندوستان میں انگریزی حکومت کو استحکام حاصل ہو گا۔انگریزی تعلیم کو فروغ دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انگریز حکمراں طبقہ نسل پرستی کا شکار تھا۔اس کے نزدیک مشرقی علوم کے مقابلے میں مغربی علوم ترقی پسندی اور روشن خیالی کے ضامن تھے۔ میکالے کا خیال تھا کہ ہندوستانی زبان وادب اور عربی زبان وادب کے مقابلے میں

انگریزی بہت جامع اور ترقی پذیر تھی۔ میکالے ہندوستان میں ایک ایسی نسل کو فروغ دینا چاہتا تھا جو ''رنگ اور خون کے اعتبار سے ہندوستانی ہو لیکن خیالات، اخلاقیات اور دانش ورانہ طرز زندگی کے لحاظ سے انگریز ہو۔'' یہ طبقہ انگریزی حکومت کو پائدار بنانے اور مستحکم کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہو۔ اس کا یہ خیال تاریخی اعتبار سے صحیح ثابت ہوا۔ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات انگریزی تہذیب و تمدن کے دلدادہ بھی ہوئے، انگریزی تہذیب کو اپنا شعار زندگی بھی بنایا اور انگریزوں کا وفادار بھی رہا۔

میکالے منٹ اور ولیم بنٹنک کے ریزولوشن کی ایک خامی یہ تھی کہ اس میں عوامی تعلیم کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ میکالے منٹ ''فلٹریشن تھیوری'' پر قائم تھا۔ اس کے مطابق سرکار کی ذمہ داری اعلا طبقہ کے کچھ افراد کو تعلیم مہیا کرنا تھا اور پھر لوگوں میں سائنسی علوم اور انگریزی تعلیم عام کرنے کی ذمہ داری اس تعلیم یافتہ طبقے کی تھی۔ بدقسمتی سے تعلیم یافتہ طبقہ اپنی ذمہ داری نبھانے میں ناکام رہا۔ اس طرح یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔ اس کی ایک خامی یہ بھی تھی کہ علاقائی زبانوں کی تعلیم کو نظرانداز کیا گیا۔

12.5 ووڈس ڈسپیچ (Wood's Dispatch, 1854)

1833 کے چارٹر ایکٹ میں تعلیمی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے دس لاکھ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی۔ اس کے باوجود علمی میدان میں 1853ء تک خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی تھی۔ کچھ اسکول اور کالجوں کا قیام ضرور عمل میں آیا۔ افادیت پسند (Ultitarain) افراد کے زیر اثر حکمراں طبقہ کو اب احساس ہوا کہ تعلیم کی ذمہ داری سرکار کی ہے اور اس کو انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ علاقائی علوم و فنون کو بھی فروغ دینے کا پابند عہد ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی عوام کی تعلیمی ذمہ داری سے دستبردار ہونا ناانصافی کے مترادف ہے۔

شمالی مغربی صوبوں میں تھامسن نامی انگریز نے علاقائی زبانوں میں اسکول قائم کرکے ایک کامیاب تجربہ کیا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی نے اس ماڈل کو بنگال اور بہار میں متعارف کرایا تھا اور یہ کامیاب تجربہ تھا۔ ووڈس ڈسپیچ دراصل Downward Filtration کے برخلاف علاقائی زبانوں کے ذریعہ تعلیم دینے کی حکمت عملی کی حمایت کرتا تھا۔ اس پالیسی کو لارڈ ڈلہوزی کی مکمل حمایت حاصل تھی کیوں کہ اس نے عوام کی ابتدائی تعلیم کی حمایت کی تھی۔

بورڈ آف کنٹرول کے صدر چارلس ووڈ کی رہ نمائی میں 19 جولائی 1854 کو یہ ڈسپیچ تیار ہوا۔ اس کے رہ نما اصولوں میں یہ بتایا گیا تھا کہ اس کا مقصد ہندوستان میں مغربی علوم، آرٹس، سائنس، فلسفہ اور ادب کو فروغ دینا ہے۔ اس کو برطانوی تعلیمی پالیسی کا سب سے اہم دستاویز مانا جاتا ہے اس کی بدولت ہندوستان میں جدید مغربی سائنسی علوم کی ابتدا ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس ڈسپیچ کو ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا ''میگنا کارٹا'' کہا جاتا ہے۔ شیکھر بندوپادھیائے کا خیال ہے کہ ''بہتر انتظامی دیکھ ریکھ کے لیے اعلا تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی ضرورت کے پیش نظر ایک محدود طبقہ کو تعلیم مہیا کرانے کے ساتھ عوام الناس کو بھی تعلیم یافتہ بنانا ضروری تھا تاکہ تعلیم یافتہ کارکنوں میں ملکی وسائل کو استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے اور ان میں برطانوی اشیا کو خریدنے اور استعمال کرنے کا شوق پیدا ہو جس سے ہندوستانی بازار پر قبضہ ممکن

ہو سکے۔اس لیے ابتدائی تعلیم پر زور دیا گیا اور اعلا تعلیم کی ترقی کے لیے تینوں پریزیڈنسیوں میں لندن یونیورسٹی کے طرز پر یونیورسٹیاں قائم کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔

انتظامی امور کی دیکھ ریکھ کے لیے اعلا تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی ضرورت کے پیش نظر ایک محدود طبقہ کو تعلیم یافتہ بنانے کے ساتھ ساتھ عوام الناس کو بھی تعلیم سے روشناس کرانا اشد ضروری تھا۔ برطانوی سامراجیت کی بقا کے لیے ضروری تھا کہ تعلیم یافتہ معاون عملے موجود ہوں جس کی بدولت ملک کے وسائل کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جا سکے اور ہندوستان ایک بڑی تجارتی منڈی میں تبدیل ہو جائے۔

چارلس ووڈ کی سفارشات مندرجہ ذیل تھیں:

1. سرکار مغربی تعلیم کو عام کرے۔
2. اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے اس کے ساتھ ہی مغربی تعلیم کو علاقائی زبانوں کے ذریعہ عوام تک پہنچایا جائے۔
3. گاؤں کی سطح پر علاقائی زبانوں کے پرائمری اسکول کھولے جائیں اور ضلعی سطح پر ہائی اسکول اور کالج قائم کیے جائیں۔
4. گرانٹ ان ایڈ کے ذریعہ نجی اداروں کی حوصلہ افزائی ہو اور تعلیمی میدان میں زیادہ ترقی ہو۔
5. صوبوں میں تعلیمی سرگرمیوں کی دیکھ بھال کے لیے پبلک انسٹرکشن ڈپارٹمنٹ قائم کیے جائیں۔
6. تکنیکی تعلیم کے ادارے قائم کیے جائیں۔
7. اساتذہ کی ٹریننگ کے لیے ٹیچرس ٹریننگ سینٹر قائم کیے جائیں۔
8. تعلیمی نسواں کے فروغ کے لیے تعلیمی ادارے کھولے جائیں۔
9. لندن یونیورسٹی کے طرز پر ہندوستان میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کی جائیں۔

اس ڈسپیچ کی تمام سفارشات منظور کر لی گئیں۔1855 میں ڈپارٹمنٹ آف پبلک انسٹرکشن قائم کیا گیا۔1857ء میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔بیتھون کی کوششوں سے لڑکیوں کے اسکول قائم کیے گئے۔پوسا بہار میں ایگریکلچر انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا۔روڑکی سہارنپور میں انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا۔ووڈ ڈسپیچ کی سفارشات کے زیر اثر ہندوستان کا تعلیمی نظام تقریباً پانچ عشروں تک چلتا رہا۔

12.6 ہنٹر کمیشن (The Hunter Commission)

ووڈس ڈسپیچ ایک بہت ہی جامع دستاویز تھا۔ اس کی سفارشات کو ہندوستان میں تعلیمی سرگرمیوں کا ایجنڈا تصور کیا جاتا ہے۔1882 میں لارڈ رپن نے 1854 کے ووڈ ڈسپیچ کے اصولوں کو عمل درآمد کیے جانے کی جانچ کے سلسلے میں اور اس میں متعین کی گئی پالیسی پر زور رد ینے کے لیے اور اہم مشورے دینے کے لیے ایک کمیشن بحال کیا جو ہنٹر کمیشن کے نام سے مشہور ہے۔ہنٹر کمیشن نے بہت سی کارآمد اطلاعات کو اکٹھا کر کے اپنی سفارشات پیش کیں۔

ہنٹر کمیشن کی سفارشات:

ہنٹر کمیشن کے ممبروں کی مجموعی تعداد بیس تھی جس میں آٹھ ہندوستانی تھے۔اس کمیشن کی زیادہ تر سفارشات پرائمری اور سیکنڈری ایجوکیشن تک محدود تھیں۔اس کمیشن کی سفارشات مندرجہ ذیل تھیں:

1. پرائمری تعلیم کو علاقائی زبانوں میں زیادہ سے زیادہ فوقیت دینا۔پرائمری تعلیم کی ذمہ داری ضلعی اور مقامی بورڈ کو دی گئی۔پرائمری تعلیم کو عام کرنے کی ذمہ داری سرکار کی تھی۔
2. یونیورسٹیاں جو اعلا تعلیم کی مراکز تھیں پر سرکاری کنٹرول کم کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔
3. اعلا تعلیم کی ترقی کے لیے یونیورسیٹیوں کی خود مختاری کو ضروری سمجھا گیا۔یونیورسیٹیاں نصاب تعلیم تیار کرنے کے لیے خود مختار تھیں۔
4. ثانوی سطح تک ادبی تعلیم کے ساتھ ساتھ پیشہ ورانہ تعلیم دینا ضروری تھا۔
5. اسکولوں اور کالجوں میں لائبریری اور فرنیچر کے معقول انتظام پر زور دیا گیا تاکہ طلباء اپنی علمی صلاحیتوں کو بہتر طریقے سے بروئے کار لا سکیں۔
6. تعلیم نسواں پر مزید سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت پر زور دیا گیا کیوں کہ ووڈ ڈسپیچ کے زیر اثر تعلیم نسواں کے معاملے میں خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔

ان سفارشات کے تحت مزید دو یونیورسیٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔1882 میں پنجاب یونیورسٹی اور 1887 میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے قیام کو اعلا تعلیمی سرگرمیوں کی سمت میں اہم پیش رفت مانا جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں بالخصوص یونیورسیٹیوں نے ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔جدید اور مغربی تعلیم کی وجہ سے ملک میں قومیت کے جذبے کے فروغ میں بہت مدد ملی۔ نیشنلزم کے بڑھتے رجحان سے برطانوی حکومت اور برطانوی سامراجیت کو خطرہ محسوس ہونے لگا۔یہی وجہ ہے کہ لارڈ کرزن یونیورسیٹیوں پر مکمل کنٹرول چاہتا تھا جو اس وقت قومیت کے جذبے کو فروغ دینے کا مرکز بنتی جا رہی تھیں۔

12.7 ریلے کمیشن (The Raleigh Commission)

ریلے وائسرائے کی مجلس عاملہ کا رکن تھا۔اس کی صدارت میں 1902 میں ایک کمیشن قائم کیا گیا جو ریلے کمیشن کے نام سے مشہور ہے۔اس میں دو ہندوستانی ارکان سید حسین بلگرامی اور گرو داس بنرجی کو بھی نامزد کیا گیا۔اس کمیشن کی سفارشات کی بنیاد پر 1904 کا یونیورسٹی ایکٹ پاس کیا گیا۔اس ایکٹ کی مندرجہ ذیل سفارشات تھیں۔

1. یونیورسٹی کے سینٹ ممبروں کی تعداد 50 سے کم اور 100 سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ارکان کے کام کرنے کی معیاد 6 سال ہونی چاہیے۔

2. سینٹ کے ارکان حکومت کے ذریعہ نامزد کیے جائیں۔
3. سینٹ کے کسی بھی فیصلے کو ویٹو کرنے کا اختیار حکومت کو ہوگا۔ حکومت کو ریگولوشن بنانے یا پھر سینٹ کے ذریعہ بنائے گئے ریگولوشن کو تبدیل کرنے کا حق ہوگا۔
4. کالجوں کو منظوری دینے یا نامنظور کرنے میں حکومت کی اجازت ضروری ہوگی۔ لکچرر اور پروفیسر کی تقرری میں بھی حکومت کی منظوری ضروری ہوگی۔
5. اس کمیشن کی سفارشات کی روسے یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویشن کورسز کی شروعات ہوگی۔امتحانات اور کلاسوں کے انعقاد کی ذمہ داری یونیورسٹی کی ہوگی۔

اس کمیشن نے یونیورسیٹیوں کو ایک لائحہ عمل پیش کیا۔ یونیورسیٹیوں کو ان پر عمل پیرا ہونا تھا۔اس ایکٹ نے یونیورسیٹیوں کو تعلیمی کردار پر توجہ مرکوز کرنے پر زور دیا۔ جس کے تحت درس وتدریس کے ساتھ تحقیق کی فضا تیار کرنی تھی۔ حکومت کی مداخلت اور یونیورسیٹیوں پر حکومت کے بڑھتے کنٹرول کا مقصد اعلا تعلیمی اداروں میں قومی جذبے کے فروغ کو ختم کرنا یا کم کرنا تھا۔اس طرح ہندوستانیوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی ترغیب ملی۔اس کمیشن کی سفارشات کی بدولت تعلیمی سرگرمیوں میں اضافہ تو ہوا مگر یہ اضافہ خاطر خواہ نہیں تھا کیوں کہ 1911 کی مردم شماری کے مطابق خواندگی کی شرح 6 فی صد تھی لہٰذا 1913 میں حکومت نے ایک ریزولوشن پاس کیا اور صوبائی حکومتوں سے کہا کہ وہ غریبوں اور پس ماندہ طبقات کے درمیان بغیر فیس لیے تعلیم کو عام کرنے پر زور دیں۔اس ریزولوشن نے اعلا معیاری اسکولوں اور یونیورسیٹیوں کے قیام پر زور دیا۔اس نے ہر صوبہ میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ بھی بنایا۔

12.8 سیڈلر کمیشن (The Saddler Commission)

لارڈ کرزن کے جانشینوں نے نظام تعلیم کے اصلاح کے معاملے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی۔ تعلیمی نظام میں بہت زیادہ پیچیدگیاں تھیں۔ یونیورسیٹیاں محض امتحانات منعقد کرانے کا ادارہ بن کر رہ گئی تھیں۔ان ہی مسائل پر غور کرنے کے لیے سیڈلر کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔اس کمیشن کو کلکتہ یونیورسٹی کمیشن بھی کہا جاتا ہے۔اس کمیشن نے کلکتہ یونیورسٹی سمیت دیگر تمام تعلیمی اداروں کی مفصل رپورٹ پیش کی۔ کمیشن نے یونیورسیٹیوں کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے صوبوں میں بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن قائم کرنے کی سفارش کی۔ سیکنڈری ایجوکیشن کو یونیورسٹی ایجوکیشن سے علاحدہ کر دیا گیا۔ یونیورسٹی میں داخلے کے طریقہ کار کو بہتر کیا گیا۔اب یونیورسیٹیوں میں داخلہ کی اہلیت میٹرک کے بجائے انٹر میڈیٹ رکھی گئی۔اس کمیشن نے انٹر میڈیٹ کالجوں میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے پر زور دیا۔ کلکتہ یونیورسٹی سے متعلق اس کمیشن کی سفارشات میں کل وقتی وائس چانسلر کی بحالی، پاس کورس اور آنرز کورس میں تفریق، ڈھاکہ میں رہائشی یونیورسٹی کے قیام اور تعلیم نسواں کے لیے ایک خصوصی بورڈ کی تشکیل کی باتیں شامل تھیں۔

کمیشن نے 1919ء میں تفصیلی رپورٹ تیار کی جس میں میٹرک کی تعلیم اور یونیورسٹی کے مسائل پر غور کرنے کے نکات شامل

تھے۔ سیڈلر کمیشن کی خاص سفارشات مندرجہ ذیل تھیں:

1. اسکول کا نصاب بارہ سال کے لیے ہوگا۔ میٹرک کے بعد انٹر میڈیٹ کا امتحان کالج سے پاس کرنے اور اسکول اور کالج کے لیے الگ الگ بورڈ قائم کرنے کی سفارش کی گئی۔
2. گریجویشن کی تعلیم کے لیے تین سال کی مدت طے کی گئی۔ آنرز اور پاس کورس کو دو مختلف زمروں میں رکھا گیا۔
3. خود مختار اداروں کی مزید حوصلہ افزائی کی گئی۔
4. مرکزی اقامتی یونیورسٹیوں کی سفارش کی گئی اور ان کو روزمرہ کے امور میں خود مختار بنایا گیا۔
5. تعلیم نسواں کی طرف خاص توجہ دینا طے کیا گیا اور اس مقصد کے لیے ایک بورڈ قائم کرنے کی تجویز کی گئی۔
6. کلکتہ یونیورسٹی کو مزید اختیارات دینے کی بات کی گئی۔
7. ڈھاکہ اور کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ تعلیم قائم کرنے کی سفارش کی گئی۔
8. تعلیم کی ترقی اور عوام الناس کو مزید تعلیمی سہولیات فراہم کرنے کے لیے مزید یونیورسٹیاں قائم کرنے کی بات کی گئی۔

سیڈلر کمیشن کی سفارشات کے پیش نظر مزید یونیورسٹیاں کھولی گئیں جن میں پٹنہ یونیورسٹی، میسور یونیورسٹی، بنارس یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونورسٹی، ڈھاکہ یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کمیشن کی سفارشات کے مد نظر کچھ اور یونیورسٹی مثلاً شانتی نکیتن کے قائم کرنے کی بات کی گئی۔

12.9 ہارتوگ کمیشن (The Hartog Commission)

1919ء کے بعد قومی تحریک کے زور پکڑنے کی وجہ سے تعلیمی اداروں کے قیام میں بہت اضافہ ہوا لیکن تعلیم کے معیار میں اضافہ کے بجائے گراوٹ ہی آئی۔ 1929ء میں ہارتوگ کمیشن کے قیام کا مقصد برطانوی ہندوستان میں تعلیم کے فروغ کا جائزہ لینا تھا۔ سر فلپ ہارتوگ کی صدارت میں موجودہ تعلیمی نظام کی ترقی اور اشاعت کے مختلف پہلوئوں پر غور و خوض کیا گیا۔ کمیشن نے سیکنڈری ایجوکیشن سے زیادہ پرائمری ایجوکیشن پر زور دیا۔ کمیشن نے دیہی باشندوں کو میٹرک تک تعلیم دینے کے بعد ان کو کمرشیل تعلیم مہیا کرانے کی سفارش کی۔ اس نے یونیورسیٹیوں کے تعلیمی نظام میں اصلاح پر زور دیا تاکہ ہونہار طالب علموں کو بہتر اور اعلا تعلیم کے مواقع فراہم ہوں۔

12.10 واردھا اسکیم (The Wardha Scheme)

واردھا کانفرنس کے انعقاد کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کا مقصد بنیادی تعلیم کا خاکہ تیار کرنا تھا۔ اس کا مقصد لوگوں کے درمیان بہترین شہری کے اوصاف پیدا کرنا تھا اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب پر زور دینا تھا۔ واردھا اسکیم کے تحت سات سے لے کر چودہ سال تک کے بچوں کے لیے مفت اور ضروری تعلیم کا انتظام کرنا تھا۔ ذریعہ تعلیم مادری زبان کو بنانے کی تجویز تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ طلباء کی شمولیت ہو سکے۔ طلباء کو ان کی دلچسپی اور رجحان کے مطابق کمرشیل ایجوکیشن دینے کی تجویز تھی۔ گرچہ

یہ بہت اچھی اسکیم تھی مگر اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا کیوں کہ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے کانگریس سرکار مستعفی ہو گئی تھی۔

12.11 سرجینٹ اسکیم (The Sergeant Scheme)

1944ء میں ہندوستان کے مشیر تعلیم سر جان سرجینٹ نے تعلیمی ترقی کے لیے ایک بہت ہی جامع اور اہم منصوبہ بنایا جو سرجنٹ منصوبہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے اپنی سفارشات میں پرائمری اور مڈل اسکول کی تعلیم کے لیے اسکول کھولنے کی تجویز پیش کی۔ اس منصوبے میں چھ سال سے لے کر چودہ سال کی عمر کے بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کی فراہمی پر زور دیا گیا۔ لیکن 1947 میں ملک کی آزادی کے بعد تعلیم کا ایک نیا نظام تیار کیا گیا۔

12.12 رادھا کرشنن کمیشن (The Radhakrishnan Commission)

1947 میں ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو گیا۔ آزادی کے بعد حکومت ہند نے آزاد ہندوستان کے لیے ایک نیا تعلیمی منصوبہ تیار کرنے کے لیے ماہر تعلیم رادھا کرشنن کی صدارت میں ایک کمیشن قائم کیا۔ آزاد ہندوستان کے تعلیمی منصوبہ کا بنیادی ڈھانچہ انگریزوں کے قائم کردہ منصوبہ پر اور سفارشات پر مبنی تھا۔ آزاد ہندوستان میں تعلیمی منصوبہ کو فروغ دیتے ہیں۔ رادھا کرشنن کمیشن کی سفارشات بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ سفارشات مندرجہ ذیل ہیں:

1. تعلیم کی ہندوستانی شناخت سے ہم آہنگی
2. قومی اور دیہی یونیورسٹی کا قیام
3. یونیورسٹی کی تعلیم سے پہلے 12 سالہ تعلیمی منصوبہ
4. ملک میں دانشورانہ فضا قائم کرنے کے لیے زراعت، سائنسی علوم، تعلیم، انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی، قانون، میڈیسن کی تعلیم فراہم کرنے کی ضرورت پر ضرور۔
5. یونیورسٹی نظام تعلیم میں 180 دن کی علمی سرگرمیوں کو لازمی قرار دیا گیا۔
6. یونیورسٹیز کی علمی فضا کو بہتر بنانے اور طلبہ میں علمی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے ٹیوٹوریل اور سیمنار کو لازمی کر دیا گیا۔
7. اساتذہ کی تنخواہ بڑھانے کے سفارش نامہ پر تعلیم اور اعلی صلاحیتوں حامل افراد کو یونیورسٹی کے تدریسی عمل میں شامل کیا جا سکے۔
8. یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قائم کرنے کی سفارش کی گئی جو یونیورسٹی کے مالی منصوبے میں باقاعدگی لائے۔

12.13 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ہندوستان میں تعلیمی سرگرمیاں یوں تو زمانہ قدیم سے جاری تھیں مگر اٹھارہویں صدی تک کا ہندوستان کئی لحاظ سے غیر ترقی یافتہ تھا۔ ہندوستان میں جدید تعلیم کا آغاز برطانوی حکومت کے قیام کے بعد ہوا۔ حکومت کی کوششوں کے علاوہ عیسائی مشنریوں اور ملک کے روشن

خیال لوگوں نے جدید تعلیم کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ آغاز میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین نے کچھ خاص مقاصد کے حصول کے لیے ہندوستانی علوم کے کچھ ادارے قائم کیے جن میں کلکتہ مدرسہ، بنارس کا سنسکرت کالج، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی اور فورٹ ولیم کالج وغیرہ اہم ہیں ۔شروع میں تعلیمی مصارف کے لیے قلیل رقم مختص کی گئی مگر تعلیم کی نوعیت اور ذریعہ تعلیم کے مسئلے پر افسران کے درمیان اختلاف رائے کی وجہ سے اس رقم کا بھی استعمال نہ کیا جاسکا۔ میکالے منٹ کی اشاعت کے بعد جدید سائنسی علوم کا فروغ ممکن ہو سکا۔ اس کے بعد چارلس ووڈ کا ڈسپیچ تعلیم کے فروغ کے معاملے میں اہم قدم تھا۔ ہندوستان میں تعلیم کے مزید فروغ کے لیے کئی کمیشن قائم کیے گئے جس میں ہنٹر کمیشن، ریلے کمیشن، سیڈلر کمیشن، ہارتوگ کمیشن، وارد ھا اسکیم اور سرجنٹ اسکیم اہم ہیں۔ ان کمیشنوں کے ذریعہ تعلیمی ترقی کے سلسلے میں اہم سفارشات پیش کی گئیں۔ ان کے نفاذ سے تعلیم کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً اہم پیش رفت ہوئی۔ حصول آزادی کے بعد بہت سی سفارشات پیش کی گئیں جو آزاد ہندوستان کی تعلیمی ترقی کے لیے موثر ثابت ہوئیں۔

12.14 کلیدی الفاظ (Keywords)

مشنری : عیسائیت کی تبلیغ کرنے والا گروہ یا ادارہ۔

Anglicists : (انگریزی زبان کے حمایتی): کمپنی کے وہ افسران جو ہندوستان میں مغربی تعلیم کے فروغ کے حمایتی تھے۔

Orientalists : (مستشرقین) کمپنی کے وہ افسران جنھوں نے ہندوستانی تہذیب، روایات اور زبانوں کے فروغ کی حمایت کی۔

Utilitarain : (افادیت پسند، نظریہ اخلاقیات کے حامی) وہ افراد جو اس فلسفے کے حامی تھے جس کی رو سے کوئی بھی کام جس سے زیادہ تر لوگوں کو فائدہ پہنچے، اخلاقی طور پر صحیح ہے۔ جان اسٹوارٹ مل، جرمی بنتھم اور ان کے ہم خیال لوگ اس نظریے کے مبلغ تھے۔

Downward Filtration : نیچے کی جانب چھن کر جانے کا اصول جس کے تحت یہ خیال کیا گیا کہ متوسط طبقہ کے تھوڑے سے لوگوں کو تعلیم یافتہ بنا دیا جائے۔ ان لوگوں سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ عوام الناس کے درمیان جدید خیالات کی تشہیر کی ذمہ داری لیں گے۔

میگنا کارٹا : آزادی اور سیاسی حقوق کا پروانہ جو انگلستان کے بادشاہ سے 1215 میں حاصل کیا گیا تھا۔

12.15 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

12.15.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. کلکتہ مدرسہ کے قیام کا مقصد کیا تھا؟
2. بنارس میں سنسکرت کالج کب قائم ہوا؟
3. بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کس نے قائم کی؟

4. 1813ء کے چارٹر ایکٹ میں تعلیمی مصارف کے لیے کتنی رقم متعین کی گئی تھی؟
5. میکالے منٹ کب شائع ہوا؟
6. ووڈس ڈسپیچ کے تحت تعلیمی سرگرمیوں کے فروغ کے لیے کتنی رقم مختص کی گئی تھی؟
7. ریلے کمیشن کب قائم ہوا؟
8. 8.ہارتوگ کمیشن کا قیام کب عمل میں آیا؟
9. واردھا اسکیم کی کمیٹی کے صدر کون تھے؟
10. واردھا اسکیم کے تحت کس عمر کے بچوں کے لیے مفت تعلیم کی سفارش کی گئی؟

12.15.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. تعلیم کی توسیع کے سلسلے میں ہنٹر کمیشن کی سفارشات کیا تھیں؟
2. ریلے کمیشن کی سفارشات سے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔
3. سیڈلر کمیشن کی خاص سفارشات کیا تھیں؟
4. رادھا کرشنن کمیشن میں کون سی سفارشات پیش کی گئیں؟

12.15.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. تعلیم کی توسیع سے متعلق اینگلسسٹ اور اورینٹلسٹ کے قضیہ کو بیان کیجیے۔
2. جدید تعلیم کی توسیع میں ووڈس ڈسپیچ کی اہمیت بتائیے۔
3. 1919ء سے 1947ء تک تعلیمی توسیع میں ہوئی اہم پیش رفت کو بیان کیجیے۔

12.16 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2009.
2. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
3. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019.
4. Ghosh, Suresh Chandra, *A History of Education in Modern India*, *1757 – 1986*, Orient Longman, New Delhi, 1995.
5. Kumar, Nita, *The Politics of Gender*, *Community*, *and Identity*: *Essays on Education in India*, Oxford University Press, New Delhi, 2007.

6. Metcalf, Barbara D. and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).
7. Naik, J.P. and Syed Nurullah, *A Students' History of Education in India*, *1800-1973*, MacMillan, Delhi, 2011 (first pub. 1945).
8. Rao, Parimala V. ed., *New Perspectives on the History of Indian Education*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014.
9. Subramanian, Lakshmi, *History of India*, *1707–1857*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.

اکائی 13۔ سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریکات

(Socio-Religious Reform Movements)

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 انیسویں صدی کے اوائل میں سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریکات کے ابھرنے کے اسباب

13.3 رام موہن رائے اور برہمو سماج تحریک

13.4 ستی کے رواج کے خلاف رام موہن رائے کی مہم

13.5 ستی کے خلاف دیگر ہندوستانی دانشور

13.6 ستی مخالف مہم میں پریس کا کردار

13.7 دیوندر ناتھ ٹیگور کی رہنمائی میں برہمو سماج

13.8 کیشوچندر سین اور برہمو سماج

13.9 مہاتما جیوتی راؤ پھُولے اور انیسویں صدی میں سماجی اصلاح

13.9.1 پھُولے کے ظہور کا تاریخی پس منظر

13.9.2 پھُولے کی پیدائش اور ابتدائی زندگی

13.10 پھُولے کی فکری سرگرمیاں

13.10.1 نچلی ذات کی لڑکیوں کے لیے اسکول

13.10.2 پھُولے اور بیوگی کا مسئلہ

13.10.3 پھُولے بطور نظریہ ساز، اور منتظم

13.10.4 ستیہ شودھک سماج کا قیام

13.11 اکتسابی نتائج

13.12 کلیدی الفاظ

13.13 نمونہ امتحانی سوالات
13.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
13.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
13.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
13.14 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

13.0 تمہید (Introduction)

انیسویں صدی کے اوائل کی سماجی۔ مذہبی اصلاحی تحریکات، جدید ہندوستانی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ گو محدود پیمانے پر ہی صحیح، یہ تحریکات ہندوستانی سماج کی ایک نئی بیداری کا باعث بنیں۔ یہاں آپ کو دو الفاظ ملیں گے، 'سماجی' ('social') اور 'مذہبی'('religious') ۔ دونوں ہی کیوں؟ اس لیے کہ ہندوستان میں ہمارے بیشتر سماجی رویے یا تو مذہب سے سند پاتے ہیں یا کم از کم ایسا مانا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے سماجی اور ثقافتی اعمال میں تبدیلیاں لانے کی کسی بھی کوشش میں مذہبی بحث ناگزیر طور پر شامل ہوگی اور یہی وجہ ہے کہ ابتدائی انیسویں صدی کے سماجی مصلحین نے سماجی اصلاح کے ساتھ مذہبی اصلاح کی بات کی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ معاشرے میں تبدیلی لانے کے لیے مذہب میں حقیقی یا مجوزہ تحریفات کو نوآبادیاتی جدیدیت کے بدلتے وقت کے تقاضوں کے مطابق بدلنا ہوگا۔

13.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- انیسویں صدی کے اوائل میں سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریکات کے ابھرنے کے مختلف اسباب کو سمجھ سکیں گے۔
- مختلف سماجی مصلحین، جن میں سے بیشتر 'اونچی ذات' کے ہندو مرد ہوں گے سوائے پھُلے جیسے چند ایک شودروں کو چھوڑ کر ان کی مختصر سوانحی تفصیلات، ان کے ذریعہ انجام دی گئی سرگرمیوں، وہ سماجی خطرات جن کا انہوں نے سامنا کیا وغیرہ کے بارے میں جان سکیں گے اور ہندوستانی معاشرے میں ان کی خدمات کی تعریف کر سکیں گے۔
- خود فیصلہ کر سکیں گے کہ کیا عصری ہندوستان کو ایک اور سماجی اصلاحی تحریک کی ضرورت ہے، اور اگر ہاں/نہیں، تو کیوں؟

13.2 انیسویں صدی کے اوائل میں سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریکات کے ابھرنے کے اسباب

(Causes for the Emergence of Socio-Religious Reform Movements in the Early Nineteenth Century)

جب آپ کسی چیز کی اصلاح ('re'form) کے بارے میں سوچتے ہیں تو آپ یہ کہتے ہوئے آغاز کرتے ہیں کہ کچھ تو ہے جو

ترتیب میں نہیں ہے: وہ بگڑی ہوئی شکل (de'formed') میں ہے۔ چنانچہ آپ اسے حقیقی یا مجوزہ 'اصلی' شکل دینا چاہتے ہیں۔ اس لیے جب آپ کسی چیز کی تشکیل نو یا اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو آپ سب سے پہلے اس کی موجودہ حالت پر تنقید کرتے ہیں۔ چنانچہ سماجی مصلحین نے ان بے شمار برائیوں پر تنقید کی جو ہندوستانی سماج کو لاحق تھیں۔ مثلاً انہوں نے بت پرستی (idolatry) اور ایک سے زیادہ خداؤں کی عبادت (polytheism)، ہندوستانی خواتین کی خستہ حالت، ذات پات کی تفریق وغیرہ پر تنقید کی۔ تاہم جو بات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستانی معاشرہ خود تنقید سے آگاہ ہے۔ قرون وسطیٰ کی بھکتی تحریک کے اکثر مفکرین اس حقیقت کی توثیق کرتے ہیں۔ پھر، انیسویں صدی کے اوائل کی اصلاحی تحریکوں میں نیا کیا ہے؟ ہاں، ان میں کچھ نیا ہے۔ یہ تحریکات ایسے وقت سامنے آئیں جب برطانوی نوآبادیت اور مختلف النوع عیسائی مشنریوں کا مضبوط غلبہ تھا۔ اپنے سامراجی عزائم کے ساتھ، انگریزوں نے ہندوستانیوں کے مختلف سماجی اداروں اور مذہبی سرگرمیوں پر تنقید شروع کر دی تھی۔ مشنریوں نے، اپنے مضبوط تبلیغی ایجنڈے کے ساتھ، ہندوستانی ثقافتی سرگرمیوں پر بہت زیادہ اثر ڈالا، اور وہ نوآبادیاتی ہندوستان میں ہر جگہ موجود تھے چاہے وہ بنگال، مدراس، بمبئی ہو یا شمال مغربی سرحدی صوبے ہوں۔ آیئے چند مثالوں سے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

بنگال میں بپٹسٹ مشنری سوسائٹی (Baptist Missionary Society) ، جس کی نمائندگی ولیم کیری (William Carey, 1761-1834)، جوشوا مارش مین (Joshua Marshman, 1769-1837) اور ولیم وارڈ (William Ward, 1769-1823) کرتے تھے، نے ہندوستانی معاشرے پر سخت تنقید کی۔ انہوں نے ہندوستانیوں کے آداب، رسم ورواج اور حالات سے سے سخت نفرت کی اور انہیں حقیر جانا۔ ہندوستانیوں پر بتوں کی پوجا، ستی، ذات پات کے نظام، طفل کشی، اور گھاٹ قتل (یعنی دریائے گنگا کے کنارے مردہ چھوڑ دینا یا مرنے کے لیے چھوڑ دینا) کے لیے حملہ کیا گیا۔ بت پرستی نے عیسائیوں کو خاص طور پر خوفزدہ کر دیا کیونکہ ان کے چوتھے کمانڈمنٹ میں انہیں بت پرستی سے اجتناب کی ہدایت دی گئی تھی۔ ولیم کیری کے نزدیک دیوی کالی 'سب سے زیادہ قابل تصور شیطان جیسی شخصیت تھی' ('the most devil-like figure that could be thought of').

بت پرستی کے خلاف مشنری نفرت بیسویں صدی تک بھی واضح طور پر جاری رہی۔ لوزی امّال (Lousie Ammal) نامی عیسائی خاتون نے بت پرستی پر کڑی تنقید کی۔ اس نے تلگو زبان میں خواتین کے لیے ایک کرسچن مشنری جریدے 'وویکاوتی' (*Vivekavathi*) کے نومبر 1915 کے شمارے میں 'نجامینا دیودیورو؟' ('*Nijamyna Devudevaru?*') ('حقیقی خدا کون ہے؟'، صفحہ 57-59) کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا۔ اس نے تبصرہ کیا کہ بت انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں جن میں کوئی زندگی نہیں ہے؛ اگر وہ گریں گے تو ٹوٹ کر پاش ہو جائیں گے؛ اور اگر انہیں آگ میں پھینکا گیا تو جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ اس نے سوال کیا کہ اس میں موجود خدا اپنی حفاظت کیوں نہیں کر سکتا۔ اس کے مطابق، بت پرستی بچوں کے کھلونوں سے کھیلنے کی طرح تھی۔ اور کہا کہ 'خالص خدا' انسانوں کی بنائی ہوئی مورتیوں میں موجود نہیں ہو سکتا۔ آخر میں، اس نے زور دیا کہ 'صرف ایک ہی خدا' موجود ہے اور وہ ہے 'یسوع'!

بت پرستی کی مشنری تنقید نے ہندوستانی دانشوروں اور سماجی مصلحین کے ذہنوں پر بہت گہرے نقوش چھوڑے۔ آیئے! بیسویں صدی کے اوائل کی ایک مثال سے اسے سمجھتے ہیں۔ رایاسم وینکٹ شِوڈو - (Rayasam Venkata Sivudu, 1870 1954) مدراس پریذیڈنسی کے ایک مشہور سماجی مصلح تھے۔ خواتین کے ابتر حالات کو بہتر بنانے کے لیے، انہوں نے تلگو زبان میں خواتین کے جریدے، تیلگو زینانہ (*Telugu Zenana*, 1893-1907) کی ادارت کی۔ ذات کے لحاظ سے وہ ایک برہمن تھے اور برہمو سماج کے پیروکار تھے۔ وینکٹ شِوڈو نے اپنی سوانح عمری (آتماچرترامو (*Atma Charitramu*)، 1933، صفحہ 242) میں بتوں کی پوجا سے نفرت کا واضح طور پر ذکر کیا۔ وہ ہندو مذہب اور بت پرستی سے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تھے۔ 5 ستمبر 1893 کو، اپنے ماما کی درخواست پر، وہ وجئے واڑہ کے کنکا درگا مندر میں درشن کے لیے گئے۔ اگرچہ وہ اپنے ماما کو مطمئن کرنے کے لیے احترام والی جگہ (گربھالیامو) میں داخل ہوئے تاہم 'ان کے ہاتھ اس مورتی سے پوجا کے لیے نہیں اٹھ سکے'۔ ان کی اس حرکت پر ان کے ماموں برہم ہو گئے۔ انہوں نے لکھا کہ 'میں کسی طرح دیوی یا پجاری کو ایک پیسہ بھی ادا کیے بغیر مندر سے باہر نکل گیا'۔

ستی کے عمل (مردہ شوہروں کی چتا پر بیواؤں کو جلانا) نے مشنریوں کو دہشت زدہ کر دیا۔ ایبے جین انٹوائن ڈیبوئس (Abbe Jean Antoine Dubois, 1765-1848) نے تنجور کے آخری بادشاہ (جن کی وفات 1801 میں ہوئی) کی دو بیواؤں کو جلانے کا تفصیل سے ذکر کیا اور اس عمل کو 'توہم پرستانہ مذہبی جنون' قرار دیا۔ تاہم، پروٹسٹنٹ مشنری نے ستی پر انتہائی سخت تنقید کی۔ ولیم کیری کے الفاظ میں، ستی ایک 'حیران کن قتل' تھا۔ کیری 1799 میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ صرف پچھلے ایک سال میں کلکتہ کے تیس میل کے دائرے میں واقع دیہاتوں میں 438 بیواؤں کو جلا دیا گیا۔ ان کے الفاظ میں یہ 'ایک سال کی توہم پرستی، ظلم اور بربادی' تھی۔ کلکتہ کے دوسرے پروٹسٹنٹ بشپ ریجنالڈ ہیبر (Reginald Heber) نے ایک بار ایک ایسا منظر دیکھا جہاں ایک بیوہ اپنے مردہ شوہر کے ساتھ ابھی ابھی زندہ جلا دی گئی تھی۔ اس نے غمگیں انداز میں کہا: "میرا دل غمزدہ ہو کر رہ گیا اور مجھے افسوس ہوا کہ میں آدھا گھنٹہ جلد کیوں نہیں پہنچا"۔ ستی کے بارے میں اپنے 'خوفناک تجربے' کا ذکر کرتے ہوئے مارش مین نے لکھا: "وحشی بھیڑیوں کو اس طرح پسلی در پسلی، انسانی جسم کو چیرتے ہوئے دیکھنا انتہائی صدمہ پہنچانے والا عمل ہوتا ہے؛ لیکن رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو ایسا کرتے دیکھنا، جس کے ساتھ انہوں نے ایک گھنٹہ پہلے بھی اپنائیت سے بات کی تھی، اور اس احمقانہ عمل کو انجام دینا میرے لیے تقریباً ناقابل برداشت تھا۔" اپنی 1810 میں شائع ہونے والی کتاب 'ہسٹری، لٹریچر اینڈ مائتھولوجی آف دی ہندوز' جسے بعد میں اے ویو آف دی ہسٹری، لٹریچر اینڈ ریلیجن آف دی ہندوز کا نام دیا گیا (*History, Literature, and Mythology of the Hindoos* (which was later renamed as *A View of the History, Literature and Religion of the Hindoos*) میں ولیم وارڈ نے ستی کے چند واقعات بیان کیے۔ اس نے انہیں 'انتہائی دہشت انگیز اور ظالمانہ قتل' قرار دیا۔

ایک اہم پہلو جس پر انگریزوں نے تنقید کی وہ بالخصوص مذہبی کتب اور سماج میں ہندوستانی خواتین کی ابتر صورتحال تھی۔ ہم سب جیمز مل کے نام سے اچھی طرح واقف ہیں جو ہندوستان کا برطانوی سامراجی مورخ تھا۔ ہندو تہذیب و ثقافت میں خواتین کو کمتر مقام دینے پر

جیمز مل اپنی کتاب 'دی ہسٹری آف برٹش انڈیا' (*The History of British India*, 1818) میں لکھتا ہے:

> عورتوں کی حالت قوموں کے اخلاق میں سب سے قابل ذکر حالات میں سے ایک ہے۔ بد تمیز لوگوں میں، عورتیں عموماً ذلیل ہوتی ہیں۔ مہذب لوگوں میں وہ اعلیٰ ہیں۔ ۔۔۔ اس ذلت آمیز انحصار کی حالت سے زیادہ سخت اور ناگفتہ بہ صورتحال کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا جو ہندوؤں نے اپنی کمزور صنف کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ ۔۔۔ ہندو خواتین اس سے بھی زیادہ ابتر، سخت اور ذلت آمیز حالت میں تھیں جو کمزور صنف کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ ۔۔۔ ہندو اپنی عورتوں کے لیے جو عادی توہین کرتے ہیں اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ شاید ہی کبھی ان کا ذکر ان کے قوانین یا دوسری کتابوں میں ہوا ہو، لیکن ان کا تذکرہ انتہائی گرے ہوئے اور شیطان صفت کے طور پر کیا گیا ہے، جن کی فطرت میں کوئی نیکی یا کارآمد خوبی پیوست نہیں ہو سکتی۔ ۔۔۔ اس کے مطابق، انہیں انتہائی گری ہوئی حالت میں رکھا جاتا ہے۔ ۔۔۔ وہ مکمل طور پر مقدس کتابوں سے خارج ہیں۔ ۔۔۔ اس نظام کی رو سے وہ تعلیم سے محروم ہیں۔ ۔۔۔ اتنی حیرت انگیز بربریت کہ بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ کھانے تک کے لائق نہیں سمجھا گیا، ہندوستان بھر میں رائج ہے۔

ایسے تاریخی پس منظر میں انیسویں صدی کی سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریکات ابھریں۔

13.3 رام موہن رائے اور برہمو سماج تحریک

(Rammohun Roy and the Brahmo Samaj Movement)

ہندوستانی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے بارے میں اکثر عام تصور یہی ہے کہ اس کی ابتدا 1815 میں ہوئی، جب رام موہن رائے (1772-1833) کلکتہ منتقل ہوئے اور وہاں آتمیہ سبھا (Atmiya Sabha) قائم کی۔ انہوں نے مذہبی و سماجی اصلاح کی اپنی تحریک شروع کی۔ ہندوستان پر انگریزوں کا اثر ابھی محسوس ہونا ہی شروع ہوا تھا۔ تہذیبی و ثقافتی محاذ پر مغربی خیالات اور تعلیم کی تاثیر نے ہندوستان کے قدیم ترین مذہبی عقائد و رسوم پر ہندوستانی 'روشن خیال' وذی فہم طبقے میں دلچسپ مباحثہ و مذاکرات چھیڑ دیئے تھے۔ رام موہن رائے نے بنگال کے اس معاشرے میں ایک نئی جماعت کی نمائندگی کی، جہاں تقلید پسند ہندو مذہب کے بعض عقائد و رسوم پر سے لوگوں کا یقین اُٹھ چکا تھا۔ وہ ایک ایسے معقول مذہب کے متلاشی تھے جو ان کی مغربی تعلیم کے حسب حال ہو اور جس کا پیشہ ورانہ نقطۂ نظر ہو۔ رام موہن رائے نے بت پرستی (idolatrous worship) کے خلاف احتجاج کیا اور خدا کی وحدت کے تصور پر مبنی ایک ہمہ گیر مذہب قائم کرنا چاہا۔ اپنے مذہبی افکار کو ایک شکل دینے کے لیے رام موہن رائے نے 1828ء میں برہمو سبھا کی بنیاد ڈالی۔ یہ ایک نجاتِ کل کی حامی خدا پرستانہ انجمن تھی جس کا نام بعد میں برہمو سماج کر دیا گیا تھا۔

1804ء میں رام موہن رائے نے فارسی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا دیباچہ عربی زبان میں تھا۔ اس کتاب کا نام تحفۃ الموحدین (*Tuhfat-ul-Muwahhdin*) تھا یعنی خدا کو ایک ماننے والوں (Monotheists) کے لیے ایک تحفہ۔ یہ کتاب

ان کے علم تصوف کی آئینہ دار تھی۔ تحفۃ الموحدین کو اس کی عقلیت پسندی (Rationalism)، ارسطو کی منطق کی تردید اور مذہبی ضعیف الاعتقادی پر اس کی تیکھی تنقید کے لیے بے حد سراہا گیا۔ رام موہن نے اس حیرت انگیز قول کو مستقل بنیاد پر قائم کرنے کے لیے کہ 'تمام مذاہب میں تصنع ہے' استدلال کے یکساں اصولوں کا استعمال کیا۔ انھوں نے یہ دلیل دی کہ صرف تین بنیادی عقیدے سارے مذہبوں میں مشترک ہیں، ایک واحد خالق میں یقین، روح کا وجود اور بعد کی دنیا آخرت، پرلوک، جہاں جزا و سزا کا کماحقہ فیصلہ کیا جائے گا۔ 1820 میں انہوں نے پرسن کمار ٹیگور کے قلمی نام سے ایک کتاب 'یسوع کے اصول اخلاق: رہبر امن و مسرت' (*The Precepts of Jesus: The Guide to Peace and Happiness*) لکھی۔ رام موہن نے اپنے پہلے دو زبانوں میں شائع ہونے والے رسالے *Brahmmunical Magazine* (1821-1823) میں اپنے مذہبی نظریات پیش کیے جن میں انہوں نے ہندوستان کے بہترین عقائد و رسوم کے لیے گہری رغبت کا اظہار کیا اور خدا پرستی کے ہندو عقیدے کی عقلی یک رنگی کا دفاع کیا۔ انہوں نے مناظرے سے متعلق مثلاً چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کیں، جن میں انہوں نے ان پجاریوں پر تیکھے انداز میں اعتراضات کی بوچھار کی، جنہوں نے عوام الناس کو اندھ وشواس (ضعیف الاعتقادی) اور بت پرستی کا پاٹھ پڑھایا اور سنسکرت زبان میں تحریر کردہ شاستروں کا مقامی زبانوں میں ترجمہ نہیں ہونے دیا۔

رام موہن نے اپنے مذہبی نظریات و افکار منظم انداز میں آگے لانے کے لیے 1828 میں کلکتہ میں برہمو سماج قائم کیا۔ برہمو سماج نے اس بات کی تبلیغ کی کہ بت پرستی ہندو مذہب کے اتحاد اور زوال کے لیے ذمہ دار ہے اور اس کی وجہ سے حقیقی مذہب بے جان سا ہوتا جا رہا ہے۔ ہندوؤں نے خود کو رسموں، تیوہاروں اور سماجی علتوں میں الجھا لیا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ اصل مذہب پر ان کی دسترس ختم ہو گئی ہے۔ برہمو سماج کے وعظ و پند میں پروہتائی (Priesthood) کی شدید سرزنش بھی شامل ہوا کرتی تھی، جسے اس نے ہندو سماج کی افسوسناک حالت کے لیے مورد الزام ٹھہرایا تھا۔ رام موہن اپنے ماحول کو خاموشی سے برداشت نہیں کر سکے اور انہوں نے انسانی تقاضوں اور تمناؤں کے لیے زیادہ تسلی کے ساتھ جوابدہ ہونے پر ماحول کو مجبور کیا۔ انہوں نے فہم و ادراک کی آزادی اور بھلے برے کا فیصلہ کرنے کی انسانی تمیز کے حق پر زور دیا۔ ان کے زمانے میں برہمو سماج بنگال میں سماجی قوت و تحریک کا ایک ذریعہ تھا۔ 1833 میں انگلینڈ کے لیے ان کی روانگی اور اسی سال وہیں ان کی وفات کے بعد برہمو سماج سقوط و زوال کی کیفیت سے دوچار ہو گیا۔

13.4 ستی کے رواج کے خلاف رام موہن رائے کی مہم

(Rammohun Roy's Campaign against the Practice of Sati)

اس حصے کو پڑھنے سے قبل، براہ کرم ضمیمہ۔I پر ایک نظر ڈالیں، جہاں آپ کو بشمول بنگال، ہندوستان کے مختلف حصوں میں ستی کا رواج ملے گا۔ یہ صرف انگریز ہی نہیں تھے جو ستی کا خاتمہ چاہتے تھے۔ متعدد ہندوستانی دانشور اور سماجی مصلحین چاہتے تھے کہ ستی کو ختم کیا جائے۔ رام موہن رائے (Rammohun Roy) سے بہت پہلے، 'ایک انتہائی قابل برہمن'، مرتیونجے ودیا لنکارا (Mrityunjaya Vidyalankara) نے ستی کے مسئلے پر تفصیل سے بحث کی۔ ان کے مطابق، ستی ایک 'گھناؤنا عمل' تھا اور

'عورت کو جلانے سے روکنے والوں پر کوئی الزام نہیں ہوگا۔' ستی کے موضوع پر مرتیونجے کے اس موقف نے کہ اس کا کوئی مذہبی جواز نہیں ہے، برطانوی حکومت کو 'مثبت حوصلہ افزائی' فراہم کی جو کہ بصورت دیگر ستی کو ختم کرنے میں جھجک رہی تھی۔ ولیم بینٹنک (William Bentinck) نے ستی کے سوال پر ودیا لنکارا کے نقطۂ نظر کو دہرایا کہ: 'ہندوؤں کے مذہب میں کہیں بھی یہ [ستی] ایک لازمی فرض نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ایک بیوہ کی جانب سے پاکیزہ اور پرسکون زندگی کے تصور کو خصوصی اور ترجیحی طور پر پروان چڑھایا گیا ہے۔'

رام موہن رائے کو ستی کے موضوع پر ودیا لنکارا کی ہندو مت کی تشریح سے بہت فائدہ ہوا۔ مشہور دانشور اروند شرما (Arvind Sharma) کا کہنا ہے کہ، ستی کے خاتمے کی تائید میں، رام موہن رائے کو انسانی اور افادی دونوں لحاظ سے جذبہ ملا۔ کہا جاتا ہے کہ 1811 کے آس پاس، رام موہن کی بھاوج نے خود کو جلا کر ہلاک کر لیا یا ہو سکتا ہے کہ انہیں اس کے لیے مجبور کیا گیا۔ مورخ، جورگ فشچ (Jorg Fisch)، جنہوں نے 'ایمولیٹنگ وومین: اے گلوبل ہسٹری آف وڈو برننگ فرام انشی اینٹ ٹائمز ٹو پریزینٹ' (*Immolating Women: A Global History of Widow Burning from Ancient Times to the Present*) نامی کتاب لکھی، کہتے ہیں کہ شاید رام موہن رائے اپنی بھاوج کو جلانے کے وقت وہاں موجود تھے۔ چاہے جو بھی صورت ہو، وہ اس 'رسم کے سخت مخالف' بن گئے۔

رام موہن رائے نے پریس کے ذریعے ستی کے خلاف مہم چلائی۔ سال 1818 میں، انہوں نے 'بیواؤں کو زندہ جلانے کے رواج کے حامیوں اور مخالفین کے درمیان ایک کانفرنس' (*Conference between an Advocate for, and an Opponent of, the Practice of Burning Widows Alive*). نامی پمفلٹ بھی شائع کیا۔ یہ پمفلٹ ستی کے حامی اور مخالف کے درمیان مکالمے کی شکل میں لکھا گیا تھا۔ ستی کے خلاف مہم کو جاری رکھتے ہوئے، 1820 میں رائے نے ایک اور پمفلٹ شائع کیا۔ جس کا عنوان تھا "بیواؤں کو زندہ جلانے کے رواج کے حامیوں اور مخالفین کے درمیان دوسری کانفرنس" (*A Second Conference between an Advocate for, and an Opponent of, the Practice of Burning Widows Alive*). علاوہ ازیں، انہوں نے اس رواج کے مخالفین کے ایک گروپ کو اکٹھا کیا۔ رائے کو ہندو صحیفوں کا گہرا علم تھا۔ انہوں نے منو، یگنا ولکیا، وشنو، وششتا، بھگود گیتا وغیرہ کا حوالہ دیا اور ثابت کیا کہ ہندو مذہب میں ستی کی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ انہوں نے دلیل دیتے ہوئے کہا کہ، اس کے برخلاف ستی کی مخالفت کی گئی ہے۔ دانشور اروند شرما کے مطابق، ستی کے خلاف رام موہن کی دلیل واضح، منطقی اور زبردست تھی، اور ستی کے خاتمے میں ان کا تعاون یقیناً بہت بڑا تھا۔ تاہم، اروند شرما کا کہنا ہے کہ وہ حکومتی قانون سازی کے ذریعے ستی کے رواج کو ختم کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔ یہاں تک کہ لارڈ ولیم بینٹنک نے لکھا کہ رام موہن حکومت کی مداخلت کے بارے میں تذبذب کا شکار تھے۔ بینٹنک نے ستی کو ختم کرنے کے معاملے پر رام موہن سے رائے مانگی۔ دونوں کی ملاقات ہوئی، اور پھر بینٹنک نے رام موہن رائے کے بارے میں یہ لکھا:

مجھے یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ اسی طرح کی رائے کا ذکر جو ہمارے مستقبل کے ارادوں پر گہرے عدم اعتماد کا ممکنہ رد عمل تھا، مجھ سے ایک بات چیت کے دوران اس روشن خیال باشندے رام موہن رائے نے کیا تھا، جو ستی کے خاتمے کے پرجوش موئید تھے۔ ... یہ ان کی رائے تھی کہ اس عمل کو خاموشی اور غیر محسوس طریقہ سے دشواریاں بڑھا کر اور پولیس کی بالواسطہ مداخلت کے ذریعہ ختم کیا جاسکتا ہے۔

تاہم، ایک بار جب ستی کو ختم کرنے کا قانون منظور ہوا تو رام موہن نے دل و جان سے اس کی حمایت کی۔ ستی کے خاتمے کے موضوع پر رام موہن کے موقف کو اروند شرما نے "منظوری سے قبل مخالفت اور منظوری کے بعد حمایت" کے طور پر تعبیر کیا ہے۔

13.5 ستی کے خلاف دیگر ہندوستانی دانشور (Other Indian Intellectuals against *Sati*)

گوری شنکر بھٹاچاریہ (Gourishankara Bhattacharya)، بنگالی ہفت روزہ سمبادا بھاسکرا (*Sambada Bhaskara*) کے ایڈیٹر تھے جو رام موہن کے پیروکار تھے۔ وہ بیوہ کی دوبارہ شادی اور لڑکیوں کی تعلیم کے مضبوط حامی تھے۔ انہوں نے بینٹنک سے ستی کے خاتمے کی درخواست کی۔ فطری طور پر، ستی کے عمل کے حامیوں نے انہیں معاشرے سے خارج کرنے کی دھمکی دی۔ تاہم، انہیں خارج نہیں کیا گیا۔ لیکن، کالی ناتھ رائے (Kalinath Roy) اتنے خوش نصیب نہیں تھے۔ انہیں ستی کے خاتمے کی حمایت کرنے پر خارج کر دیا گیا تھا۔ ان کے ساتھیوں کو ہندو سماج سے نکال باہر کر دیا گیا۔ قدامت پسندوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں کسی تہوار، شادی یا جنازے میں مدعو نہیں کیا جائے گا۔ کالی ناتھ ستی کے خاتمے کے اتنے سخت حامی تھے کہ جب اس رسم کو ختم کیا گیا تو انہوں نے لارڈ بینٹنک کو مبارکباد دینے کے لیے ہندوؤں کے ایک وفد کی قیادت کی۔ ستی مخالف تحریک میں اور بھی اہم شخصیات شامل تھیں۔ دوارکاناتھ ٹیگور (Dwarakanath Tagore)، پرسنا کمار ٹیگور (Prasanna Kumar Tagore)، منشی متھرا ناتھ ملک (Munshi Mathuranath Mullick)، رام کرشن سنہا (Ramakrishna Sinha)، اور آنند پرساد بندیوپادھیائے (Anandaprasad Bandyopadhyay) ان میں سے چند شخصیات ہیں۔

13.6 ستی مخالف مہم میں پریس کا کردار (Role of the Press in the Anti-Sati Campaign)

ستی کے خاتمے کے حق میں رائے عامہ کو ڈھالنے میں جرائد نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں تین اہم جریدے سمباد کومدی (*Sambada Kaumudi*)، سماچار درپن (*Samachara Darpana*) اور بنگدوت (*Bangadoot*) شامل تھے۔ 1826 کا سال آنے تک انگریزی تعلیم یافتہ بنگالی نوجوان اس موضوع کی جانب متوجہ ہوئے۔ 30 جنوری اور یکم فروری 1826 کو بنگال ہرکارو (*Bengal Hurkaru*) میں ستی اور اس کے حامیوں پر تنقیدی خطوط شائع ہوئے۔ خطوط میں برطانوی حکومت سے اپیل کی گئی کہ وہ ستی کو روکنے کے لیے موثر اقدامات اٹھائے۔

13.7 دیوندر ناتھ ٹیگور کی رہنمائی میں برہمو سماج

(Brahmo Samaj under the Leadership of Debendranath Tagore)

مہرشی دیوندر ناتھ ٹیگور (1905-1817) کی روحانی قیادت کی وجہ سے برہمو سماج کا ستارہ جگمگانے لگا۔ دیوندر ناتھ نے 1839 میں ان نوجوان دانشوروں کی ایک انجمن قائم کی تھی جو ضعیف الاعتقاد ہندو مذہب سے برگشتہ ہو کر نئے روحانی تصورات اور مقاصد کی جستجو میں تھے۔ وہ انجمن 'تتوبودھنی سبھا' (Tattwabohini Sabha; 1839) تھی جس کی غیر رسمی وابستگی برہمو سماج سے تھی۔ اس کے ہفتہ وار مباحث اور ماہانہ جلسے ہوتے تھے۔ 1859 میں یہ انجمن برہمو سماج میں شامل ہو گئی۔ دیویندر ناتھ نے عیسائی تبلیغی پروپیگنڈے کا تدارک کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے انہوں نے 1843 میں تتوبودھنی (*Tatvabohini Patrika*) نامی رسالہ شائع کرنا شروع کیا جو مذہبی مباحثوں کے لیے ایک مرکز اور عیسائی مشنریوں کا ایک بے باک نکتہ چین بن گیا۔ دیویندر ناتھ نے 1843 میں برہما عہد نامہ (*Brahma Covenant*) لکھا۔ 1850 میں انہوں نے مذہبی کتابوں کا ایک مجلد نسخہ برہمو مذہب (Brahma Dharma) نجی اور عام پوجا پاٹھ میں استعمال کے لیے جاری کیا۔ 1861 میں انہوں نے ہندوؤں کے ایام زندگی کی رسوم پر نظر ثانی کی اور انہیں ایک نئی برہمو شکل دی۔ اگرچہ وہ ان ہندو سنسکاروں سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھیں، جو پہلے سے ہی موجود تھے۔

13.8 کیشوچندر سین اور برہمو سماج (Keshubchandra Sen and Brahmo Samaj)

دیویندر ناتھ ٹیگور کے جانشین کیشوچندر سین (1884-1838ء) تھے، جنہوں نے برہمو سماج کی تحریک کو ایک نئی جہت دی۔ کیشوچندر سین کے تذکرہ نویس کے مطابق 'اس تحریک سے وہ برہمو سماج میں داخل ہوئے تھے، انہوں نے اس میں کسی نظریاتی مذہب کے بر عکس کوئی طرز زندگی ڈھونڈ نکالنے کی قسم کھائی۔ ہر وہ اصول جو انہوں نے وضع کیا، ہر وہ اصلاحی عمل جس کا انہوں نے بیڑا اٹھایا، اسی عہد کا نتیجہ تھا۔ اپنے خطبات میں سین نے اس بات پر زور دیا کہ انسان اگر ایک تنظیم اور ایک خدا کے ماتحت آجائے تو ذات پات کا فرق آپ ہی ختم ہو جائے گا۔ 1860ء میں سین نے سنگت سبھا (انجمن معتقدین) قائم کی جس کے پیروکاروں نے ذات پات اور جنیو ترک کرنے اور عورتوں کو برابری کا درجہ دلانے میں اہم کردار نبھایا۔

1864ء میں برہمو سماج کی عمارت ایک ہوا کے طوفان میں برباد ہو گئی اور اس وجہ سے برہمو سماج کے اجتماعات ٹیگور کی رہائش گاہ پر ہونے لگے۔ دیویندر ناتھ ٹیگور نے ان لوگوں کو بھی اجازت دی جو جنیو پہننے کے خلاف نہیں تھے۔ سین نے اس پر اعتراض کیا اور 1865ء میں انہوں نے اپنے پیروکاروں کو برہمو سماج سے الگ کر لیا۔ نظریاتی اور روایتی بنیادوں پر اس فیصلے کو 1866ء میں اس وقت باضابطہ شکل دے دی گئی جب سین نے 'برہمو سماج آف انڈیا' کی تشکیل کی۔ جو لوگ ٹیگور کے وفادار تھے، انہوں نے 'آدی برہمو سماج' قائم کر لیا۔ آزاد خیال نوجوان کیشوچندر سین کے ساتھ ہو گئے۔ انہوں نے پیروکاروں کو اپنے آزاد خیال، پرامن، عقلی مذہب اور اخلاقی تصورات پر عمل کرنے کی تلقین کی۔ انہوں نے اصرار کیا کہ ذات پات کی علامت کے طور پر پروہت، جنیو اور چندن ٹیکا دونوں کو چھوڑ دیں۔ علاوہ ازیں پروہت کا عہدہ

ذات کی بنیاد کے بجائے خدمت خلق اور ذاتی اوصاف کے ذریعہ حاصل کیا جائے۔ ذاتوں کے مابین شادی کو بڑھاوا دیا جائے اور کم سنی کی شادی کو روکا جائے اور پوجا میں سنسکرت کے بجائے بنگالی زبان استعمال کی جائے۔ انہوں نے سماج کو تلقین کی کہ وہ سماجی اصلاحات کو تقویت دینے کے لیے دوسری ترقی پسند جماعتوں کا ہاتھ بٹائے۔ نوجوان مقلدین کو خصوصاً عورتوں کی محکومیت اور مجبوریوں سے آزادی کی فکر تھی۔ کیشو نے آزاد خیال نوجوانوں کے ترجمان کے طور پر خود کو تبدیلی لانے کی جدوجہد کے لیے وقف کر دیا۔

آدی برہمو سماج کی سماجی اصلاحات میں بہت کم دلچسپی تھی۔ 1905ء میں دیویندر ناتھ کی وفات کے ساتھ ہی آدی برہمو سماج کا موثر کردار بھی ختم ہو گیا۔ کیشو کو ماننے والوں نے اعلان کیا کہ ہر قوم اور ہر ذات کے مرد اور عورتیں جو برہمو مذہب کے بنیادی نظریات میں یقین رکھتے ہیں، وہ برہمو سماج آف انڈیا کے ممبر بن سکتے ہیں۔ انہوں نے دنیا کی تمام مذہبی کتابوں سے خداپرستانہ عبارتوں کو یکجا کر کے انہیں ایک کتاب کی شکل میں ترتیب دیا۔ اس کتاب کا نام 'اشلوک سنگرہ' تھا۔ برہمو مذہب کی مذہبی تقریبات اور اجتماعات میں اس کتاب کو پڑھا جاتا تھا۔ 1870 میں جب اس کا نیا ایڈیشن شائع ہوا تو اس کے سرورق پر یہ مقولہ درج تھا، 'وشال سرشٹھی (وسیع کائنات) بھگوان کا مندر (خانہ خدا) ہے'۔ 1869ء میں 'کیشوی مندر' کے طرز تعمیر نے 'برہمو سماج آف انڈیا' کے نجات کل کے عقیدہ کا اعلان کیا۔ یہ ایک ہندو مندر، ایک مسلم مسجد اور ایک عیسائی کلیسا کا امتزاج تھا، جہاں نہ بت پوجنے کی اجازت تھی اور نہ کسی مذہبی کتاب کو حتمی تصور کیا جاتا تھا۔ مندر میں دعاء بھجن، وعظ یا بیان کی اجازت نہیں تھی، نہ ہی بت پرستی کے کسی بھی انداز، فرقہ بندی یا کوئی نازیبا حرکت جائز تھی۔ برہمو مذہب کے ان اجتماعات میں سبھی ذاتوں، نسلوں، قوموں کے مرد اور عورت شریک ہو سکتے تھے۔

کچھ ہی عرصے میں کیشو کی مقبولیت نہ صرف بنگال میں، بلکہ پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ 1860 اور 1870 کی دہائیوں میں اس سماج کی نئی شاخیں قائم ہوئیں اور پیروکاروں میں اضافہ ہوتا رہا۔ 1872 تک اس کی کم و بیش ایک سو شاخیں قائم ہو چکی تھیں، جن میں زیادہ تر بنگال میں تھیں۔ بہار، آسام، اڑیسہ، اتر پردیش، مدھیہ پردیش حتی کہ مدراس (چنئی) اور کیرالہ میں بھی اس کی شاخیں تھیں۔ سین انگلینڈ گئے اور انہوں نے ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات کی اور واپس آنے پر 'انڈین ریفارم ایسوسی ایشن' قائم کی اور ایک جریدہ 'سُلبھ سماچار' نکالا جو ان کے نظریات و افکار کا ترجمان تھا۔

1872ء میں 'خصوصی شادی قانون' پر سماج شدید اختلافات سے دوچار ہو گیا۔ اس کے تحت برہمو وِواہ (برہمو شادی) کو جائز ٹھہرایا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا گیا کہ برہمو ہندو نہیں ہیں۔ حقوق نسواں کے لیے سین کے رویہ پر بھی سماج میں بے اطمینانی تھی۔ کیمبرج کے رینگلر، آنند موہن بوس اور وکیل درگا موہن داس نے احتجاج کیا کہ برہمو اجتماعات میں خواتین کو اپنے مرد رشتہ داروں کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دینی چاہئے۔ 1875ء میں کیشو، جنہوں نے دس سال قبل دیویندر ناتھ کے خلاف آئین پسندی اور روادارانہ اصلاح کا جھنڈا اٹھایا تھا، اب اپنے ہی سماج میں آزاد خیالی کی مخالفت کرتے ہوئے دیکھے گئے۔ 'سم درشی' جماعت نے کیشو کی قیادت کو چیلنج کیا اور ان پر آمریت پسندی نیز سماج کے مال و متاع کو بے جا استعمال میں لانے کا الزام لگایا۔ 1876ء تک کیشو سرگرم سماجی اصلاحی کاموں سے بیزار ہو چکے تھے اور یوگ ابھیاس اور مذاہب کے تقابلی مطالعے تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ جب انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی کوچ بہار کے مہاراجہ کے ساتھ طے کی تو

ان پر دوروی کی تہمت بھی لگائی گئی۔ دلہن کی عمر اور بت پرستانہ رسموں کو برتنے کی وجہ سے اس شادی کو برہمو وِواہ قانون کی خلاف ورزی گردانا گیا۔ آنند موہن بوس، شیوناتھ شاستری اور دوسروں کی قیادت والے ترقی پسند دھڑے نے خود کا 'سادھارن سماج' شروع کیا اور اس طرح برہمو سماج میں دوسری پھوٹ 1878ء میں پڑی۔ سین کی دلچسپی بھکتی اور نجات کل کے عقیدے میں بڑھتی گئی۔ 1881ء میں انہوں نے نو وِدھان (دستورِ نو) قائم کیا جس کا نشان سرخ پرچم تھا، جس پر ان کے سنگھ کے نام کے ساتھ ہندوؤں کا ترشول، عیسائیوں کی صلیب اور اسلامی ہلال بھی بنا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک نیا اخبار دی نیو ڈسپنسیشن (new dispensation) شروع کیا اور ایک نیا ضابطہ 'نو سمت' اختیار کیا۔ جس نے برہمو مذہب کی جگہ لی۔ کیشو کی وفات 1884ء میں ہوئی اور ان کی تحریک انتشار اور گروہ بندی کے اثر سے ٹوٹ گئی۔

13.9 مہاتما جیوتی راؤ پھُولے اور انیسویں صدی میں سماجی اصلاح

(Mahatma Jotirao Phule and Social Reform in Nineteenth Century)

جدید ہندوستان کے معماروں میں سے ایک ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر نے 28 اکتوبر 1954 کو کہا: 'دوسروں کو جہاں چاہیں جانے دیں ۔ ہم جیوتی با[پھُولے] کے راستے پر چلیں گے۔ ہم مارکس کو اپنے ساتھ لے بھی سکتے ہیں یا نہیں بھی لے سکتے، لیکن ایک بات یقینی ہے کہ ہم جیوتی با کے فلسفے کو نہیں چھوڑیں گے۔' اس کے علاوہ، انہوں نے اپنی کتاب جو پہلی مرتبہ 1947 میں شائع ہوئی تھی اور جس کا عنوان تھا "شودر کون تھے؟ ہند آریائی سماج میں وہ چوتھے ورنا کیسے بنے" (*Who Were the Shudras? How they came to be the Fourth Varna in the Indo-Aryan Society*) جیوتی با پھُولے کے نام منسوب کی۔ اس کے انتساب میں لکھا ہے کہ: 'جدید ہندوستان کے سب سے بڑے شودر مہاتما جیوتی با پھُولے (1827-1890) کی یاد میں تحریر، جنہوں نے ہندوؤں کے نچلے طبقے [ذات] کو اعلیٰ طبقے [ذات] کی غلامی سے آگاہ کیا اور جنہوں اس انجیل (مقدس اصول) کی تبلیغ کی کہ، ہندوستان کے لیے سماجی جمہوریت غیر ملکی حکمرانی سے آزادی کے مقابلے زیادہ اہم تھی۔'

جیوتی با پھُولے میں ایسا کیا تھا کہ باباصاحب ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر جیسی عظیم شخصیت پھُولے کے فلسفے اور عمل کی اتنی گرویدہ ہوگئی اور اپنی ایک اہم تصنیف ان کے نام منسوب کر دی؟ ہاں ! پھُولے جدید ہندوستانی تاریخ میں ایک سے زیادہ معنوں میں اہم ہیں۔ برج رنجن منی (Braj Ranjan Mani) کے خیال میں، 'جو رام موہن رائے، دیانند سرسوتی اور [سوامی] وویکانند، اشرافیہ کی ثقافتی قوم پرستی کے لیے تھے، وہی پھُولے ہندوستان کی طویل عرصے سے دبی ہوئی انسانیت کی آزادی کی جدوجہد کے لیے تھے۔' اپنی پوری زندگی پھُولے نے برہمنیت (Brahmanism) کے تسلط کے خلاف جدوجہد کی، اور شودروں اور اَتی شودروں (دلتوں) اور تمام ذاتوں کی خواتین بشمول برہمن ذات کی خواتین کی ترقی کے لیے کام کیا۔

13.9.1 پھُولے کے ظہور کا تاریخی پس منظر (The Historical Context in which Phule Emerged)

پھُولے (1827-28 نومبر 1890) جابرانہ سماجی، معاشی، ثقافتی اور سیاسی حالات کی پیداوار تھے۔ اگرچہ پیشواؤں کی حکمرانی 1818 میں ختم ہوگئی، مہاراشٹر میں نچلی ذاتوں (شودروں اور اتی شودروں) کو حسبِ معمول برہمنوں نے ذلیل کیا اور دبایا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، پیشوا برہمن تھے۔ ثقافتی چلن کی بنا پر، نوآبادیاتی ہندوستان کے دیگر حصوں کی طرح، مہاراشٹر کے لوگوں نے، برہمنوں کو خدائی طور پر مقرر کردہ اعلیٰ طبقہ کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ برہمن، خاص طور پر چِت پوَن برہمن، سماج میں ہر سطح پر غالب تھے، اور انہوں نے معاشی، انتظامی اور ثقافتی اعمال کو اس حد تک کنٹرول کیا تھا کہ پیشوائی کو 'برہمنی راج' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ برہمنوں کو مراعات دینا اور دوسری ذاتوں کو دبانے کا عمل ساتھ ساتھ رائج تھا۔ پاکی۔ناپاکی کے اصولوں پر سختی سے عمل کیا گیا۔ نچلی ذات کے لوگوں جیسے مہار، مانگ، چمار، بھنگیوں، دھیڑ وغیرہ کو سڑکوں پر چلتے وقت مٹی کے برتن باندھنے پڑتے تھے۔ سڑک پر کوئی برہمن نظر آجائے تو انہیں فوری بیٹھ جانا پڑتا تھا کیونکہ ان کا سایہ برہمن کو ناپاک کر دیتا۔ اس طرح شودروں اور اتی شودروں پر بے شمار ذلتوں کا ڈھیر ڈال دیا گیا۔ برہمنوں کے غلبے کے اسی تناظر میں مہاراشٹر میں جیوتی با پھُولے کی پیدائش ہوئی۔

13.9.2 پھُولے کی پیدائش اور ابتدائی زندگی (Phule's Birth and Early Life)

پھُولے 1827 (کچھ کے مطابق 1828) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین گووند راؤ (Govindrao) اور چمنا بائی (Chimnabai) تھے۔ وہ پیشے سے مالی، یعنی پھل اور سبزی اگانے والے تھے۔ پھُولے کے خاندان کی سماجی حیثیت کے بارے میں، گیل اومویٹ (Gail Omvedt) کہتے ہیں: 'پھولے خود ایک دلت نہیں تھے، لیکن ایک ایسے آدمی تھے جسے آج کی زبان میں ایک 'متمول اوبی سی' ذات کے طور پر بیان کیا جاسکتا ہے، جن کی مراٹھا۔کنبیوں کے ساتھ درمیانی درجے کے لوگوں کے طور پر درجہ بندی کی گئی۔' پھُولے نے سب سے پہلے 1834 سے 1838 تک ایک مراٹھی میڈیم اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ انہیں اپنے والد کے ایک برہمن کلرک کے مشورے پر اسکول سے نکال لیا گیا، جس نے ان کے والد کو بتایا کہ تعلیم شودر کا 'دھرم' نہیں ہے۔ تاہم، غفار بیگ منشی اور لیگٹ (Liggit) (ایک برطانوی افسر) کے مشورے پر، پھُولے کو دوبارہ اسکول بھیج دیا گیا، اس بار انہیں پڑھنے کے لیے (47-1841 کے دوران) ایک انگریزی میڈیم اسکول بھیجا گیا۔ 1840 میں ان کی شادی ساوتری بائی سے ہوئی۔ 1848 میں پھُولے کی زندگی میں ایک انتہائی ذلت آمیز واقعہ پیش آیا۔ وہ اپنے برہمن دوست کی شادی کی بارات میں شامل ہوئے۔ پھُولے کی ذات کا علم ہونے پر، دولہے کے رشتہ داروں نے انہیں شادی کی بارات سے نکال باہر کیا۔ شدید دلبرداشتہ پھُولے نے یہ واقعہ اپنے والد کو سنایا اور جواب میں انہیں صرف یہ سننے کو ملا: 'ہم، ادنیٰ شودر، برہمنوں کی برابری کی آرزو کیسے کر سکتے ہیں؟ کیا یہ ان کا نرم سلوک کافی نہیں ہے کہ مارنے پیٹنے کے بجائے انہوں نے صرف تمہیں بھگا دیا؟' پھُولے کے والد نے مبینہ طور پر انہیں نچلی ذات کے لوگوں کے ساتھ ہونے والے کئی توہین آمیز واقعات بیان کیے اور بتایا کہ کس خاموشی سے وہ اس روزمرہ کی ذلت کو برداشت کر رہے ہیں۔

13.10 پھُولے کی فکری سرگرمیاں (Phule's Intellectual-Activism)

13.10.1 نچلی ذات کی لڑکیوں کے لیے اسکول (Schools for Lowered Caste Girls)

لیکن پھُولے ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو خاموش رہتے۔ انہوں نے خاموشی کو توڑا اور دبی کچلی عوام کو آواز دی۔ انہوں نے نہ صرف عدم مساوات پر مبنی برہمنی دنیا کے نظریے کو چیلنج کیا بلکہ اپنے اعلیٰ ذات کے ساتھیوں کی حمایت سے بھی نچلی ذات کے لوگوں کو سماجی غلامی سے نکالنے کے لیے سنجیدگی سے کام کیا۔ 1848 میں، جیوتی باپھُولے نے شودر اور اتی شودر ذاتوں سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کے لیے نچلی ذات کا خواتین اسکول (Low Caste Female School) قائم کر کے بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ یہ ایک ایسا اسکول تھا جسے شودر ذات کے ایک آدمی نے، اور شودر اور اتی شودر ذات کے لوگوں کے لیے اور وہ بھی لڑکیوں کے لیے شروع کیا۔ یہ قدامت پسند برہمنوں کے لیے بہت بڑی بات تھی اور فطری طور پر، وہ اس 'بے ضابطگی کے طرز عمل' پر شدید برہم ہو گئے اور پھُولے کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں ۔ لیکن پھُولے کوئی ایسے شخص نہیں تھے جو دباؤ کے سامنے جھک جاتے۔ قدامت پسند طبقوں کو مزید چونکاتے ہوئے، انہوں نے ایک اور 'بد نظمی' کا ارتکاب کیا۔ انہوں نے اپنی بیوی ساوتری بائی (Savitribai) کو مذکورہ اسکول میں بطور استاد ملازم رکھا۔ قدامت پسند اس لکشمن ریکھا کے مٹ جانے کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جو انہوں نے انتہائی گہرائی سے کھینچی تھی اور سختی کے ساتھ اس کی حفاظت کی تھی۔ جب ساوتری بائی کا حوصلہ پست کرنے کی ان کی کوششیں ناکام ہوئیں (مثال کے طور پر، ان پر اسکول جاتے وقت کیچڑ، مٹی اور پتھر پھینکے گئے)، تو انہوں نے پھُولے کے والد پر دباؤ ڈالا۔ اُنہوں نے پھُولے کے والد سے کہا: ''تمہارا بیٹا مذہب اور سماج کے لیے کلنک ہے۔ اسی طرح اس کی بے شرم بیوی ہے۔ تم خدا کی ناراضگی مول لے رہے ہو۔ مذہب اور خدا کے نام پر، ہم آپ کو حکم دیتے ہیں کہ اس [معاشرتی بے ضابطگی] کو روکیں یا اسے [اپنے گھر سے] نکال دیں۔'' ذرا تصور کریں کہ پھُولے کے والد پر کیا نفسیاتی دباؤ پڑا ہو گا! وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو قدامت پسندوں کے خلاف بغاوت کرتے۔ وہ سماجی دباؤ کے سامنے جھک گئے اور پھُولے کے سوانح نگار دھنجے کیر (Dhananjay Keer) کے مطابق، پھُولے کے والد نے اپنے بیٹے کو اسکول یا گھر دونوں میں سے کسی ایک کو چھوڑنے کا حکم دیا۔ پر عزم پھُولے نے اپنے والد کا گھر چھوڑنے کا انتخاب کیا، لیکن اسکول نہیں چھوڑا۔ وہ اپنی بیوی ساوتری بائی کے ساتھ نکل گئے۔ اس سے بالخصوص ان کے والد ٹوٹ سکتے تھے کیونکہ وہ پھُولے کے ماں اور باپ دونوں ہی تھے جیسا کہ ابتدائی بچپن میں ہی پھُولے نے اپنی ماں کو کھو دیا تھا۔ پھُولے اپنے مشن میں نہیں رکے، اور ہمت کے ساتھ آگے بڑھ کر لڑکیوں کے لیے کچھ اور اسکول قائم کیے۔ جن میں سے ایک 3 جولائی 1851 کو؛ ایک اور 17 ستمبر 1851؛ اور ایک 15 مارچ 1852 کو کھولے گئے۔ انیسویں صدی کے پہلے نصف کے آس پاس لڑکیوں اور خاص طور پر شودر اور دلت ذاتوں سے تعلق رکھنے والوں کو تعلیم دینا یقیناً ثقافتی بغاوت کا ایک عمل تھا۔ پھُولے، بلاشبہ، ایک ثقافتی انقلابی تھے۔

13.10.2 پھُولے اور بیوگی کا مسئلہ (Phule and the Widow Question)

پھُولے نے نچلی ذات اور اونچی ذات دونوں کے لیے کام کیا۔ انہوں نے اعلیٰ ذات کی ہندو بیواؤں کے مسئلے کو بڑی بہادری سے اٹھایا۔ انیسویں صدی کے دوران ہندو بیواؤں کی حالت بدترین تھی۔ کم عمری کی شادیاں لڑکیوں کی جلد بیوہ ہونے کا باعث بنیں۔ ودیاوا چسپتی شیخ

محبوب باشا(Shaik Mahaboob Basha *Vidya Vachaspati*)کے مطابق،بیواؤں کو،خواہ وہ کتنی ہی کم عمر ہوں، دوبارہ شادی کرنے سے منع کیا گیااور انہیں بے شمار پریشانیوں کا سامنا کرناپڑا۔بطورِ رسم ان کے سروں کو مونڈ کر بے رحمی سے ان کے حلیے بگاڑ دیے گئے،انہیں بمشکل کھانادیاجاتااور انہیں بدشگون سمجھا جاتااور ہر موقع پر ان کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی،بناآرام کیے مسلسل گھر کے تمام کام کرنے پر مجبور کیا جاتااور مختصراً انہیں ایک عام انسان کی حیثیت سے ان کے وجود سے محروم رکھا گیا۔نوجوان اور بوڑھی بیواؤں پر جسمانی اور نفسیاتی دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ چند ایک نے خودکشی کرلی، کئی گھروں سے بھاگ گئیں،اور دیگر رضاکارانہ طور پر یا غیر ارادی طور پر ناجائز جنسی تعلقات میں ملوث ہو گئیں، بعض اوقات 'ناجائز' پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کر دیا جاتا،اور بہت سے دوسروں نے خاموشی سے جبری بے عزتی کا سامنا کیا۔

جیوتی باپھُولے کو ہندو بیواؤں کے دگرگوں حالات نے بہت متاثر کیا۔انہوں نے نہ صرف مہاراشٹر میں جاری بیواؤں کی دوبارہ شادی کی تحریک کی حمایت کی بلکہ بیواؤں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے بھی براہ راست کام کیا۔انہوں نے بیواؤں کے لیے پناہ گاہیں (شیلٹر ہوم) قائم کیں۔بیوائیں وہاں یاتواپنے بچوں کو جنم دینے یاانہیں پالنے پوسنے کے لیے جاتی تھیں۔انہوں نے پونا کے گھروں پر ہینڈ بل چسپاں کر دیئے۔ہینڈ بلوں میں انہوں نے اپیل کی کہ: 'اے بیواؤں! یہاں آؤاور محفوظ اور خفیہ طریقے سے اپنے بچوں کو جنم دو۔اپنی خود کی مرضی سے یاتو بچہ کو لے جاؤ یاہمیں پر چھوڑ دو۔ یتیم خانہ ان کی دیکھ بھال کرے گا۔' تقریباً 35 حاملہ بیوائیں پھُولے کے یتیم خانے میں گئیں اور وہاں بچوں کو جنم دیا۔پھُولے کو 'آریائی مذہبی ادارے کا سنگ دل نظام' خراب لگا جو بیواؤں کے لیے 'تفریقی اور غیر منصفانہ' تھا۔انہوں نے بیوہ مردوں کو دوبارہ شادی کرنے کی اجازت دینے اور بیوہ خواتین کو اس سے منع کرنے کے دوہرے معیارات پر سوال اٹھایااور برطانوی حکومت سے 'جبری بیوگی کے ظلم کو ختم کرنے' کی اپیل کی۔کم عمری میں بیوہ پن، بچپن کی شادیوں کا کڑوا پھل تھا۔اس لیے انہوں نے برطانوی حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ بالترتیب 19 اور 11 سال سے کم عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیوں کی اجازت نہ دے۔

13.10.3 پھُولے بطور نظریہ ساز،اور منتظم (Phule as an Ideologue, and Organiser)

پھُولے شودروں اور اتی شودروں کے نظریہ ساز کے طور پر ابھرے۔انہوں نے اپنی کتابوں کے ذریعے غالب برہمنی نظریے کے خلاف بغاوت کی، جو خاص طور پر ہر طرف پھیلے ہوئے ذات پات کے جبر کے خلاف لکھی گئیں ۔انہوں نے ڈرامے، نظمیں اور مکالماتی تحریریں لکھیں۔ان کی تصانیف میں سب سے مشہور کتاب 'غلام گری' (*Gulamgiri*) ہے۔یہ کتاب مراٹھی زبان میں لکھی گئی تھی لیکن اس کا دیباچہ انگریزی میں تھا۔جون 1873 میں شائع ہونے والی اس کتاب میں سولہ ابواب تھے۔اس میں انہوں نے اپنے نقطہ نظر سے ہندوستانی تاریخ کی از سر نو تشریح کی،اور ہندوستان میں برہمنی تسلط کو بے نقاب کیا۔دلچسپ بات یہ تھی کہ پھُولے نے یہ کتاب 'امریکہ کے اچھے لوگوں' کے نام منسوب کی۔انتساب میں کہا گیا ہے کہ: 'نذرانہ عقیدت کے طور پر حبشی یا کالوں کی غلامی سے منہ پھیر لینے اور اس کے تئیں خود کو قربان کر دینے کے جذبے والے ریاستہائے متحدہ کے اچھے لوگوں کے نام منسوب؛اور اس شدید خواہش کے ساتھ کہ میرے ہم وطن اپنے شودروں کو برہمنوں کے تسلط سے نجات دلانے میں ان کی اس عظیم مثال پر عمل کر سکیں۔' اس انتساب سے یہ واضح ہو جانا چاہئے

کہ پھُولے نے غلام گیری کیوں لکھی۔ پھُولے کی دیگر اہم تصانیف میں شیتکاریاچہ اسوڈ (*Shetkaryacha Asud*)(جس کا مطلب ہے کاشتکار کی کوڑا بنانے کی رسی، جو 1883 میں شائع ہوئی، جس میں کسانوں پر ہونے والے ظلم و ستم کو بیان کیا گیا)،اور سروجنک ستیہ دھرم پُستک (*Sarvajanik Satya Dharma Pustak*)(جس کا مطلب ہے سچے عقیدے کی کتاب، جو 1891 میں بعد از مرگ شائع ہوئی، یہ ایک نئے توحید پرست اور مساوی مذہب کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش ہے) شامل ہیں۔ انہوں نے 1869 میں شیواجی پوواڈا (*Shivaji Powada*)(شیواجی پر بلاڈ) تصنیف کی۔ پھُولے نے علم اور طاقت کے درمیان مضبوط تعلق کو واضح طور پر سمجھا،اور متبادل علمی نظام بنانے کی پوری کوشش کی جو بیک وقت غیر انسانی برہمنی علم کو ختم کرے اور پسماندہ اور بے گھر لوگوں کو علم اور طاقت دونوں میں جائز حصے کا دعویٰ کرنے کے قابل بنائے۔ اپنی کتابوں کے ذریعے، پھُولے نے پسماندہ عوام، بشمول عورتوں اور مردوں دونوں کے فائدے کے لیے علمی نظام کی از سر نو ترتیب اور اقتدار کو جمہوری بنانے کی خواہش کی۔

13.10.4 ستیہ شودھک سماج کا قیام (Establishment of the 'Satya Shodhak Samaj')

پھُولے نے 24 ستمبر 1873 کو ستیہ شودھک سماج (Satya Shodhak Samaj)(سچائی کے متلاشیوں کی سوسائٹی) کی بنیاد رکھی۔ اس سماج کا مقصد شودروں اور اتی شودروں کو برہمنی صحیفوں کے اثر سے آزاد کرانا، انہیں ان کے انسانی حقوق کے بارے میں آگاہ کرنا اور انہیں ذہنی اور مذہبی غلامی سے بھی آزاد کرانا تھا۔ سماج کی رکنیت تمام ذاتوں بشمول برہمن، مہار اور مانگ کے لیے کھلی تھی۔ اس کے ابتدائی مراحل میں یہودی اور مسلمان بھی اس میں شامل تھے۔ ہر اتوار کو اس کی ہفتہ وار مجلسیں ان جگہوں پر ہوتی تھیں جہاں اس سماج کی شاخیں قائم تھیں۔ پونا میں ان کا انعقاد ڈاکٹر گواڈے (Dr. Gavade) کی رہائش گاہ پر ہوتا تھا۔ گفتگو کے موضوعات میں اعتدال اور لازمی تعلیم، مذہبی میدان میں برہمن پجاریوں کے تسلط کا خاتمہ، کم سے کم خرچ پر شادیاں کرنے کا انتظام کرنا، لوگوں کو توہمات سے آزاد کروانا وغیرہ شامل تھے۔ تاہم، سب سے اہم مقصد ذات پات کے نظام اور بت پرستی پر حملہ تھا۔ خدا کے باپ ہونے اور انسانوں کے بھائی بہن ہونے کے ضابطہ پر زور دیا گیا تھا۔

13.11 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

عزیز متعلمین! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ انیسویں صدی کے ہندوستان میں سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریکات کے ابھرنے کے متعدد اسباب سمجھ چکے ہونگے۔ آپ جان پائے کہ کیسے عیسائی مشنریوں اور برطانوی سامراج کے حامیوں نے ہندوستانی سماج اور ثقافت پر اپنی تنقید کے ذریعے ہندوستانی دانشوروں میں احساس کمتری کو پیدا کیا جس کے نتیجے میں وہ ہندوستانی سماج کی اصلاح کے لیے آگے آئے۔ آپ یہ بھی جان سکے کہ کیسے رام موہن رائے اور دیگر نے اصلاحی تحریکات کا آغاز کیا۔ مزید آپ یہ سمجھ سکے کہ کیسے شودر مصلحین جیسے مہاتما جیوتبا پھولے انیسویں صدی کے مہاراشٹر کے سماجی اصلاح کے منظر نامے پر ابھرے اور شودروں اور اتی شودروں کو ذات پات کے ظلم و جبر سے آزادی دلانے کے لیے کوششیں کیں اور کیسے پھولے نے اعلیٰ اور ادنیٰ ذات کی خواتین کے حالات میں بہتری لانے کے لیے کام کیا۔ اب آپ

بذات خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کیا اکیسویں صدی کے ہندوستان کو بھی ایسی ہی سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریک کی ضرورت ہے۔

13.12 کلیدی الفاظ (Keywords)

ستی	:	شوہر کی لاش کے ساتھ عورت کو زندہ جلا کر مارنے کی رسم
نشاۃ ثانیہ	:	تہذیبی اور فکری نئی بیداری کا عمل
شودر	:	ہندو ورن آشرم دھرم کے مطابق چوتھے طبقے کے دبے کچلے لوگ
اتی شودر	:	دلت لوگوں کے لیے پھولے کی وضع کردہ اصطلاح یا تصور

13.13 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

13.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. رائے سم وینکٹا شوڈو کون تھے؟
2. *The History of British India* کے مصنف کون تھے؟
3. کس سال میں رام موہن رائے نے *Conference between an Advocate for, and an Opponent of, the Practice of Burning Widows Alive* کو لکھا؟
4. ستی کی رسم کو ختم کرنے والے گورنر جنرل کون تھے؟
5. *Who Were the Shudras? How they came to be the Fourth Varna in the Indo-Aryan Society* نامی کتاب کس نے لکھی؟
6. مہاتما جیوتبا پھولے نے لڑکیوں کے لیے پہلا اسکول کس سال میں کھولا؟
7. 'غلام گیری' نامی کتاب کس سال میں شائع ہوئی؟
8. 'غلام گیری' نامی کتاب کس زبان میں لکھی گئی؟
9. مہاتما جیوتبا پھولے کی کتاب *Shetkaryacha Asud* کس موضوع پر لکھی گئی؟
10. تتوبودھنی پتر کا (*Tatvabohini Patrika*) نامی رسالہ کس نے شائع کیا؟

13.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ہندوستانی ثقافت پر جیمس مل کی تنقید پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
2. ستیہ شودھک سماج پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
3. دیوندر ناتھ ٹیگور کے بارے میں لکھیے۔

4. عیسائی مشنریوں نے کس طرح ہندو مذہب میں بت پرستی پر تنقید کی؟

5. کیا یہ اکائی آپ کے لیے مفید ہے؟ ہے/نہیں تو کیوں؟

13.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. انیسویں صدی کے ہندوستان میں ستی کی رسم کے خلاف چلائی گئی مہم پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

2. انیسویں صدی کے سماج کو جگانے میں مہاتما جیوتبا پھولے کے کردار پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

3. کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اکیسویں صدی کے ہندوستان کو ایک سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریک کی ضرورت ہے؟ ہے/نہیں تو کیوں؟

13. Widow burning. Miniature by an Indian artist, late eighteenth century. *Source*: British Library, Oriental and India Office Collections, Add. Or. 2790. Reproduced by kind permission of the British Library

Source: Jorg,Fisch, *Immolating Women*: *A Global History of Widow Burning from Ancient Times to the Present*, Permanent Black, Delhi, 2005. p. 498.

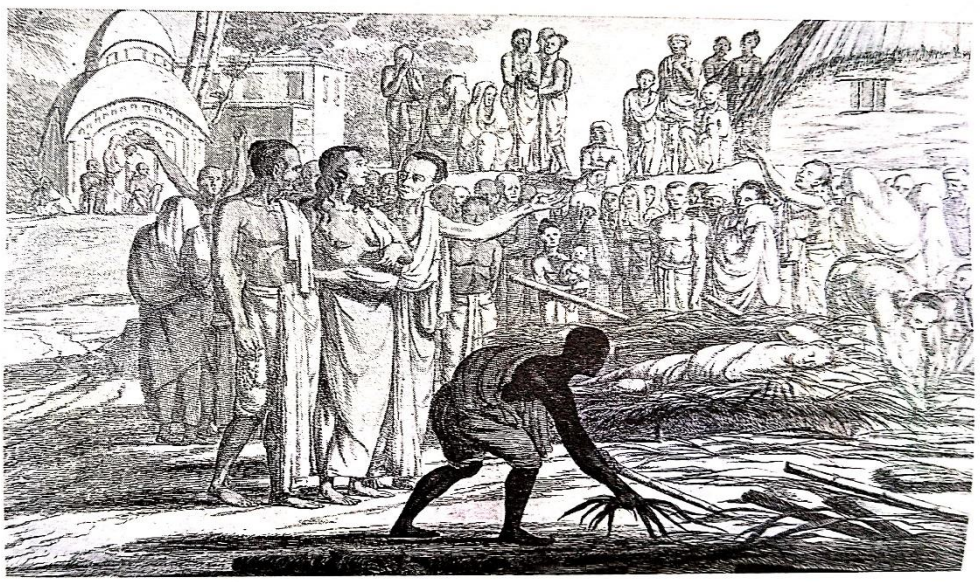

17. Widow burning I (1799). *Source*: François Balthazar Solvyns (a Belgian artist working in Calcutta): *A collection of two hundred and fifty coloured etchings descriptive of the manners, customs and dresses of the Hindoos*. Calcutta 1799, section 12, no.13

ضمیمہ-I

Table: 1

Widow Burning Registered by the British administration in Bengal Presidency, 1815-1828

ڈویژن	1815	1816	1817	1818	1819	1820	1821	1822	1823	1824	1825	1826	1827	1828	کل	%
کلکتہ	253	289	442	544	421	370	392	328	340	373	398	324	337	308	5119	62.9
ڈھاکہ	31	24	52	58	55	51	52	45	40	40	101	65	49	47	710	8.7
مرشدآباد	11	22	42	30	25	21	12	22	13	14	21	8	9	10	260	3.2
پٹنہ	20	29	49	57	40	42	69	70	49	42	47	65	55	55	689	8.5
بنارس	48	65	103	137	92	103	114	102	121	93	55	48	49	33	1153	14.2
بریلی	15	13	19	13	17	20	15	16	12	10	17	8	18	10	203	2.5
بنگال پریسیڈنسی	378	442	707	839	650	597	654	583	575	572	639	518	517	463	8134	100.0

Source: Jorg,Fisch, *Immolating Women*: *A Global History of Widow Burning from Ancient Times to the Present*, Permanent Black, Delhi, 2005. p. 476.

ضمیمہ-II

Table: 2

1814-1819	1817-1819	1814-1816	ضلع
82	37	45	گنجام
23	17	6	وزاگاپٹنم
12	9	3(?)	راجمنڈری
44	43	1(?)	مسولی پٹنم
14	14	معلومات نہیں	گنٹور
13	12	1(?)	نلور
-	-	-	بلاری
7	6 (4 prevented)	1	کڈپہ

4	4	-	چنگل پیٹ
16	13	3	چتور
2	2	-	ترچناپلی
42	22	20	کومباکونم
-	-	-	وردا چلم
-	-	-	سلیم
-	-	-	کوئمبٹور
-	-	-	مدرا
-	-	-	تناویلی
-	-	-	شمالی اور جنوبی مالا بار
4	4	-	کنارا
-	-	-	سرنگاپٹنم
معلومات نہیں	معلومات نہیں	معلومات نہیں	تنجور
243	183	80	کل

Source: Jorg,Fisch, *Immolating Women*: *A Global History of Widow Burning from Ancient Times to the Present*, Permanent Black, Delhi, 2005. p. 481.

13.14 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

(Suggested Books/ Articles for Further Reading)

1. Ambedkar, Dr. Babasaheb, *Who Were the Shudras? How they came to be the Fourth Varna in the Indo-Aryan Society*, Vol. 7, ed., Vasant Moon, Dr. B.R. Ambedkar Foundation, New Delhi, 2014.
2. Basha, Shaik Mahaboob, 'Christian Press and Hindu Social Reform: The Story of *Vivekavathi*', *Kakatiya Journal of Historical Studies*, Vol. XVI, No. I, May 2021, pp. 114-135.
3. Basha, Shaik Mahaboob, 'Craving for Companionate Wives: Male Reformers, Women's Journals and Domestic Ideology in Andhra, 1883-1950' in Salma Ahmad Farooqui ed., *Histories, Regions, Nodes*: *Essays for Rattan Lal Hangloo*, Primus Books, Delhi, 2017, pp. 238-280.

4. Basha, Shaik Mahaboob, 'Sculpting a 'New Woman' with Print Culture in Colonial Andhra: A Biography of *Telugu Zenana*, 1893-1907', *Kakatiya Journal of Historical Studies*, Vol. IV, No. I, May 2009, pp. 124-146.
5. Chakravarti, Uma, *Rewriting History*: *The Life and Times of Pandita Ramabai*, Kali for Women, New Delhi, 1998.
6. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
7. Dasgupta, Subrata, *The Bengal Renaissance*: *Identity and Creativity from Rammohun Roy to Rabindranath Tagore*, Permanent Black, Ranikhet, 2007.
8. Dasgupta, Subrata, *Awakening*: *The Story of the Bengal Renaissance*, Random House India, Noida, 2010.
9. Deshpande, G.P., ed., *Selected Writings of Jotirao Phule*, Left Word, New Delhi, 2002.
10. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019 (first pub. 2015).
11. Fisch, Jorg, *Immolating Women*: *A Global History of Widow Burning from Ancient Times to the Present*, Permanent Black, Delhi, 2005.
12. Gavaskar, Mahesh, 'Colonialism within Colonialism: Phule's Critique of Brahmin Power' in S.M. Michael ed., *Dalits in Modern India*: *Vision and Values*, Sage Publications, New Delhi, 2007 (first pub. 1999).
13. Jones, Kenneth W., *Socio-Religious Reform Movements in British India*: *The New Cambridge History of India*, Cambridge University Press, New Delhi, 1999.
14. Kavlekar, Kashinath, *Non-Brahmin Movement in Southern India*, *1873-1949*, Shivaji University Press, Kolhapur, 1979.
15. Keer, Dhananjay, *Mahatma Jotirao Phooley*: *Father of Indian Social Revolution*, Popular Prakashan, Bombay, 1997 (first pub. 1964).
16. Mani, Braj Ranjan, *Debrahmanising History*: *Dominance and Resistance in Indian Society*, Manohar, New Delhi, 2005.
17. Metcalf, Barbara D., and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).
18. O'Hanlon, Rosalind, *Caste, Conflict, and Ideology*: *Mahatma Jotirao Phule and Low Caste Protest in Nineteenth-Century Western India*, Permanent Black, Ranikhet, 2002.
19. Omvedt, Gail, *Cultural Revolt in a Colonial Society*: *The Non-Brahman Movement in Western India*, Manohar, New Delhi, 2011.
20. Omvedt, Gail, *Dalit Visions*: *The Anti-Caste Movement and the Construction of an Indian Identity*, Orient Longman, New Delhi, 2006 (first pub. 1995).
21. Sen, Amiya P., ed., *Social and Religious Reform*: *The Hindus of British India*, Oxford University Press, New Delhi, 2006 (first pub. 2003).

22. Sharma, Arvind et al., *Sati*: *Historical and Phenomenological Essays*, Motilal Banarsidas Publishers, Delhi, 2001 (first pub. 1988).
23. Subramanian, Lakshmi, *History of India*, *1707-1857*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.

اکائی 14۔ مزاحمت کی نوعیت اور شکلیں

(Nature and Forms of Resistance)

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 سنیاسی اور فقیر بغاوتیں

14.3 مذہب اور بغاوت

14.3.1 تیتو میر

14.3.2 تیتو میر بطور بادشاہ

14.4 فرائضی تحریک

14.5 موپلا بغاوت

14.6 سنتھال بغاوت

14.6.1 سدو اور کانو

14.6.2 سنتھالوں کی شکایات کو دور کرنے کے لیے برطانوی اقدامات

14.7 اکتسابی نتائج

14.8 کلیدی الفاظ

14.9 نمونہ امتحانی سوالات

14.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

14.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

14.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

14.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

14.0 تمہید (Introduction)

پچھلی اکائیوں میں، آپ نے دیکھا کہ کس طرح برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت برطانوی حکومت نے، ہندوستانی سماج کے مختلف طبقات پر کئی معنوں میں گہرا اثر ڈالا۔ اگر مقامی حکمران بالخصوص سیاسی طور پر متاثر ہوئے تو عام ہندوستانیوں کو کمپنی کی اقتصادی، محصولات اور تجارتی پالیسیوں کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا۔ کمپنی کے منظم معاشی استحصال نے ہندوستانی معاشرے کے اساسی گروہوں کو مکمل طور پر برباد کر دیا۔ ہندوستانیوں، حکمرانوں اور عام لوگوں دونوں نے، برطانوی حکومت کے خلاف کئی طریقوں سے مزاحمت وجدوجہد کی۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف متاثرہ طبقات کی جانب سے انگریزوں کے خلاف کی جانے والی مزاحمت وجدوجہد کی نوعیت اور شکل کیا تھی؟ کیا انہوں نے قوم پرستی اور جمہوریت جیسے جدید نظریات کی بنیاد پر مزاحمت کی یا مذہب، ذات پات اور قبیلے کی ابتدائی شناختیں ان کی مزاحمت کی مضبوط بنیاد کا سبب بنیں؟ یہ تحریکیں کیسے برپا ہوئیں؟ مذہب اور بغاوت میں کس قسم کا تعلق تھا؟ اس اکائی میں، ہم صرف چند مزاحمتی تحریکوں کا جائزہ لیں گے (کیونکہ ان میں سے بیشتر کے بارے میں آپ 15 ویں اکائی میں پڑھیں گے) جس میں ان تحریکات کی نوعیت وشکلوں پر زور دیا جائے گا۔ بالفاظ دیگر، ہم دیکھیں گے کہ کس طرح برطانوی دور کے دبے کچلے ہندوستانی، اپنے ذہنوں میں قوم پرستی کے تصور کی جڑ پکڑنے سے بہت پہلے ہی نوآبادیاتی حکمرانی کے جبر کے خلاف متحد ہو گئے۔

14.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد، آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مختصر طور پر ہی صحیح اس بات کو سمجھیں سکیں کہ ہندوستانی سماج کے مختلف طبقات نے برطانیہ کے خلاف زبردست جدوجہد کی۔
- اس بات کو سمجھ سکیں کہ مظلوم ہندوستانی کسی واضح طبقاتی یا قوم پرست فہم وشعور کے بنا ہی متحد ہو گئے تھے۔
- قومیت کے جدید نظریے کی عدم موجودگی میں مذہب جیسی ابتدائی شناختوں کی جانب سے ادا کیے جانے والے کردار کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- اس بات کو طے کر سکیں کہ آیا اس طرح کی تحریکات محض انگریز مخالف تھیں یا پھر قوم پرست۔

14.2 سنیاسی اور فقیر بغاوتیں (The Sanyasi and Fakir Uprisings)

1760 اور 1800 کے درمیان سنیاسیوں کی جانب سے بغاوتوں کا ایک سلسلہ جاری رہا۔ سنیاسی، جنہیں گوسائیں اور بیراگی بھی کہا جاتا تھا، تجارت، سود خوری اور کرائے کی فوجی خدمات کا ایک وسیع نیٹ ورک چلاتے تھے۔ بالخصوص اٹھارویں صدی میں ان کی نمایاں پہچان تھی جیسا انہوں نے مقامی سیاست دانوں کو اپنی خدمات پیش کیں اور ان کا سیاسی، اقتصادی اور فوجی اثر ورسوخ وسیع تھا۔ ایک ممتاز انگریز افسر رابرٹ بارلو (Robert Barlow)، بنارس کے گوسائیوں کے بارے میں کہتا ہے کہ ''وہ ایک مذہبی فرقہ تھے جو اپنی دولت اور تمام تجارتی لین دین میں دیانتداری کے لیے جانے جاتے تھے۔'' اس کا مطلب ہے کہ وہ اہم کھلاڑی تھے۔ لیکن پھر برطانوی پالیسیوں نے

سنیاسیوں کی اہمیت کو کیسے خطرے میں ڈالا؟ انگریزوں نے کچھ ایسے فیصلے لیے جن سے سنیاسی بری طرح متاثر ہوئے۔ انگریزوں نے یاتراؤں کے راستوں پر سنیاسیوں کی آزادانہ نقل و حرکت پر قدغن لگادی اور ان راستوں سے متصل دیہاتوں سے چندہ وصول کرنے کے حق پر پابندی لگادی۔ مزید یہ کہ انہوں نے سنیاسیوں کے ہتھیار رکھنے کی آزادی پر پابندی لگادی۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے ان بڑے جاگیرداروں کا ساتھ دیا جو طاقتور گوسائیں ساہوکاروں سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ انگریزوں نے کرائے سے پاک زمینوں کو بحال کیا اور اپنے اس اقدام سے گوسائیوں کی معاشی بنیادوں پر براہ راست حملہ کیا۔

1773 میں وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) نے ایک اعلامیہ جاری کیا جس کے تحت تمام بیراگیوں اور سنیاسیوں کو بنگال اور بہار کے صوبے سے باہر نکال دیا گیا۔ اس اقدام نے انہیں مشتعل کر دیا۔ انہوں نے زمینداروں پر چھاپے مارے اور انہیں اپنے حملوں کا نشانہ بنایا بالخصوص ان لوگوں کو جنہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حمایت حاصل تھی۔ اس کی وجہ سے جنگ جیسی صورتحال پیدا ہو گئی۔ 1773 میں مجنوں شاہ (Majnu Shah) کی قیادت میں فقیروں نے سنیاسیوں سے ہاتھ ملایا اور انگریزوں کو للکارنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دسمبر 1773 میں سنیاسی اور فقیر باغیوں نے برطانوی فوجیوں کی چار کمپنیوں کا سامنا کیا۔ لیکن، وہ شکست کھا گئے۔ تاہم بغاوت کا شعلہ سلگتا رہا۔ کمپنی حکومت کو بنگال میں ان کی تنظیموں یا اکھاڑوں کو غیر مسلح کرنے میں تین دہائیاں لگیں۔ بغاوتوں کے بارے میں جو بات بہت اہم تھی وہ یہ تھی کہ ان میں خاص طور پر 1770 کے تباہ کن قحط کے بعد کسان بڑے پیمانے پر شامل تھے۔ بغاوتوں میں کسانوں کی شمولیت برطانوی معاشی پالیسیوں کے خلاف شدید ناراضگی کا اشارہ تھا۔

'مجنوں حقیقت' نے برطانوی جابرانہ پالیسیوں اور باغیوں کی ناراضگی کی بہترین عکاسی کی:

کمپنی کے ایجنٹوں اور پائیکوں نے ظلم ڈھایا فنکاروں اور رعیت پر،
تاکہ بٹور سکیں بہت زیادہ مال و دولت اور یوں لوگ مجبور ہوئے گاؤں چھوڑنے پر۔
ہزاروں فقیروں نے دکھایا ردعمل اور صف آرا ہوئے اپنے لیڈر مجنوں کے ساتھ،
ساتھ ہی سنیاسی بھی جمع ہو کر آ ملے ان کے ساتھ۔
تمام باغیوں نے مل کر بولا کچہری پر ہلہ اور لوٹی کمپنی کی کوٹھیاں،
تاکہ حاصل کیا جا سکے مال اور ساز و سامان،
رہ گئے انگریز خوفزدہ اور مایوس،
لیکن تھی انہیں امید کہ ہو جائیں گی ختم ان کی تکالیف ایک دن۔

یہی غصہ اور عدم اطمینان شمالی بنگال کے رنگ پور جیسے اضلاع میں کسانوں کی شورش کا باعث بنا۔ یہاں کا محصول کاشتکاری نظام نقائص سے بھرا ہوا اور بہت ہی جابرانہ تھا۔ دیبی سنگھ اور گنگا گوبند سنگھ جیسے انسان نما گِدھوں نے گاؤں والوں کو خوفزدہ کیا۔ کسان اسے برداشت نہ کر سکے، چنانچہ کسانوں نے ایک عرضی بھیج کر اس مسئلے کو حل کرنے کی درخواست کی، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اور کسانوں کے پاس ہتھیار اٹھانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں بچا۔ انہوں نے اپنے قائدین کا انتخاب کیا، اختیارات کا ایک ابتدائی ڈھانچہ قائم کیا اور زمینداروں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ انہوں نے متوازی حکومت قائم کی۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اس بغاوت میں ہندو اور مسلم کسان دونوں اکٹھا ہو کر شامل ہوئے۔ انہوں نے اپنے اعمال کو جائز قرار دینے کے لیے قبل از نوآبادیاتی علامتوں اور رواج کو استعمال کیا۔ تاہم، یہ تجربہ مختصر رہا اور کمپنی کی افواج نے انہیں بے دردی سے کچل دیا۔ مؤرخ لکشمی سبرامنیم کے مطابق، یہ شورش کمپنی کی حکمرانی کے ذریعے قائم کیے گئے نئے حکم کی غیر واضح مذمت تھی۔ باغیوں کا ایک ہی مشترکہ مقصد تھا، استعمار کی جانب سے لیے جانے والے فیصلوں کے خلاف جدوجہد کرنا۔ باغی یقینی طور پر ایک متحدہ گروپ نہیں تھے اور نہ ہی یہ ایک طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم، کمپنی کی حکمرانی کے تئیں ان طبقوں میں جو ناراضگی تھی، وہ انہیں حقیقی طور پر نوآبادیاتی مخالف قرار دینے کی اہل بناتی ہے۔

14.3 مذہب اور بغاوت (Religion and Rebellion)

کس طرح ایک مشترکہ مذہبی شناخت نے مظلوموں کو ظالم کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور کیا؟ ابتدائی جدید دنیا میں، سیکولر نظریات کی عدم موجودگی میں، مذہب نے لوگوں کو ظلم کے خلاف مزاحمت وجدوجہد کے لیے اکٹھا کیا۔ تیتو میر اور تحریکِ طریق محمدیہ اس بات کو واضح طور پر ثابت کرتی ہیں۔ اس تحریک کا پس منظر بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ثالثی زمینداروں کے نئے طبقے نے کسانوں پر ظلم کیا۔ ان کا مقصد کمپنی کے لیے محصولات کی وصولی کو بڑھانا تھا۔ اس کا نتیجہ میں قرضوں میں ڈوبے کسانوں کے ساتھ ان کے تعلقات کشیدہ اور غیر مستحکم ہو گئے۔

14.3.1 تیتو میر

تیتو میر ابتدائی طور پر مقامی زمینداروں کے ایک پٹھو تھے۔ حج کے بعد ان کی زندگی بدل گئی۔ مکہ میں وہ رائے بریلی کے سید احمد سے متاثر ہوئے۔ مؤخر الذکر نے انہیں ہندوستان واپس جانے اور مقامی علاقے میں غریب کسانوں کے درمیان کام کرنے کو کہا۔ تیتو میر نے ابتدائی طور پر خالص اسلام کے قیام کے لیے کام کیا اور وہ تجدید ایمان کرنے والوں کی ایک جماعت بنانا چاہتے تھے۔ ان کی تحریک کا دوسرا اور اتنا ہی اہم پلیٹ فارم برطانوی راج، جسے وہ ایک برائی سمجھتے تھے، کے خلاف مذہبی جنگ تھی۔

تیتو میر کی مہمات نے بہت سے لوگوں کو تحریک دی۔ خاص طور پر مظلوم اور غریب کسان ان سے متاثر ہوئے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ جولاہے، جو کرشنا دیب رے جیسے ظالم زمینداروں سے سخت ناراض تھے، متحرک ہو گئے۔ رے نے کسانوں پر پابندیاں بڑھانے کی کوشش کی۔ کسانوں کی عرضی سننے سے اس کے انکار نے کسانوں کو اسلحہ اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اکتوبر 1830 میں تیتو میر نے ایک اعلان جاری

کیا۔اس میں کہا گیا تھا کہ وہ اور ان کے پیروکار ملک کے مالک ہیں، اور برطانوی راج اب ختم ہو چکا ہے۔انہوں نے ایک اور فرمان جاری کیا۔اس کے مطابق، علاقے کے زمینداروں اور تعلق داروں پر یہ لازم تھا کہ وہ محصولات انہیں بھیجیں نہ کہ برطانوی خزانے کو۔ان احکامات کو صادر کرنے کے بعد میر اور ان کے پیروکاروں نے بازاروں، ساہوکاروں اور زمینداروں پر حملہ کیا۔

جب مظلوم متحد ہو کر مزاحمت کرتے ہیں تو کیا ظالم خاموش رہتے ہیں؟ نہیں، بالکل نہیں! جو لوگ کسی نظام سے مستفید ہوتے ہیں وہ کبھی بھی اپنی طاقت اور مراعات کو گھٹانے یا مٹانے کی اجازت نہیں دیتے۔وہ سب یکجا ہو جاتے ہیں۔اسی طرح یہاں جابر زمینداروں، یورپی باغان مالک اور بعد میں برطانوی حکومت نے باغیوں کو دبانے کے لیے ایک مشترکہ محاذ تشکیل دیا۔کالی پرسنا مکھرجی اور دیبناتھ رے جیسے جابر زمینداروں پر یا نیل کی کاشتکاری کرنے والے والی زمینوں، جو باراسات اور ندیا میں تقسیم کیے گئے تھے، پر مظلوموں و دبے کچلے افراد کے حملے استحصال زدہ عام لوگوں کی جانب سے پیش کیے گئے چیلنج کی سنگینی کو ثابت کرتے ہیں۔

14.3.2 تیتو میر بطور بادشاہ

نومبر 1830 میں تیتو میر نے خود کو بادشاہ قرار دے دیا۔انہوں نے معین الدین (جن کا تعلق رودراپور سے تھا) نامی ایک جولاہے کو اپنا وزیر اور اپنے بھتیجے غلام معصوم کو سپہ سالار مقرر کیا۔غریب کسانوں کی ایک بڑی تعداد ٹیٹو میر کے ساتھ شامل ہوئی اور انہوں نے کافی بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔اس ''آزاد کردہ علاقہ'' پر میر نے خود مختار حکومت کی۔انہوں نے زمینداروں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا، ٹیکس وصول کیا اور انصاف رسانی کا انتظام کیا۔انہوں نے بانس کا ایک قلعہ تعمیر کروایا۔بانس کا ہونے کی وجہ سے وہ قلعہ مضبوط نہیں تھا لیکن اس کی ایک علامتی اہمیت تھی۔وہ اس لحاظ سے اہم تھا کہ اس نے بغاوت کے جذبے کو زندہ رکھا۔1831 میں گورنر جنرل سے اپنی خط و کتابت میں ندیا کے ضلعی مجسٹریٹ نے یہ الفاظ کہے: ''لوگوں کی اس غیر معمولی اجتماعیت کی جو جذبہ، عہد اور جنون میں نے دیکھا ہے، جس کی تعداد آس پاس کے گاؤں کو ملا کر 1500 کے آس پاس بنتی ہے، اس کے بعد مجھے حکومت کی جانب سے فوری اور موثر امداد مانگنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے۔'' ہاں، انگریزوں نے جوابی کارروائی کی، اور جوابی کارروائی نہ صرف تیز تھی بلکہ وحشیانہ بھی تھی۔ٹیٹو میر کا بانس کا قلعہ تباہ کر دیا گیا، وہ خود بھی شکست کھا کر جاں بحق ہو گئے، اور ان کے پیروکاروں کو بے رحمی سے دبا دیا گیا۔

14.4 فرائضی تحریک (Faraizi Movement)

یہ ایک ایسی تحریک تھی جہاں برطانوی تسلط اور استحصال کے خلاف مزاحمت کرنے والوں کے مذہب نے اہم کردار ادا کیا۔اس تحریک نے اسلام کے ایک خالص ورژن اور غیر اسلامی طریقوں کو ترک کرنے پر زور دیا۔تحریک نے قرآن کو اپنا واحد روحانی رہنما تسلیم کیا۔تحریک کے رہنما شریعت اللہ اور دادو میاں تھے۔ان کے پیروکاروں نے زمینداروں، باغان مالکوں اور برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کی۔دادو میاں غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں کے مالک تھے۔فرید پور، بکر گنج، ڈھاکہ، پبنہ، ٹیپرا، جیسور اور نواکھالی کے اضلاع میں گاؤں میں تنظیم کی تعداد سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔اس کے علاوہ، انہوں نے انتظامیہ اور ثالثی کا ایک متوازی نظام چلایا اور 1840 کی دہائی میں جبر کے

خلاف اپنی مزاحمت جاری رکھی۔ اس دوران انگریزوں کے ساتھ ان کے کئی بار مسلح تصادم ہوئے۔ سنتھال بغاوت کے برعکس، فرائضی تحریک حکام سے کوئی مستقل رعایت حاصل نہیں کر سکی۔ تاہم، یہ تحریک ایک اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہ کمپنی کی حکمرانی سے پیدا ہونے والے سماجی عدم استحکام کو اور اس کے نتیجے میں مقامی لوگوں میں پیدا ہونے والے غم و غصہ کو ظاہر کرتی ہے۔ صرف اسلامی رخ اختیار کرنا اس تحریک کی ایک سنگین خامی تھی۔ یہ فرقہ وارانہ اور دیگر اختلافات کو پاٹ نہیں سکی۔ قائدین اور پیروکار اسلام سے بالاتر ہو کر دوسرے طبقات کو ایک مشترکہ مقصد کے تحت جمع ہونے کے لیے متحرک نہیں کر سکے۔ تحریک کی ان حدود کے باوجود، یہ ایک اہم تحریک تھی کیونکہ یہ نوآبادیاتی حکمرانی کے خلاف اختلاف اور احتجاج کی علامت تھی۔ یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس نے زرعی معاشرے میں ذیلی گروہوں کی جانب سے ایک خود مختار سیاست گری کے امکانات کو ظاہر کیا۔

14.5 موپلا بغاوت (Maplah Rebellion)

موپلاؤں کا تعلق جنوبی ریاست کیرالہ کے مالابار علاقے سے ہے۔ موپلا عرب تاجروں کی اولاد ہیں جنہوں نے مقامی خواتین سے شادی کی۔ وہ انگریزوں کے استحصال کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ برطانوی حکومت کی طرف سے زمین کی مدت کے نظم کے سلسلے میں متعارف کرائی گئی نئی قانون سازی نے موپلاؤں کی زرعی برادری کو بری طرح متاثر کیا۔ اس خطے میں روایتی رواج یہ تھا کہ زمین کی خالص پیداوار جینمی (جینمی مدت کے حامل)، کنامدار (کنام مدت کے حامل) اور کاشتکاروں میں برابر تقسیم ہوتی تھی۔ 1792 میں مالابار پر قبضہ کرنے کے بعد، انگریزوں نے زمین کی مدت کے انتظامات کے نظام کو تبدیل کیا اور جینمیوں کو زمین کا مطلق مالک بنا دیا۔ لیکن اونی مٹا (Unni Matta) جیسے موپلا سرداروں نے اس طریقہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ 1800 تک، موپلا کے سربراہوں کی ایک ڈھیلی وفاق بن چکی تھی اور انہوں نے کمپنی کو ایک وارننگ دی۔ اس وفاق کے اصل رہنما اونی مٹا، چیمبن پوکر اتھان گروکل (Chemban Poker, Athan Gurukkal) تھے۔ انہوں نے میسور حکمرانی (مالابار میسور کی حکمرانی کے تحت تھا) کے تحت زمینی جائیداد جمع کر لی تھی۔ جنوری 1800 تک، موپلاؤں نے کھلم کھلا بغاوت کر دی لیکن 1802 تک انہیں دبا دیا گیا۔ تاہم، یہ شورش پوری صدی جاری رہی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ مساجد بغاوت کا مرکز بن گئیں۔ ٹیکس کے بڑھتے ہوئے بوجھ کا نتیجہ زرعی تشدد کی صورت میں نکلا۔ دوسری جگہوں کی طرح یہاں بھی اس کا اظہار مذہبی لبادے کے تحت ہوا۔ فطری طور پر، برطانوی نوآبادیاتی افسران نے بغاوت کو مذہبی جنون کا اظہار قرار دیا۔

تاہم، اپنی مرتب کردہ کتاب، 'مالابار میں کسانوں کے احتجاجات اور بغاوتیں' (*Peasant Protests and Revolts in Malabar*) میں، کے این پنیکر (K.N. Panikkar) لکھتے ہیں:

> انیسویں صدی کے دوران بغاوتوں کی عمومی خصوصیات کا ایک مختصر سروے مذہبی نظریے کے کردار کو واضح کرے گا۔ تقریباً ہر بغاوت نرچہ (*nercha*) جیسی مذہبی تقریب سے شروع ہوئی یا مقامی امام کی جانب سے شہید ہونے کی

ترغیب کی صورت میں شروع ہوئی۔اس دوران،ایک نرچہ (*nercha*)، یعنی ایک موپلا کسان، کو یا تو اس کی زمین سے بے دخل کیا جاتا ہے یا زمیندار کے ذریعے اس کا ناجائز استحصال کیا جاتا ہے اور روزی روٹی کے متبادل ذرائع نہ ہونے کی بنا پر، وہ اپنے زمیندار کو قتل کرنے اور شہید ہونے کے اپنے ارادے کا اعلان کر دیتا ہے۔ مذہبی جنون کے ماحول میں، چند اور لوگ، جو زیادہ تر اسی طرح کی معاشی صورت حال کا شکار تھے، شامل ہونے پر آمادہ ہوئے۔ اپنی بیویوں کو طلاق دینے کے بعد اور شہیدوں کے سفید لباس میں ملبوس وہ اپنے جاگیر داروں کے گھروں کی طرف کوچ کر گئے، انہیں قتل کر دیا اور پھر زمیندار کے گھر یا کسی اور سہولت بخش جگہ مثلاً قریبی مندر میں ایک مقابلے میں موت کو گلے لگانے کا انتظار کیا۔ فرار ہو جانے یا کسی طرح سزا سے بچ جانے یا اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دینے کی کوششیں شاذ و نادر ہی ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ شہادت کے ذریعے جنت کی لذتیں حاصل کرنے کی ان کی خواہش واقعی بہت مضبوط تھی، کسی کافر کو قتل کر کے نہیں بلکہ ایک ظالم جاگیر دار کو قتل کر کے جو کہ ایک کافر بھی تھا۔ جس چیز نے اسے شہید ہونے پر اکسایا وہ کسی کافر کے خلاف کارروائی کر کے دین کی خدمت کرنے کی خواہش نہیں تھی۔ بلکہ یہ فیصلہ اس کے مادی وجود کی حقیقتوں سے مجبور ہو کر لیا جاتا تھا۔ مذہبی آئیڈیل اسے راہ فرار کی طرف لے گیا، ناانصافی کے اس منبع کو مٹانے میں اس کی مدد کی جس نے اس کی زندگی کو دکھی بنا دیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ دوسری دنیا کے لوگوں کے درمیان اپنا مقام بھی یقینی بنایا۔ مذہب نے جو چیز فراہم کی وہ تھی جوازنہ کہ کوئی مقصد۔

14.6 سنتھال بغاوت (Santhal Rebellion)

سنتھال بغاوت نوآبادیاتی حکومت کے دوران سب سے کامیاب قبائلی بغاوتوں میں سے ایک تھی۔ سنتھال قبائلی لوگ تھے۔ وہ اس علاقے میں رہتے تھے جسے آج جھارکھنڈ ریاست کہا جاتا ہے۔ برطانوی دور میں، وہ کٹک، من بھوم، پلاماؤ، ہزاری باغ، اور مدناپور، بنکورا اور بیر بھوم کے کچھ علاقوں میں پائے جاتے تھے۔ وہ اپنے لحاظ سے زندگی گزر بسر کرتے تھے، لیکن انہیں اس وقت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جب نوآبادیاتی حکومت کے ایجنٹوں نے ان کے علاقوں پر حقوق کا دعویٰ کیا۔ وہ راج محل کی پہاڑیوں کے آس پاس کے علاقے کی جانب ہجرت پر مجبور ہوئے۔ انہوں نے وہاں کی زمینیں صاف کیں اور ان پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کیا اور اس علاقے کو دامن کوہ کا نام دیا۔ تاہم ان کی مشکلات ختم نہیں ہوئیں۔ جیسے جیسے زمیندار، ساہوکار اور یورپی سنتھال کی سرزمین میں در آتے گئے، ان کی زندگی کے طور طریقے مکمل طور پر تباہ ہو گئے۔ ان کی غربت اور معصومیت ان کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ساہوکاروں نے انہیں قرضے دیے اور انہیں قرضوں میں ڈوبی غلامی میں دھکیل دیا۔ اس کے نتیجے میں ان میں بڑے پیمانے پر بے چینی پھیل گئی۔ انہوں نے ساہوکاروں کے خلاف بغاوت کر دی، جنہوں نے کھاتوں میں جھوٹ درج کیا، جھوٹی گواہی دی اور سرکاری کلرکوں کو رشوت دی۔ ٹیکس جمع کرنے والوں اور جاگیر داروں نے بے حسی دکھائی اور برطانوی پولیس نے ظلم کیا۔

14.6.1 سدو اور کانو

برہیت (Barhait) نے اس وقت سب کی نظریں اپنی جانب کھینچ لی جہاں اچانک ایک کافی مقدار میں قوت جمع ہو گئی جس نے ہتھیار اٹھا لیے۔ اس تحریک کو جنم دینے والے واقعات بھی اتنے ہی ڈرامائی تھے۔ ایک ورژن کے مطابق، دو بھائیوں، سدو اور کانو، کو اپنے خالق خدا، حیرت انگیز مارنگ برو (Marang Buru)، جو انسانوں کے سامنے کبھی ظاہر نہیں ہوا تھا، کے درشن ہوئے۔ یہ مانا جاتا ہے کہ بھگوان نے دونوں بھائیوں کو چنا، انہیں ایک سفید، خالی کاغذ دیا تھا تاکہ وہ سنتھالوں کو اپنے ظالموں سے بدلہ لینے کے لیے تحریری حکم جاری کریں۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ 30 جون 1855 کو دس ہزار سنتھال گاؤں کے باہر ایک ڈیرے میں جمع ہوئے جہاں سدو اور کانو رہتے تھے۔ انہوں نے بنگالی اور مقامی مہاجنوں کو ختم کرنے اور اپنی حکومت قائم کرنے کے اپنے مقصد کا اعلان کیا۔ سدو کی ہدایت پر کیرتا، بودھو اور سنو نے بھاگلپور کے گورنمنٹ کمشنر، کلکٹر اور مجسٹریٹ، بیر بھوم کے کلکٹر اور مجسٹریٹ اور ان جگہوں پر تعینات داروغاؤں اور کئی زمینداروں کو خطوط لکھے۔ یہ مفاہمت کی آخری باضابطہ کوشش تھی لیکن یہ کامیاب نہیں ہوئی۔

اس کے بعد سنتھال تشدد پر اتر آئے۔ انہوں نے ساہوکاروں اور برطانوی پولیس پر وحشیانہ حملہ کیا۔ اس کے علاوہ، تقریباً 30،000 سنتھالوں نے انفرادی ساہوکاروں اور ٹیکس جمع کرنے والوں کے خلاف کمانوں اور تیروں سے مسلح بغاوت کی۔ بھاگلپور اور راج محل کے درمیان کے علاقوں میں پھیلنے والی بغاوت نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو درحقیقت مفلوج کر دیا۔ جو بات نوٹ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ سنتھالوں کے ساتھ کچھ 'نچلی ذات' کے غیر قبائلی کسان بھی شامل ہو گئے تھے کیونکہ وہ متاثرہ فریق تھے۔ انگریزوں نے اس بغاوت کو بے دردی سے کچل دیا۔ انہوں نے سنتھالوں کے گاؤں کو جلا دیا اور ان میں سے تقریباً 60,000 لوگوں کو مار ڈالا۔ سنتھال بغاوت کی نوعیت کے بارے میں معروف مورخ لکشمی سبرامنین کہتے ہیں کہ 'یہ بغاوت کسی بھی واضح معنی میں نوآبادیاتی یا انگریز مخالف نہیں تھی۔ یہ خاص طور پر بے رحم ساہوکاروں اور ظالم پولیس والوں کے خلاف برپا ہوئی تھی جن کا رویہ بالعموم دشمنی پر مبنی تھا۔ خود برطانوی حکومت کے خلاف بیگانگی کا کوئی احساس کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔'

14.6.2 سنتھالوں کی شکایات کو دور کرنے کے لیے برطانوی اقدامات

انگریزوں نے سنتھالوں کی شکایات کو دور کرنے کے لیے فوری اقدامات اٹھائے۔ سنتھالوں کی آبادی والے علاقوں کو سنتھال پرگنہ، نامی اکائی کے تحت یکجا کیا گیا اور یہ حکم دیا گیا کہ وہاں برطانوی ہندوستان کی عام نوکر شاہی اور عدالتی طریقہ کار لاگو نہیں ہوگا۔ سنتھالوں کے زمینی حقوق کے لیے خصوصی اقدامات کیے گئے اور سنتھالوں کے لیے اپنی زمینیں غیر سنتھالوں کو منتقل کرنا غیر قانونی قرار دیا گیا۔ دُمکا (Dumka)، نیا انتظامی مرکز بن گیا اور سنتھال گاؤں کے سربراہ کو ایک نیا کردار سونپا گیا۔ اس طرح سنتھالوں کو انگریزوں کی محفوظ قبائلی رعایا بنا گیا۔

14.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

آخر میں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزوں کی نئی حکومت نے انیسویں صدی کے اوائل میں دیہی معاشرے میں موجودہ انتظامات کو پوری طرح تتر بتر کر دیا۔ اس کے نتیجے میں کسانوں اور قبائلیوں کی شدید مخالفت سامنے آئی۔ متاثرہ لوگ تشدد کا سہارا لیتے ہوئے غیر ملکی اور مقامی جابروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ مذہب اور قبیلے جیسی ابتدائی شناختوں نے مظلوم لوگوں کو متحد کر دیا۔ اگرچہ ان تحریکوں میں قوم پرستانہ اور طبقاتی شعور نہیں پایا جاتا تھا، لیکن انگریز مخالف کا عنصر واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ مظلوم لوگوں نے بغاوت کی اور انہیں کرنا بھی چاہئے تھا اور جیسا کہ سنتھال بغاوت کی صورت میں ہم نے دیکھا پر تشدد تحریکوں نے بھی بہتر نتائج فراہم کیے۔

14.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

کمپنی کی حکومت: برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج

موپلا: مالابار کی مقامی ملیالی خواتین اور عرب تاجروں کی اولاد

14.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

14.9.1 مختصر ترین جوابی سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. صوبہ بنگال اور بہار سے تمام بیراگیوں اور سنیاسیوں کو ملک بدر کرنے کا اعلان کس نے جاری کیا؟
2. مجنوں شاہ کون تھے؟
3. دو جابر زمینداروں کے نام بتائیں؟
4. مکہ میں تیتو میر کو کس نے متاثر کیا؟
5. کس سال تیتو میر نے خود کو بادشاہ قرار دیا؟
6. فرائضی تحریک کے قائدین کے نام بتائیں۔
7. موپلا کون ہیں؟
8. *Peasant Protests and Revolts in Malabar* کتاب کا مرتب کون ہے؟
9. سنتھال کہاں رہتے تھے؟
10. سنتھال بغاوت کے رہنما کون تھے؟

14.9.2 مختصر جوابی سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سنیاسی اور فقیر بغاوتوں پر ایک نوٹ تحریر کریں۔
2. فرائضی تحریک پر ایک نوٹ تحریر کریں۔
3. موپلا بغاوت پر ایک نوٹ تحریر کریں۔
4. سنتھال بغاوت پر ایک نوٹ تحریر کریں۔
5. کیا آپ کو یہ اکائی پسند آئی؟ اگر ہاں/نہیں، تو کیوں؟

14.9.3 طویل جوابی سوالات (Long Answer Type Questions)

1. برطانوی دور حکومت میں کسانوں اور قبائلی بغاوتوں میں مذہب نے کیا کردار ادا کیا؟
2. کیا پر تشدد تحریکیں ہمیشہ ناکام ہوتی ہیں؟ برطانوی ہندوستان کے کسانوں اور قبائلی بغاوتوں کی مثالوں کے ساتھ بحث کریں۔
3. کیا صرف انگریزوں نے ہی عام ہندوستانیوں کا استحصال کیا؟ مثالوں کے ساتھ بحث کریں۔

14.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
2. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019 (first pub. 2015).
3. Gandhi, Rajmohan, *A History of Modern South India*: *A History from the 17th Century to Our Times*, Aleph Book Company, New Delhi, 2018.
4. Guha, Ranajit, *Elementary Aspects of Peasant Insurgency in Colonial India*, Oxford University Press, Delhi, 1992 (first pub. 1983).
5. Metcalf, Barbara D., and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).
6. Panikkar, K.N. ed., *Peasant Protests and Revolts in Malabar*, Indian Council of Historical Research and People's Publishing House, New Delhi, 1990.
7. Panikkar, K.N., *Against Lord and State*: *Religion and Peasant Uprisings in Malabar*, *1836-1921*, Oxford India Paperbacks, 1993.
8. Ray, Rajat Kanta, *The Felt Community*: *Commonality and Mentality before the Emergence of Indian Nationalism*, Oxford University Press, New Delhi, 2007 (first pub. 2003).

9. Subramanian, Lakshmi, *History of India*, *1707-1857*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.
10. Wilson, Jon, *The Chaos of Empire*: *The British Raj and the Conquest of India*, Public Affairs, New York, 2016.
11. Wood, Conard, *The Moplah Rebellion and Its Genesis*, People's Publishing House, New Delhi, 1987.

اکائی 15۔ اہم کسان اور قبائلی بغاوتیں

(Major Peasant and Tribal Uprisings)

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 کسان اور قبائلی بغاوتوں کی ابتداء

15.3 1857ء سے پہلے کی اہم بغاوتیں

15.3.1 سنیاسی بغاوت

15.3.2 رنگ پور بنگال کی کسان بغاوت

15.3.3 بھیل بغاوت

15.3.4 میسور بغاوت

15.3.5 کول بغاوت

15.3.6 طریقۂ محمدیہ تحریک

15.3.7 فرایضی فسادات

15.3.8 ماپیلا بغاوت

15.3.9 سنتھال بغاوت

15.4 1857ء سے پہلے کی کسان تحریکوں کی نوعیت

15.5 اکتسابی نتائج

15.6 کلیدی الفاظ

15.7 نمونہ امتحانی سوالات

15.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

15.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

15.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
15.8 مزید مطالعہ کے لئے تجویز کردہ کتابیں

15.0 تمہید (Introduction)

اس اکائی میں ہم ان اہم بغاوتوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں گے جو اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی ہندوستان میں مختلف کسانوں اور قبائلی گروہوں نے متعارف کروائی تھیں۔ ان کسان معاشروں کی نوعیت قدامت پسند تھی، اور وہ اپنے معاشروں کی روایتی خصوصیات کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ، ان بغاوتوں کے رہنماؤں نے نوآبادیاتی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے انقلابی طریقے استعمال کیے تھے۔

جب ہندوستانی معاشرے کا طبقۂ اشراف اخلاقی تنقیدوں کا جواب دینے کے واسطے اپنے معاشرے کو بدلنے کے لیے مذہبی اور سماجی اصلاحات شروع کرنے میں مصروف تھا، تو دیہی معاشرہ بالکل مختلف انداز میں نوآبادیاتی حکومت کے نفاذ کا جواب دے رہا تھا۔ اس سلسلے میں، نوآبادیاتی حکومت سے مستفید شہری دانشوروں کے برعکس، روایتی طبقۂ اشراف اور کسان طبقے کا ردعمل مزاحمتی اور انحرافی تھا۔ اس کے نتیجے میں، متعدد مزاحمتوں اور ردعملوں کی بنیاد پر پرانے نظام کو بحال کرنے کی کئی ناکام کوششیں کی گئی۔ ایسا نہیں ہے کہ مغل ہندوستان میں کسان بغاوتیں نہیں ہوئی ہیں۔ دراصل، یہ بغاوتیں اٹھارویں صدی کے پہلے نصف میں اس لئے عام ہوئی تھیں، کیونکہ محصولات کے بڑھتے ہوئے مطالبات نے مغل سمجھوتے کی خلاف ورزی کی اور کسانوں کے اناج کی فراہمی کو متاثر کیا؛ اور مغل صوبائی افسر شاہی اسے جمع کرنے میں پہلے سے زیادہ جابر اور سخت ہو چکی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں یہ رجحان مزید بڑھ گیا کیونکہ نوآبادیاتی حکومت نے اپنی طاقت کو بڑھانے کے لئے محصولات کے تجربات کا ایک سلسلہ قائم کیا، جس کا مقصد ریاستی آمدنی کو بڑھانا تھا۔

15.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- کسانوں اور قبائلی بغاوتوں کے درج ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔
- متعدد کسان اور قبائلی بغاوتیں جو 1857ء سے پہلے شروع ہوئی تھیں۔
- وہ حالات جن کے پس منظر میں یہ بغاوتیں ظاہر ہوئی تھیں۔
- ان بغاوتوں میں عوامی شرکت اور تنظیم بندی کی نوعیت۔
- کمپنی راج کی طرف عوامی ردعمل۔
- کیا 1857ء کی بغاوت ایک الگ تھلگ واقعہ تھا؛ یا اس سے پہلے اسی نوعیت کی کئی احتجاجی تحریکیں واقع ہوئی تھیں؟

15.2 کسان اور قبائلی بغاوتوں کی ابتدا (Origin of Peasant and Tribal Uprisings)

ماقبل نوآبادیاتی ہندوستان میں مغل حکمرانوں اور ان کے اہلکاروں کے خلاف عوامی احتجاج کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ سترہویں اور اٹھارویں صدیوں میں حکمران طبقے کے خلاف کسانوں کی کئی بغاوتیں ہوئیں۔ ریاست کی طرف سے مسرفانہ محصول کی طلب کا نفاذ، بدعنوان طرز عمل اور محصول جمع کرنے والے اہلکاروں کا سخت ترین رویہ ان وجوہات میں سے تھے جنہوں نے کسانوں کو بغاوت پر اکسایا۔ تاہم، ہندوستان میں نوآبادیاتی حکومت کے قیام اور ان کی پالیسیوں کا تباہ کن اثر کسانوں اور قبائلی لوگوں پر ضرور پڑ گیا۔ ہندوستانی معیشت میں متعدد تبدیلیوں جیسے ہندوستانی منڈیوں میں برطانوی تیار کردہ اشیا کا فروغ، ہندوستانی روایتی صنعتوں کی تباہی اور ہندوستان سے انگلستان دولت کی منتقلی نے صورتحال کو مزید خراب کر دیا۔ برطانوی محصولاتی بندوبست، نئے ٹیکسوں کی ادائیگی، کسانوں کی ان کی زمینوں سے بے دخلی، قبائلی زمینوں پر غاصبانہ قبضہ، دیہی معاشرے میں استحصال اور محصول جمع کرنے والوں اور ساہوکاروں کی ترقی سے کسانوں کی مالی حالت پست ہو گئی۔ برطانوی محصولاتی انتظامیہ کی توسیع نے زرعی اور جنگلاتی زمینوں پر قبائلی لوگوں کا قبضہ ختم کر دیا۔ کسانوں اور قبائلی سماج پر ان تبدیلیوں کے مجموعی اثرات بہت تباہ کن ثابت ہوئے۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے کارکنوں کی طرف سے اضافی پیداوار کی تخصیص، ٹیکسوں کے بڑھتے ہوئے بوجھ نے کسانوں کو مکمل طور پر محصولاتی اہلکاروں، تاجروں اور ساہوکاروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ مزید یہ کہ مقامی عدم صنعت کاری کی وجہ سے مزدوروں نے صنعت سے زراعت کی طرف بڑے پیمانے پر نقل مکانی کی۔ چونکہ زرعی پیداوار پر دباؤ کافی بڑھ چکا تھا؛ پھر بھی برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے زراعت کی بہتری کے لئے کوئی خاص قدم نہیں اٹھایا۔ اس کے برعکس، برطانوی معاشی پالیسی نے ہندوستانی کسانوں کو مزید کمزور کر دیا۔ برطانوی قانون اور عدلیہ نے بھی کسانوں کی کوئی مدد نہیں کی۔ انہوں نے حکومت اور اس کے حامیوں جیسے جاگیرداروں، تاجروں اور ساہوکاروں کے مفادات کا تحفظ کیا۔ اس طرح نوآبادیاتی استحصال کا شکار ہو کر اور نوآبادیاتی انتظامیہ کے انصاف سے محروم ہو کر کسانوں نے اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار اٹھا لیے۔ قبائلی عوام کی شکایتیں کسانوں سے مختلف نہیں تھیں؛ لیکن جس چیز نے انہیں سب سے زیادہ پریشان کیا تھا وہ ان کی آزاد سیاست میں بیرونی لوگوں کی مداخلت تھی۔

15.3 1857ء سے پہلے کی اہم کسان بغاوتیں (Peasant Uprisings before 1857)

کسانوں اور قبائلی عوام کی بڑھتی ہوئی بے اطمینانی برطانوی حکومت کے پہلے سو سالوں میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف اوقات میں عوامی بغاوتوں کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ یہ بغاوتیں یا احتجاجی تحریکیں نوآبادیاتی جبر سمیت مختلف قسم کے ظلم اور تشدّد کے مشترکہ تجربات کا نتیجہ تھیں۔ ان بغاوتوں میں سے چند اہم بغاوتوں کا ذکر درج ذیل ہے۔

15.3.1 سنیاسی اور فقیر بغاوت (Sanyasi and Fakir Rebellion, 1763-1800)

اس دور کی کئی کسان تحریکوں میں مذہب نے ایک معقول بنیاد فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا، جس کے اندر کسانوں نے نوآبادیاتی حکمرانی کو سمجھا اور مزاحمت کرنے کا تصور کیا۔ دوسرے الفاظ میں، کسانوں کے مذہب نے احتجاج کے نظریے اور طریقے کی وضاحت کی۔ ان

میں سب سے اولین سنیاسی اور فقیر بغاوت تھی، جس نے 1763 اور 1800 کے درمیان شمالی بنگال اور بہار کے ملحقہ علاقوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بنکیم چندر چٹرجی نے اپنی ناول 'آنند متھ' میں اس بغاوت کا تذکرہ کیا ہے۔

اگرچہ سنیاسی بغاوت میں مذہب نے ایک اچھا خاصا کردار نبھایا تھا، لیکن اصل میں یہ کسان تحریک تھی۔ اس تحریک میں شامل باغی اکثر وہ لوگ تھے جن کو اپنی آبائی زمین سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ تاہم، کسانوں کے بڑھتے ہوئے مشکلات، محصول کی بڑھتی ہوئی طلب اور 1770 کے بنگال کے قحط کی وجہ سے چھوٹے زمیندار، منتشر فوجی اور دیہی غریب بھی سنیاسی اور فقیر بغاوت میں شامل ہو گئے۔

یہ دونوں گروہ کمپنی کے اعلیٰ محصولاتی مطالبات اور تجارتی اجارہ داری سے متاثر ہوئے تھے۔ اسکے بعد ان کی جدوجہد میں 1770 کے قحط کے متاثرین، زمین سے محروم کیے گئے چھوٹے زمیندار، منتشر فوجی اور دیہی علاقوں میں رہنے والے غریب بھی شامل ہو گئے۔ دونوں گروہوں کے درمیان قابل ذکر مذہبی احکامات کی فلسفیانہ وابستگی، ان کے باہمی تعلقات، ان کا تنظیمی ڈھانچہ اور اپنے پیروکاروں کے ساتھ مسلسل رابطے نے باغیوں کو متحرک کرنے میں اچھا کردار نبھایا۔ لیکن جب کمپنی نے مسلح راہبوں کے آوارہ گروہوں کو برداشت نہیں کیا، تو دونوں کے درمیان سیاسی اختلاف شروع ہوا۔ دراصل کمپنی چاہتی تھی کہ سنیاسی کسان مستقل طور پر بنگال میں آباد ہو جائے اور مزاحمت کا سہارا لیے بغیر باقاعدگی سے محصولات ادا کرے۔ چنانچہ 1760 کی دہائی سے لے کر 1800ء تک سنیاسی اور فقیر باغیوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی مسلح افواج کے درمیان بنگال اور بہار کے وسیع علاقے میں تصادم جاری رہا۔ جب یہ بغاوت عروج پر پہنچی تو اس میں حصہ لینے والوں کی تعداد لگ بھگ پچاس ہزار تک پہنچ گئی، جو 1800ء کے بعد کم ہونا شروع ہوا۔ وہ پانچ سے سات ہزار کے گروہوں میں بنگال اور بہار کے مختلف حصوں میں گھومتے رہتے تھے؛ اور دشمن کو شکست دینے کے لئے گوریلا تکنیک کا استعمال کرتے تھے۔ ان کے حملے کا نشانہ امیروں کے اناج کے ذخیرے اور بعد میں سرکاری اہلکار ہوا کرتے تھے۔ وہ مقامی حکومت کے خزانوں کو لوٹتے تھے؛ اور کبھی کبھی لوٹی ہوئی دولت غریبوں میں بانٹ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ، انہوں نے بوگرا اور میمن سنگھ میں آزاد حکومت قائم کی تھی۔

لیکن جلد ہی مشرقی بنگال کے ضلع میمن سنگھ کے شیر پور پرگنہ میں ہندو قبیلوں جیسے گارو، حاجنگ اور ہادیوں کے درمیان ایک نئی مذہبی تحریک شروع ہوئی، جس کی قیادت کریم شاہ اور بعد میں ان کے جانشین ٹیپو شاہ نے کی۔ جب کمپنی کی حکمرانی اس خطے میں مستحکم ہوئی اور زمینداری بندوست نے اپنی جڑیں مضبوط کی؛ تو کسانوں نے غیر جائز ابواب محصول کی وصولی کے خلاف شکایت کا اظہار کیا۔ ایسے حالات میں، 1824 میں ٹیپو کے پاگل پنتھی فرقے نے ایک نئی حکومت قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ نئی تحریک رفتہ رفتہ پورے خطے میں پھیل گئی اور ایک مسلح بغاوت کی شکل اختیار کر گئی، جسے 1833 میں برطانوی فوج نے کچل دیا۔

ان بغاوتوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں طور پر شرکت کی۔ ان تحریکوں کے چند اہم رہنما منجو شاہ، موسیٰ شاہ، بھوانی پاٹھک اور دیبی چودھرانی تھے۔ 1800ء تک پورے بنگال اور بہار میں سنیاسی فقیر باغیوں اور برطانوی افواج کے درمیان مقابلہ ایک معمول بن چکا تھا؛ اور انگریزوں نے باغیوں کو دبانے اور کچلنے کے لیے اپنی طاقت کا پورا استعمال کیا تھا۔

15.3.2 رنگ پور بنگال کی کسان بغاوت (Peasant Uprising of Rangpur, Bengal, 1783)

1757 کے بعد بنگال پر برطانوی تسلط اور متعدد مالگذاری نظاموں کے مختلف تجربات نے عام آدمی کے لیے ناقابل برداشت مشکلات پیدا کئے۔ رنگ پور اور دیناج پور بنگال کے ایسے دو اضلاع تھے جن کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے محصولاتی ٹھیکیداروں کی طرف سے گوناگوں غیر قانونی مطالبات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ محصولاتی ٹھیکیداروں کا سخت رویہ اور ان کی وصولی کسانوں کی زندگی کا معمول بن چکا تھا۔ ایسا ہی ایک محصولاتی ٹھیکیدار رنگ پور اور دیناج پور کا دیبی سنگھ تھا۔ اس نے رنگ پور اور دیناج پور اضلاع کے دیہاتوں میں دہشت کا راج قائم کیا تھا۔ زمینداروں پر محصول بڑھا دیا گیا، جس کا دباؤ خود بخود کاشتکاروں یا کسانوں پر آ گیا۔ کاشتکار دیبی سنگھ اور اس کے اہلکاروں کے بڑھتے ہوئے مطالبات کو پورا کرنے کی حالت میں نہیں تھے۔ دیبی سنگھ اور اس کے آدمی کسانوں اور ان کی عورتوں پر ظلم کرتے تھے، ان کے گھر جلاتے اور ان کی فصلوں کو تباہ کرتے تھے۔ کسانوں نے ابتدائی طور پر کمپنی کی حکومت کو ایک عرضی بھیجی تھی جس میں ان کو مظلوموں کی شکایتیں دور کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ لیکن جب ان کی انصاف کی اپیل پر کوئی توجہ نہ دی گئی تو انہوں نے اپنے آپ کو منظم کیا، اپنا رہنما منتخب کیا، تیر کمانوں اور تلواروں سے لیس ایک بہت بڑی فوج تیار کی، مقامی عدالتوں اور سرکاری اہلکاروں پر حملہ کرنا شروع کیا، اناج کی دکانوں کو لوٹا اور قیدیوں کو زبردستی رہا کیا۔ انہوں نے درجی نارائن (Dirjinarain) کو اپنا رہنما منتخب کیا، موجودہ حکومت کی طرف محصولات کی ادائیگی روک دی اور اپنی حکومت قائم کی۔ انہوں نے بغاوت کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے پیسے جمع کئے۔ اس بغاوت میں دونوں ہندو اور مسلم کسانوں نے کمپنی کے خلاف مزاحمت اور مدافعت کا اظہار کیا۔ باغیوں نے اپنی تحریک کو قانونی حیثیت دینے کی کوشش کی جسے سوگتا بوس نے "ماقبل نوآبادیاتی نظام کی علامت" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ انہوں نے اپنے رہنماؤں کو "نواب" کا خطاب دیا، اپنی حکومت قائم کی اور تحریک کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے لوگوں سے پیسے جمع کئے۔ بالآخر دیبی سنگھ کی اپیل پر وارن ہاسٹنگز کے تحت کمپنی کی حکومت نے بغاوت کو ختم کرنے کے لیے فوج بھیجی۔ تاہم، بغاوت کو ختم کرنے کے بعد مالگذاری نظام میں متعدد اصلاحات کی گئی۔

15.3.3 بھیل بغاوت (The Uprising of the Bhils, 1818-31)

1857ء سے پہلے، ہندوستان میں بعض کسان بغاوتوں میں خصوصی طور پر قبائلی آبادی نے حصہ لیا تھا، جن کی سیاسی خود مختاری اور مقامی وسائل کو برطانوی راج کے قیام اور اس کے غیر قبائلی کارکنوں کی آمد سے خطرہ لاحق تھا۔ مثال کے طور پر، بھیلوں کا مرکز مراٹھا علاقہ خاندیش کے پہاڑی سلسلوں میں واقع تھا۔ 1818 میں جب یہ خطہ برطانوی قبضے میں آ گیا، تو خاندیش کے لوگوں کی اجتماعی زندگی میں خلفشار پیدا ہوا۔ مزید برآں، یہ خیال کیا جاتا تھا کہ باجی راؤ ثانی کے وزیر ترمبک جی نے بھیلوں کو خاندیش پر انگریزوں کے قبضے کے خلاف اکسایا تھا۔ 1819ء میں ایک عام بغاوت ہوئی اور بھیلوں نے کئی چھوٹے گروہوں میں میدانی علاقوں میں بغاوت کے جھنڈے لہرائے تھے۔ انگریزوں کے خلاف بھیل سرداروں کی طرف سے اکثر اسی قسم کی بغاوتیں ہوتی تھیں۔ برطانوی حکومت نے باغیوں کو دبانے کے لیے اپنی فوجی طاقت کا استعمال کیا اور ساتھ ہی مختلف مصالحتی اقدامات کے ذریعے ان پر قابو پانے کی کوشش کی۔ لیکن برطانوی اقدامات بھیلوں کو اپنی طرف لانے میں ناکام ثابت ہوئے۔ یہ صورت حال 1831 تک برقرار رہی، جب پورندھر کے راموشی لیڈر اوماجی راجے کو بالآخر گرفتار کر کے پھانسی

دے دی گئی۔

15.3.4 میسور بغاوت (The Rebellion at Mysore, 1830-31)

ٹیپو سلطان کی آخری شکست کے بعد انگریزوں نے میسور کو وودیار خاندان (Wodeyar Dynasty) کے حوالے کر دیا، اور اس پر نظام عہد معاونت (Subsidiary Alliance) مسلط کر دیا۔ میسور کے حکمران پر کمپنی کے مالی دباؤ نے اسے زمینداروں سے آمدنی کے مطالبات بڑھانے پر مجبور کیا۔ آمدنی کا بڑھتا ہوا بوجھ بالآخر کسانوں اور کاشتکاروں پر پڑا۔ اس کے علاوہ، مقامی اہلکاروں کی رشوت ستانی، بدعنوانی اور بھتہ خوری نے کسانوں کے موجودہ مشکلات میں اضافہ کیا۔ کسانوں کی بڑھتی ہوئی ناراضگی، نفرت اور عدم اطمینان کی وجہ سے میسور کے ناگر صوبے میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ دوسرے صوبوں کے کسان ناگر کے باغی کسانوں میں شامل ہو گئے اور باغی کسانوں نے سردار ملّا، جو کریمسی کے ایک عام کاشتکار کا بیٹا تھا، کو اپنا رہنما منتخب کیا۔ کسانوں نے میسور کے حکمران کے سیاسی اقتدار کا بھی انکار کیا۔ برطانوی فوج نے کسانوں کی زبردست مخالفت کے بعد ناگر کا کنٹرول دوبارہ حاصل کر لیا اور بالآخر ملک کا انتظام انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔

15.3.5 کول بغاوت (The Kol Uprising, 1831-32)

کول بغاوت، ایک اور بڑی قبائلی بغاوت، بہار اور اڑیسہ کے چھوٹا ناگپور اور سنگھ بھوم کے علاقے میں ہوئی تھی۔ سنگھ بھوم کے کولوں نے طویل صدیوں تک اپنے سرداروں کے ماتحت آزاد اقتدار کا لطف اٹھایا تھا۔ انہوں نے چھوٹا ناگپور اور میور بھنج کے راجہ کی طرف سے انہیں محکوم کرنے کی تمام کوششوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا تھا۔ اس علاقے میں برطانوی مداخلت اور کول سرداروں کے دائرہ اختیار پر برطانوی امن و امان قائم کرنے کی کوشش نے قبائلی عوام میں تناؤ پیدا کیا۔ سنگھ بھوم اور پڑوسی علاقوں پر برطانوی قبضے کے نتیجے میں، غیر مقامی لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس علاقے میں آباد ہونے لگی، جس کے نتیجے میں زمین غیر قبائلی لوگوں کی طرف منتقل ہونے لگی۔ قبائلی زمینوں کی منتقلی، تاجروں، ساہوکاروں (عام طور پر جن کو قبائلی لوگ 'سوڈ' کے نام سے پکارتے تھے) اور قبائلی علاقوں میں برطانوی قانون کی آمد نے قبائلی سرداروں کی آزادانہ موروثی طاقت کو للکارا۔ اس سے قبائلی عوام میں شدید ناراضگی پیدا ہوئی اور قبائلی علاقے میں بیرونی لوگوں کے خلاف بغاوتیں شروع ہوئیں۔ یہ بغاوت رانچی، ہزاری باغ، پالاماؤ اور منبھوم تک پھیل گئی۔ حملے کا نشانہ غیر مقامی لوگ تھے، جن کے گھر جلائے گئے اور املاک لوٹ لی گئی۔ لوٹ مار اور آتش زنی کسانوں کے احتجاج اور مزاحمت کے اہم طریقے تھے، جب کہ ہلاکتوں کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی۔

15.3.6 طریقۂ محمدیہ تحریک (The *Tariqah-i-Muhammadiya* Movement, 1831)

انیسویں صدی کے اوائل میں طریقۂ محمدیہ ایک مسلم احیاء پسند تحریک تھی۔ اس تحریک کا مقصد ایسے ضابطۂ حیات کا پرچار کرنا تھا، جس کی وکالت پیغمبر محمد نے کی تھی۔ سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل اس تحریک کے بانی تھے۔ طریقۂ محمدیہ تحریک شمالی ہندوستان میں شروع ہوئی تھی، اور 1820 اور 1830 کی دہائی میں بنگال پہنچ گئی۔ بنگال میں سید احمد رائے بریلوی کے شاگرد تیتو میر نے اس کی قیادت کی۔ ان کے پیروکار بنیادی طور پر غریب مسلمان کسانوں اور بافندہ طبقے سے وابستہ تھے، جن کی شناخت مخصوص لباس اور داڑھی بن چکی تھی۔

چونکہ کسانوں کی اس خود اعتمادی نے موجودہ اقتدار کو للکارا، اس لئے مقامی زمینداروں نے مختلف طریقوں، مثلاً داڑھی پر ٹیکس لگانے سے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ تیتو میر اور ان کے پیروکاروں نے موجودہ سیاسی اقتدار (جس کی نمائندگی مقامی زمیندار، نیل باغبان اور ریاست کر رہی تھی) کی خلاف ورزی کی—انہوں نے خطے میں دہشت پھیلا دی، ٹیکس جمع کرنے شروع کئے اور اپنی حکومت قائم کی۔ لہذا، موجودہ اقتدار کو بالآخر اپنی فوج اور اسلحہ استعمال کرنا پڑا؛ اور 16 نومبر 1831 کو اس کی تحریک کو کچلنے کے لیے ٹیٹو کے بانس کے قلعے کو اڑا دیا گیا۔

15.3.7 فرایضی بغاوت (The Faraizi Rebellion, 1838-51)

فرایضی تحریک اصل میں ایک مقامی تحریک تھی۔ اس فرقے کی بنیاد فرید پور کے حاجی شریعت اللہ نے رکھی تھی۔ اس تحریک نے اسلام کو تمام غیر اسلامی عقائد اور طریقوں سے پاک کر کے قرآن کو ان کا واحد روحانی رہنما قرار دیا۔ اس تحریک کی اہمیت اس کی سماجی جڑوں میں موجود تھی، کیونکہ مشرقی بنگال کے دیہی غریب مسلمان اس مذہبی فرقے کے تحت متحد ہو گئے اور زمینداروں، نیل باغبانوں اور برطانوی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ جب 1839ء میں حاجی شریعت اللہ کا انتقال ہو گیا، تو ان کے بیٹے دودو میاں (Dadu Mian) نے تحریک کی قیادت سنبھالی۔ انہوں نے کسانوں کو ایک مساواتی نظریے کے مطابق متحرک کیا۔ ان کا سادہ طریقۂ تعلیم، یہ نظریہ کہ تمام انسان برابر ہیں، یہ یقین کہ زمین خدا کی ہے اور کسی کو اس پر ٹیکس لگانے کا اختیار نہیں ہے، وغیرہ جیسے اصولوں نے عام کسانوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ فرایضی باغیوں نے فرید پور، بکر گنج، ڈھاکہ، پبنا، ٹیپرا، جیسور اور نوکھالی کے اضلاع میں اپنی حکومت قائم کی، اور کسانوں کے تنازعات کو حل کرنے کے لیے مقامی عدالتیں شروع کی۔ انہوں نے کاشتکاروں کو زمیندار کی زیادتیوں سے بچایا، اور کسانوں کو محصول ادا کرنے سے روکا۔ انہوں نے زمیندار کے گھروں اور عدالتوں پر چھاپہ مارا، اور پنچار (Panch-char) میں ایک نیل فیکٹری کو جلا دیا۔ حکومت نے دودو میاں کو گرفتار کر دیا اور فوجی طاقت کا استعمال کر کے بغاوت کو کچل دیا۔ 1862ء میں دودو میاں کی موت کے بعد اس تحریک میں عارضی طور پر خلل پڑا، لیکن پھر 1870 کی دہائی میں ان کے جانشین نیا میاں (Naya Mian) نے اسے مختلف پیمانے پر دوبارہ بحال کیا۔

15.3.8 ماپیلا بغاوت (The Mappila Uprising, 1836-54)

ماپیلا بغاوت جنوبی ہندوستان کے مالابار علاقے میں 1840 اور 1850 کے دہائیوں کی وہ کسان تحریک تھی جس میں مذہب نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ ماپیلا لوگ ان عرب تاجروں کی نسل تھی، جنہوں نے مقامی نیر (Nair) اور تیار (Tiyar) خواتین سے شادی کی اور اس خطے میں آباد ہوئے تھے۔ بعد میں 1843 کے قانون کے تحت ان کے درجے میں اضافہ ہوا، جس سے ان کے سماجی مسائل مزید بڑھ گئے۔ رفتہ رفتہ ماپیلا لوگوں نے کاشتکاروں، مزدوروں، چھوٹے تاجروں اور ماہی گیروں کا پیشہ اختیار کیا۔ جب انگریزوں نے 1792 میں مالابار پر قبضہ کیا تو انہوں نے زمین پر انفرادی ملکیت کے حقوق قائم کر کے زمینی تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ روایتی نظام نے زمین کی خالص پیداوار کا یکساں حصہ جنمی (جنم کی مدت کا حامل)، کانمدار یا کنا کرن (کنم مدت کا حامل) اور کاشتکار کے درمیان طے کیا تھا۔ برطانوی نظام نے جنمی کو زمین کا مطلق مالک تسلیم کرتے ہوئے کانمداروں اور کاشتکاروں کو زمین سے بے دخل کیا۔ اس کے علاوہ، حد سے زیادہ تشخیص، غیر

قانونی محصول اور عدلیہ اور پولیس کے زمیندار نواز رویے کی وجہ سے، جیسا کہ کے۔ این۔ پینکر لکھتے ہیں کہ، "مالا بار کے کسان زمیندار اور ریاست کی دوہری سزاؤں کی وجہ سے انتہائی تنگدستی میں زندگی بسر کرتے تھے"۔ اس لیے انیسویں صدی کے دوران مالا بار میں مزاحمتی واقعات کا ایک سلسلہ رونما ہوا، جس نے دیہی غریبوں کے ظلم اور استحصال کے خلاف بغاوت کی۔

مذکورۂ بالا زرعی تعلقات کا اہم پہلو یہ تھا کہ عام طور پر اونچی ذات کے جنمی ہندو مذہب سے اور کسان اسلام سے وابستہ تھے۔ اس سماجی سانچے کے اندر، ولیم کوڈ (Veliamkode) کے عمر قاضی، ممبورام کے سید علوی تنگل اور ان کے بیٹے سید فضل پوکویا تنگل اور سید ثناءاللہ مکتی تنگل جیسے روایتی مسلم دانشوروں نے ایک مقبول نظریاتی دائرۂ اختیار کو زندہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا جہاں مذہب اور معاشیات آپس میں مل کر کھلی مزاحمت کی ذہنیت پیدا کریں۔ مساجد متحرک ہونے کا مرکز بن گئیں اور ان کا نشانہ ہندو جنمی، ان کے منادر اور ان کے بچاؤ کے لیے آنے والے برطانوی اہلکار تھے۔ مذہبی رہنماؤں نے سماجی اور مذہبی اصلاحات کے ذریعے ماپیلا لوگوں کی یکجہتی کو مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور ان میں برطانوی مخالف شعور کے ارتقا میں بھی مدد کی۔ بالآخر ماپیلا لوگوں کی بڑھتی ہوئی ناراضگی اور عدم اطمینان ریاست اور جاگیرداروں کے خلاف بغاوت کی شکل اختیار کر گیا۔ 1836 اور 1854 کے درمیان مالا بار میں تقریباً بائیس بغاوتیں ہوئیں۔ ماپیلا بغاوت سے متعلق تین سنگین واقعات وقوع پذیر ہوئے، جیسے اگست 1849 میں منجیری جنوبی مالا بار میں، اگست 1851 میں کولتھور جنوبی مالا بار میں اور جنوری 1852 میں متنور شمالی مالا بار میں۔ بغاوت کو دبانے کے لیے برطانوی مسلح افواج کو تعینات کیا گیا۔ ان جابرانہ اقدامات کے بعد تقریباً بیس سال تک امن قائم رہا، لیکن پھر 1870 میں ماپیلا بغاوت دوبارہ ظاہر ہوئی اور مزاحمتی واقعات نے اسی طرح کی رفتار کو اپنایا۔

15.3.9 سنتھال بغاوت (The Santhal Rebellion, 1855-56)

اس دور کی سب سے مؤثر قبائلی تحریک 56–1855 سنتھال ہول (بغاوت) تھی۔ سنتھال مشرقی ہندوستان میں کٹک، ڈھل بھوم، من بھوم، بارابھوم، چھوٹانا گپور، پالاماؤ، ہزاری باغ، مدناپور، بنکورا اور بیر بھوم کے مختلف اضلاع میں بکھرے ہوئے رہتے تھے۔ بنگال میں زمینداری بندوبست کے مطابق جو زمین صدیوں سے کسانوں کے پاس تھی، اسے زمینداروں کے حوالے کر دیا گیا۔ زمینداروں کے حد سے زیادہ لگان نے ان امن پسند لوگوں کو اپنے آبائی گھر چھوڑنے اور راج محل کی پہاڑیوں سے متصل میدانی علاقوں میں آباد ہونے پر مجبور کیا۔ اپنا وطن چھوڑنے کے بعد انہوں نے راج محل کی پہاڑیوں کے آس پاس کے علاقے کو صاف کیا اور اسے دامن کوہ کا نام دیا۔ انہیں بتدریج ایک مایوس کن صورتحال کی طرف اس وقت دھکیل دیا گیا جب قبائلی زمینیں غیر سنتھال زمینداروں اور ساہوکاروں کو کرایہ یا ٹھیکے پر دی گئی۔ اس کے علاوہ، ان لوگوں کو مقامی پولیس اور ریلوے کی تعمیر میں مصروف یورپی افسران کے ظلم و ستم بھی سہنے پڑھتے تھے۔ غیر مقامی لوگوں (عام طور پر سنتھال غیر مقامی لوگوں کو ڈیکو کہتے تھے) نے ان کی مانوس دنیا کو مکمل طور پر تباہ کر دیا، اور انہیں اپنے کھوئے ہوئے علاقوں پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے کارروائی پر مجبور کر دیا۔ جولائی 1855 میں، جب زمینداروں اور حکومت نے کسانوں کی انتباہ پر توجہ نہ دی، تو کئی ہزار سنتھال باغیوں نے اپنے دشمنوں یعنی زمینداروں، مہاجنوں اور حکومت کی ناپاک تثلیث کے خلاف کھلی بغاوت کا اعلان کیا۔ یہ بغاوت تیزی سے پھیل گئی، یہاں تک کہ بگلپور اور راج محل کے درمیان ایک وسیع علاقے میں کمپنی کی حکمرانی عملی طور پر ختم ہو گئی، جس سے حکومتی

حلقوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ اس مرحلے پر سنتھال باغیوں کی نچلی ذات کے غیر قبائلی کسانوں نے بھی بھرپور مدد کی۔ بالآخر کمپنی حکومت نے مسلح افواج کو متحرک کیا اور سنتھال باغیوں کے متعدد گاؤں کو یکے بعد دیگرے جلا دیا۔ ایک اندازے کے مطابق تیس سے پچاس ہزار باغیوں میں سے پندرہ سے بیس ہزار باغیوں کو بغاوت کے دوران مارا گیا۔ اس لیے مستقبل میں، برطانوی حکومت ان کے بارے میں زیادہ محتاط رہی اور سنتھال آباد علاقوں کو علیحدہ انتظامی اکائیوں یعنی سنتھال پرگنوں میں تقسیم کیا، جس نے ان کی قبائلی ثقافت اور شناخت کے امتیاز کو تسلیم کیا۔ 1856 کے کلکتہ ریویو (*Calcutta Review*) میں ایک ہم عصر مصنف نے سنتھالوں کی حالت کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔ 'زمیندار طبقہ، پولیس، محصولاتی انتظامیہ اور عدالت کے لئے یہ افسوس کی بات ہے کہ انہوں نے بھتہ خوری، جابرانہ وصولی، جائیداد کے زبردستی قبضے، بدسلوکی اور ذاتی تشدد کے ذریعے سنتھال لوگوں پر طرح طرح کے چھوٹے موٹے ظلم و ستم ڈھائے۔'

اسلئے، ساہوکاروں، سوداگروں، زمینداروں اور سرکاری اہلکاروں کے ظلم نے سنتھال لوگوں کو اپنی حفاظت کرنے کے لیے ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ سنتھال لوگوں کے ابتدائی احتجاج اور مظاہرے زمینداروں اور ساہوکاروں کے گھروں کی لوٹ مار تک محدود تھے۔ لیکن جب ان سرگرمیوں کو پولیس اور مقامی اہلکاروں کے ہاتھوں پر تشدد طریقوں سے دبایا گیا، تو سنتھال لوگ باغی بننے پر مجبور ہو گئے۔ باغی سنتھالوں نے سدھو اور کانہو کو اپنے رہنما تسلیم کئے، جن کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ وہ سنتھالوں پر جاری ظلم کو ختم کرنے اور "اچھے پرانے دنوں" کو بحال کرنے کے لیے دیوتاؤں سے بخشش حاصل کر چکے ہیں۔ کئی ہزار سنتھال اپنے روایتی ہتھیاروں (تیر کمان اور کلہاڑیوں) سے لیس ہو کر جمع ہوئے اور زمینداروں اور سرکاری اہلکاروں کو فوری طور پر ظلم بند کرنے کا انتباہ دے دیا۔ انہوں نے اپنی زمینوں پر دوبارہ قابو حاصل کرنے اور اپنی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم، کمپنی حکومت نے سنجیدگی سے اس انتباہ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بالآخر، سنتھالوں کی شکایتیں مقامی حکومت کے اہلکاروں، زمینداروں اور ساہوکاروں کے خلاف کھلی بغاوت کی شکل اختیار کر گئی۔ یہ بغاوت سنتھال پرگنہ میں بہت تیزی سے پھیل گئی۔ نچلی ذات کے غیر سنتھالوں کی بڑی تعداد بھی سنتھالوں کی حمایت میں سامنے آ گئی۔ حکومت اور زمینداروں نے باغیوں پر جوابی حملے شروع کر دیئے۔ بالآخر، سنتھالوں کی جدوجہد برطانوی ہتھیاروں کی برتری کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔

مشرقی ہندوستان کی دیگر اہم قبائلی اور کسان بغاوتوں میں، چوار بغاوت، بشنو پور اور بیر بھوم بغاوت (1799)، سنبل پور بغاوت (1827-40) قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح جنوبی ہندوستان میں 1794 میں وزیانا گرام کے راجہ نے بغاوت کی، 1790 کی دہائی میں تامل ناڈو کے پولیگاروں نے بغاوت کی، انیسویں صدی کی پہلی دہائی کے دوران ساحلی آندھرا میں بغاوت ہوئی، 14-1813 کے دوران پار لیکامیڈی میں بغاوت ہوئی اور 1805 میں ٹراوانکور کے دیوان ویلو تھمپی نے بغاوت کی۔ اس کے علاوہ، 34-1830 میں وشاکھاپٹنم میں، 1835 میں گنجام میں اور 47-1846 میں کرنول میں بغاوتیں ہوئیں۔

مغربی ہندوستان میں سوراشٹر کے سرداروں نے 1816 سے 1832 تک متعدد بغاوتیں کی۔ گجرات کے کولیوں نے بھی 1824 کے دوران ایک بڑی بغاوت کی تھی۔ 31-1818 میں بھیل بغاوت، 1824 میں چناوا کی صدارت میں کتور بغاوت، 1841 میں ستارا

بغاوت اور 1844 میں گدکاری بغاوت مہاراشٹر خطے کی سب سے اہم بغاوتیں تھیں۔ اسی طرح، 17-1814 میں علی گڑھ کے تعلقداروں کی بغاوت اور 1842 میں جبلپور کے بندیلوں کی بغاوت شمالی ہندوستان کی معروف بغاوتیں تھیں۔

الغرض، مجموعی طور پر ان بغاوتوں کی تعداد کافی زیادہ تھی، لیکن پھیلاؤ میں یہ مکمل طور پر مقامی اور ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھیں۔ یہ بغاوتیں مقامی وجوہات اور شکایات کا نتیجہ تھیں، اور ان کے اثرات بھی مقامی تھے۔ وہ اکثر ایک ہی کردار کے حامل تھے اس لئے نہیں کہ وہ قومی یا مشترکہ کوششوں کی نمائندگی کرتے تھے بلکہ اس لئے کہ وہ وقت اور جگہ میں الگ ہونے کے باوجود مشترکہ حالات کی نمائندگی کرتے تھے۔ سماجی، معاشی اور سیاسی لحاظ سے ان بغاوتوں کے نیم جاگیردار رہنماؤں کی سوچ پسماندہ اور روایتی تھی، اور ان کی قیادت شکل، نظریاتی اور ثقافتی لحاظ سے صدیوں پرانی تھیں۔

15.4 1857ء سے پہلے کی کسان تحریکوں کی نوعیت

(Nature of Tribal and Peasant Uprisings Before 1857)

مذکورۂ بالا بیان کی گئی کسان بغاوتیں برصغیر میں ہوئی دیگر بغاوتوں کی ایک طویل فہرست میں زیادہ نمایاں ہیں۔ ان کی اصلیت اور نوعیت کے بارے میں کوئی بھی تعمیم سازی گمراہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ پھر بھی وسیع معنوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نوآبادیاتی دور میں بدلتے ہوئے معاشی تعلقات نے کسانوں کی شکایات میں مزید اضافہ کیا اور ان کی اذیت اور پریشانی ان مختلف بغاوتوں کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ ماقبل نوآبادیاتی دور میں ہندوستانی کسانوں کی معیشت دووقت کی روٹی تک محدود تھی، یا اصول بقاء (Subsistence) پر مبنی تھی۔ جب ماقبل نوآبادیاتی دور میں، ریاستی اہلکاروں نے اضافی پیداوار حاصل کرنے میں ظالمانہ طریقہ یا اسلوب اختیار کیا، تو کسانوں اور مغلوں کے درمیان سمجھوتہ ٹوٹ گیا۔ اس کے نتیجے میں کسانوں کی روزی کی فراہمی متاثر ہوئی، اور بار بار کسان بغاوتیں ظاہر ہوئیں۔ یہی عمل جب نوآبادیاتی محصولاتی نظام نے مضبوط کرنے کی کوشش کی، تو ملک کے بیشتر علاقوں میں کسان بغاوتیں وقوع پذیر ہوئی۔ لیکن نوآبادیاتی زرعی معیشت میں عام طور پر تسلسل سے زیادہ تبدیلی واقع ہوئی۔ اس کے علاوہ، ہندوستانی معیشت کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے جوڑنا اور سرمایہ دارانہ زراعت کو ترقی بخشنے کی نوآبادیاتی کوششوں نے بہت سے معاملات میں زرعی تعلقات پر تباہ کن اثر ڈالا۔ زمین میں مالکانہ حقوق کی تخلیق اور اس کے نتیجے میں زمین حاصل کرنے کی طلب نے روایتی پیداواری تعلقات کو معاہدے سے بدل دیا۔ لین دین اور بیوپاری کی ترقی کی وجہ سے منافع بحیثیت غالب استخراجی عمل نے خراج کی جگہ لے لی۔ لیکن تبدیلی کا عمل کبھی مکمل نہیں ہوا۔ چونکہ خراج اور منافع ساتھ ساتھ جاری رہا، جس کی وجہ سے زرعی تعلقات کے تمام مانوس اصول ٹوٹ گئے۔

راناجیت گوہا لکھتے ہیں کہ نوآبادیاتی حکمرانی کا نتیجہ "زمینداریت کی احیاء" تھی۔ جائیداد کے تعلقات میں تبدیلیوں کی وجہ سے، کسانوں نے اپنی ملکیت کھو دی اور وہ اپنی مرضی سے کاشتکار بن گئے۔ اس طرح، کسانوں کی حیثیت میں کافی تبدیلی آگئی۔ اس کے علاوہ، بدعنوان طرز عمل اور محصول جمع کرنے والے اہلکاروں کے سخت رویوں نے ان کے مشکلاتوں میں اضافہ کیا۔ مزید برآں، برطانوی قانون کے

ذریعے زمینداروں کی طاقت نے کسانوں پر ظلم وجبر بڑھادیا۔ان کی فوجی طاقت کو درحقیقت روکا نہیں گیا تھا؛ بلکہ زمیندار اور داروگا سمجھوتے کے ذریعے استعمال کیا جارہا تھا، جب کہ نئی عدالتوں اور طویل عدالتی عمل نے ان کے جبر کے اختیارات میں مزید اضافہ کیا۔ جاگیرداروں کو ظلم وجبر کے نمائندوں کے طور پر دیکھا جاتا تھا، جنہیں ریاست کی طرف سے تحفظ مل رہا تھا۔اس لیے زمینداروں کے خلاف شکایات اور ناراضگی دراصل انگریزوں کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ زمیندار ہندوستان میں سرمایہ دارانہ کاروبار قائم کرنے کے بجائے لوگوں سے سرمایہ نکالنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، کیونکہ وہ بھی غروب آفتاب قانون کے مسلسل دباؤ اور کمپنی کی زیادہ آمدنی کی طلب سے پریشان ہو چکے تھے۔ بڑھتی ہوئی محصولاتی طلب نے کسانوں کے قرض کی ضرورت میں اضافہ کیا، جس نے دیہی معاشرے میں ساہوکاروں اور تاجروں کی طاقت کو بڑھادیا۔ بالآخر بڑھتے ہوئے قرضے کی وجہ سے کسان اپنی زمین سے محروم ہوگئے۔اس سلسلے میں راناجیت گوہا لکھتے ہیں کہ زمینداروں، ساہوکاروں اور ریاستی انتظامیہ نے کسانوں پر ایک جامع غلبہ قائم کیا تھا۔

قبائلی لوگوں کے پریشان ہونے کی کچھ خاص وجوہات تھیں۔ یہ قبائلی لوگ ہندو کسان معاشروں کے کناروں پر آباد تھے، ثقافتی خود مختاری سے لطف اندوز ہورہے تھے اور مساوات انسانی پر عمل پیرا تھے۔ایک خاص مدت کے دوران، وہ لوگ بتدریج ہندو رسم ورواج سے متاثر ہوگئے۔انہیں رسمی درجہ بندی میں شامل کیا گیا؛اور پھر برطانوی محصولاتی نظام کی توسیع نے ان کی خود مختاری کو مکمل طور پر تباہ کردیا۔ وہ بڑے معاشی گٹھ جوڑ میں شامل کئے گئے، جس کی وجہ سے ان کی زمین غیر قبائلی جابر کارکنوں یعنی زمینداروں اور ساہوکاروں کے ہاتھ میں آگئی۔اور جنگل کے نئے ضوابط ان کے فطری حقوق اور آزادی پر تجاوزات کے طور پر ظاہر ہوئے۔اس طرح برطانوی راج کے مسلط ہونے کے نتیجے میں ان کی طاقت، آزادی اور ثقافت کے خود مختار حلقے ختم ہوگئے۔ لہذا، دخل اندازی کرنے والے بیرونی لوگوں (سوڈاور ڈیکو) کے ذریعے ان کے تصور کردہ سنہرے ماضی کی تباہی سے پر تشدد بغاوتیں ظاہر ہوئی۔

ابتدائی نوآبادیاتی دور کی ان کسان اور قبائلی بغاوتوں کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ کمپنی حکومت ان بغاوتوں کو امن وامان قائم کرنے کے مسئلوں میں شامل کرتی ہے؛اور باغیوں کو تہذیب کے خلاف مزاحمت کرنے والے قدیم اور غیر مہذب لوگوں کے طور پر پیش کرتی ہے۔ باغیوں نے جدیدیت کی علامات جیسے ریلوے، عدالتوں، محصولاتی دفاتر، پلوں، سرکاری ذخائروں، وغیرہ پر حملے کئے۔ یہ حملے اس بات کی نمائندگی کرتے ہیں کہ یہ باغی غیر مہذب تھے اور اس طرح تہذیب اور جدیدیت کے خلاف مزاحمت کرتے تھے۔ بعض اوقات نوآبادیاتی مؤرخوں نے ان باغیوں کو اسکول کے شرارتی بچّوں (جو اسکول میں خلل پیدا کرتے ہیں) کے طور پر پیش کیا ہے، جب وہ (باغی) سمجھتے تھے کہ استاد (نوآبادیاتی ریاست) کا دھیان کچھ لمحوں کے لئے ہٹ چکا ہے۔

بعد میں قوم پرست مؤرخوں نے کسان اور قبائلی تاریخ کو نوآبادیاتی مخالف جدوجہد کے مقاصد پیش کرنے کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے کسان اور قبائلی بغاوتوں کو جدید قوم پرستی کی ماقبل تاریخ کے طور پر پیش کیا ہے۔ ایرک سٹوکس (Eric Stokes) نے ان بغاوتوں کو بنیادی مزاحمت اور روایتی معاشرے کی پر تشدد نافرمانی کے طور پر بیان کیا ہے، جس سے عام طور پر جواب میں نوآبادیاتی حکمرانی کا نفاذ ہو سکتا ہے۔ڈی۔این۔دھنا گرے نے ان بغاوتوں میں سیاسی شعور کا فقدان محسوس کیا، کیونکہ ان میں تنظیم سازی، منصوبہ بندی اور نظریہ کی

کمی تھی۔ دوسری طرف راناجیت گوہا دعوی کرتے ہیں کہ "دیہی عوام کی عسکری تحریکوں میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی، جو سیاسی نہ ہو"۔ ماتحت تاریخ نویسی (Subaltern Historiography) کے پیشوا راناجیت گوہا لکھتے ہیں کہ ابتدائی دور کی قبائلی اور کسان تحریکوں کو جدید قوم پرستی کی ماقبل تاریخ تصوّر نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ، ان کی بھی ایک اپنی تاریخ ہے۔ راناجیت گوہا اور دوسرے ماتحت تاریخ نویسوں کا کہنا ہے کہ متوسط طبقے کے دانشوروں نے انہیں اپنے نمونے یا نقش کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کسان خود اپنے آپ کو منظم کرنے کے قابل تھے اور وہ اپنی شکایات کو بیان کر سکتے تھے۔ راناجیت گوہا استدلال کرتے ہیں کہ دیہی عوام کی قبائلی اور کسان تحریکوں میں کچھ بھی ایسا نہیں تھا جو غیر سیاسی ہو؛ کیونکہ باغی کسان ظلم و جبر کے سیاسی ذرائع سے کافی حد تک باخبر تھے، جس کا مظاہرہ ان کے حملوں کے نشانات سے ہوتا ہے۔

برطانوی حکمرانی کی پہلی صدی کے دوران، بغاوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا تھا، جنہیں کیتھ لین گوہ (Kathleen Gough) نے "بحالی بغاوتوں" کا نام دیا ہے، کیونکہ ان کا آغاز مقامی حکمرانوں، مغل جاگیرداروں زمین سے بے دخل زمینداروں نے کیا تھا۔ زیادہ تر معاملات میں ان بغاوتوں کے رہنماؤں کو مقامی کسانوں کی حمایت حاصل ہوتی تھی، جن کا بنیادی مقصد پرانے نظام کو بحال کرنا، یا موجودہ زرعی تعلقات کو قائم کرنا تھا۔ اس سلسلے میں 81–1778 میں اودھ کے راجہ چیت سنگھ اور دیگر زمینداروں کی بغاوت کا ذکر کیا جا سکتا ہے، اس کے بعد 1799 میں اودھ کے معزول نواب وزیر علی کی بغاوت قابل ذکر ہے۔ یہ خطے 1830 کی دہائی تک سیاسی افراتفری سے متاثر رہے، جو محصول جمع کرنے والے اہلکاروں کے لیے پریشانی کا سبب بن گیا تھا۔ اس کے بعد 1842ء میں بندیلا راجپوت سرداروں کی بغاوت ہوئی، جس نے زرعی پیداوار میں خلل ڈالا اور کچھ سالوں کے لیے خطے میں تجارتی عمل کو متاثر کیا۔ تاہم ان تمام مسلح بغاوتوں کو بالآخر برطانوی فوج نے کچل دیا۔ کچھ معاملات میں ان باغیوں کو بعد میں مزید شرائط کے ساتھ بحال کیا گیا۔ لیکن زیادہ تر، کیتھ لین گوہ کے مطابق، ان بغاوتوں کو برطانوی فوج نے مثالی وحشیانہ طریقوں کے ذریعے قلع قمع کیا۔

متذکرہ بالا بیان کی گئی بغاوتیں غیر سیاسی کارروائیاں نہیں تھیں؛ بلکہ انہوں نے ایک سیاسی عمل تشکیل دی، جس نے کسانوں کے سیاسی شعور کو مختلف طریقوں سے ظاہر کیا۔ جیسا کہ راناجیت گوہا (1994) لکھتے ہیں کہ قبائلی لوگوں اور کسانوں نے دیہی معاشرے میں بیرونی اقتدار کے بارے میں واضح آگاہی ظاہر کی اور اس ڈھانچے کو ختم کرنے کے عزم کا مظاہرہ کیا۔ باغی کسان ظلم و جبر کے سیاسی ذرائع سے بخوبی واقف تھے، جس کا مظاہرہ ان کے حملوں کے نشانات سے ہوتا ہے۔ باغیوں کے حملوں کے نشانات میں زمینداروں کے مکانات، اناج کے ذخائر، ساہوکار، سوداگر اور بالآخر کمپنی حکومت شامل ہیں۔ یہ بغاوتیں، جرائم سے مختلف سیاسی کارروائیاں تھیں، کیونکہ وہ عوام النّاس سے متعلق اور اجتماعی تھیں۔ مثال کے طور پر، سنتھالوں نے بغاوت سے پہلے ہی کمپنی حکومت کو آگاہ اور خبردار کیا تھا، اور رنگپور کے رہنماؤں نے کسانوں پر بغاوت کے لیے محصول بھی عائد کیا تھا۔ اس کے علاوہ، باغیوں کے درمیان عوامی اجتماع، مجلسیں اور منصوبہ بندی ہوا کرتی تھی، جس میں یقینی طور پر صلح و مشورے کی باتیں ہوتی تھی۔ بغاوت سے پہلے باغی شاندار تقریبات منعقد کرتے تھے۔ سنتھالوں نے متعدد دیہاتی علاقوں پر حملہ کرنے سے پہلے انہیں خبردار کیا تھا۔ کسانوں کے ظلم کا سیاسی ذریعہ جان کر، باغیوں نے 1783 میں دیبی سنہا کے خلاف مقامی عدالتوں

پر حملہ کیا۔اسی طرح کولوں نے 1832 میں قبائلی آبادی پر حملہ نہیں کیا، کیونکہ وہ ان کے اتحادی تھے۔مزید برآں،اس تحریک نے اپنی ترقی کے لئے فوری شکایات سے بالاتر مسائل کو شامل کر کے اپنے دائرے کو وسیع کیا، جس سے احتجاجی عمل شروع ہوتی تھی۔

جہاں تک ان کسان بغاوتوں کی قیادت کا تعلق ہے،ان کے رہنما متعلقہ قبیلوں سے ہی وابستہ تھے۔چونکہ یہ رہنما کسان اور قبائلی ثقافتوں سے تعلق رکھتے تھے،اس لیے انہوں نے ان بغاوتوں کو مؤثر قیادت فراہم کی۔اس تحریک میں متعدد طبقوں اور معاشروں نے شرکت کی۔نوآبادیاتی دیہی معاشروں میں طبقاتی،ذات پات، نسلی اور مذہبی گروہوں کے درمیان مختلف درجات کے تناؤ محسوس کئے گئے، جو دیہی علاقوں میں ظلم اور غربت کے پر تشدد حالات سے بیان کیا جاسکتا ہے۔بہت سے معاملات میں مذہب نے غریب طبقوں کے درمیان اتحاد کا رشتہ قائم کیا، کیونکہ قائدین نے مافوق الفطرت ذرائع سے لڑنے کے بعد ایک ہزار سال کی آزادی کا وعدہ کیا۔ماقبل سرمایہ داری معاشروں میں ، جہاں طبقاتی شعور اور طبقاتی نظریہ موجود نہیں تھا، مذہب نے بغاوت کے لیے ایک نظریہ فراہم کیا۔ان رہنماؤں نے بیرونی مداخلت کی وجہ سے اخلاقیات اور حسن عمل کے فقدان کا بھی اظہار خیال کیا ہے۔اس طرح مذہب نے ان کی بغاوتوں کو جواز فراہم کیا۔ایسے مسیحائی انقلاب میں،ان کرشماتی رہنماؤں کو جادوئی یاالہامی طاقت سمجھا جاتا تھا۔اس طرح،ان بغاوتوں کو الہامی اور بعد میں قانونی حیثیت حاصل ہوگئی۔لہذا مذہب نے کسانوں کے رد عمل کو ایک نظریاتی بنیاد اور حوصلہ افزائی بخشی۔جیسا کہ فرایضی بغاوت واضح کرتی ہے کہ کس طرح قایدین ایک طرف اپنے مذہب کے ماضی کی پاکیزگی کی طرف لوٹنے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسری طرف کسانوں کے مسائل کو بھی حل کر رہے تھے۔اس طرح، یہ تصور کہ "ساری زمین خدا کی ہے اور اس میں سب کا برابر کا حصہ ہے" نے مظلوم کسانوں کو مذہب کی حرمت کے لئے متحرک کیا۔

یہ کسان بغاوتیں جدید قوم پرستی سے بھی مختلف تھیں۔ان بغاوتوں کا پھیلاؤ باغیوں کے علاقائی اور نسلی شعور پر بھی منحصر تھا۔یہ بغاوتیں اپنے متعلقہ جغرافیائی علاقوں میں کافی موثر رہی۔لیکن بعض اوقات نسلی تعلقات علاقائی حدود سے باہر نکل گئے، جیسا کہ کول بغاوت میں مختلف خطوں کے کولوں نے بیک وقت بغاوت کی۔بعض اوقات باغیوں کے ذاتی تصورات نے بھی بغاوت کے متعدد واقعات کی حوصلہ افزائی کی۔ماضی بعید میں ایک "سنہری دور" کے تصور میں اکثر تاریخ کا ارتقاء ہوتا ہے۔اس تصوراتی سنہری ماضی کی بحالی کے حصول نے کسانوں کی کارروائی کے لیے ایک نظریہ فراہم کیا، جس کی اہم مثالیں سنتھال اور فرایضی بغاوتیں ہیں۔

متذکرہ بالا بیان کی گئی منظم تحریکوں کے علاوہ،ہندوستان میں برطانوی حکومت کی پہلی صدی میں پر تشدد مسلح بغاوتیں، سماجی ڈاکہ زنی اور لاقانونیت قائم تھی۔درحقیقت، برطانوی حکومت کے خلاف کسان اور قبائلی علاقوں کی بغاوت اور تعاون عارضی تھا، کیونکہ بظاہر شراکت دار اکثر اجنبی حکمرانوں کے لیے عدم اطمینان اور نفرت کے احساس کو پروان چڑھاتے تھے۔مثال کے طور پر کلکتہ کے بھدرلوک، جنہوں نے برطانوی حکومت پر بھروسہ کیا تھا اور باغی کسانوں کی پر جوش تنقید کرتے تھے،نے بھی اس بات کا اقرار کیا تھا کہ وفادار سنتھالوں نے بغیر کسی وجہ کے کمپنی کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے تھے۔اناج کے ہنگامے،بیوپاریوں اور مداخلت پسند برطانوی حکومت کی اجارہ داری کی سرگرمیوں کے خلاف 38–1833 میں مغربی ہندوستان اور دہلی میں مزاحمت ہوئی تھی۔1806 اور 1858 کے درمیان عیسائی مذہب

میں تبدیل ہونے کی دھمکیوں کے خلاف ویلور اور جنوبی ہندوستان میں چاول کے فسادات ہوئے۔ آزادانہ تجارتی سامراجیت اور دستکاری صنعتوں کے زوال کے نتیجے میں 1789 میں کلکتہ میں، 1790 اور 1800 کی دہائیوں میں سورت میں اور 1809 اور 1818 کے درمیان روہیل کھنڈ اور بنارس میں شہری بغاوتیں ہوئیں۔ یہ بغاوتیں ہمیشہ براہ راست نوآبادیاتی نظام کے خلاف نہیں ہوا کرتی تھی، لیکن ان کا تعلق نوآبادیاتی پالیسیوں سے متعلق ضرور ہوتا تھا۔ تاہم، ہندوستان میں کمپنی حکومت کے خلاف ناراضگی اور مزاحمت کا سب سے طاقتور اور ممکنہ طور پر خطرناک رد عمل 1857 کی بغاوت تھی۔

15.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مندرجہ بالا بیان کی گئی کسان اور قبائلی تحریکیں انتہائی مقامی اور الگ تھلگ تھیں۔ یہ بغاوتیں مقامی وجوہات اور شکایات کا نتیجہ تھیں ،اور ان کے اثرات بھی مقامی تھے۔ اگرچہ ان میں سے بہت سی تحریکوں نے نسلی یا مذہبی تعلق سے طاقت حاصل کی، لیکن بعد میں یہ حقیقت خود ایک رکاوٹ بن گئی۔ ان شورشوں اور بغاوتوں کی تنہائی نے اعلیٰ ترتیب کے سیاسی شعور کو مربوط اور مضبوط کرنے میں قومی سطح پر ان تحریکوں کے اثرات کو محدود کر دیا۔ وہ اکثر ایک ہی کردار کے حامل تھے اس لئے نہیں کہ وہ قومی یا مشترکہ کوششوں کی نمائندگی کرتے تھے بلکہ اس لئے کہ وہ وقت اور جگہ میں الگ ہونے کے باوجود مشترکہ حالات کی نمائندگی کرتے تھے۔ سماجی، معاشی اور سیاسی لحاظ سے ان بغاوتوں کے نیم جاگیر دار رہنماؤں کی سوچ پسماندہ اور روایتی تھی، اور ان کی قیادت شکل، نظریاتی اور ثقافتی لحاظ سے صدیوں پرانی تھیں۔ ان شورشوں کی الگ تھلگ نوعیت کے علاوہ، برطانوی مسلح افواج کی تکنیکی برتری، قائم شدہ سماجی نظام اور کمپنی کے انتظامی ڈھانچے نے برطانوی کامیابی کو یقینی بنایا۔ اس کے باوجود، نوآبادیاتی حکومت کے خلاف سب سے پہلی بغاوتوں کے طور پر یہ تحریکیں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس پس منظر میں، 1857 کی بغاوت ایک ایسی تحریک ثابت ہوئی، جس میں کسانوں کی عدم اطمینان کے ساتھ ساتھ برطانوی راج کے خلاف سماج کے کچھ دوسرے طبقات کا بھی رد عمل محسوس کیا گیا۔ اس بغاوت نے نسلی، مذہبی اور ذات پات کی سرحدوں کو پار کرتے ہوئے ہے بیک وقت ہندوستان کے کئی حصوں میں برطانوی راج کو ایک حقیقی چیلنج پیش کیا۔

15.6 کلیدی الفاظ (Key Words)

ڈیکو (Dikus) : یہ وہ نام تھا جو سنتھال باغیوں نے غیر مقامی لوگوں کو دیا تھا۔

سوڈ (Sud) : عام طور پر قبائلی لوگ غیر مقامی تاجروں اور ساہوکاروں کو 'سوڈ' کے نام سے پکارتے تھے۔ ماجھی اور پرگنی: ماجھی اور پرگنی قبائلی سردار تھے۔

جنمی (Janmi) : جنمم کی مدت کا حامل۔ (جنمی ایک اصطلاح ہے جو کیرالا کے زمیندار طبقے کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ انہوں نے وسطی دور میں خطے کے جاگیر دار طبقہ اشراف کے ساتھ ساتھ زمیندار طبقے کی بھی تشکیل دی۔)

کانمداریا کناکرن : کنمم مدت کا حامل۔ (کنمم سابقہ مالابار میں مروجہ زمینوں کی مدّت کے طریقوں میں سے ایک تھا، یا کاشتکاری کی

ایک اہم ترین شکل تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کنم دار نے حقیقی مالک کے مقابلے میں اعلیٰ اختیارات حاصل کر لئے۔

15.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

15.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. آنند مٹھ (*Anandmath*) کس نے لکھی ہے؟
2. سنیاسی اور فقیر بغاوت کی نمایاں خصوصیت کیا تھیں؟
3. سنیاسی اور فقیر بغاوت کے اہم رہنماؤں کے نام بتایئے؟
4. رنگ پور بنگال کی کسان بغاوت کب واقع ہوئی؟
5. سردار مالا کس بغاوت کے رہنما تھے؟
6. فرایضی تحریک کے معروف رہنما حاجی شریعت اللہ کی وفات کب ہوئی؟
7. حاجی شریعت اللہ کی وفات کے بعد فرایضی تحریک کی رہنمائی کس نے کی؟
8. طریقۂ محمدیہ تحریک کب شروع ہوئی؟
9. بھیل بغاوت کے کسی اہم رہنما کا نام بتائے؟
10. کتور بغاوت (1824) کی قیادت کس نے کی؟

15.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. کسان اور قبائلی بغاوتوں کے کیا وجوہات تھے؟
2. کسان اور قبائلی بغاوتوں کے بارے میں راناجیت گوہا کا مؤقف بیان کریں؟
3. فرایضی فسادات پر مختصر نوٹ تحریر کریں؟
4. مغربی اور جنوبی ہندوستان کی معروف بغاوتوں پر روشنی ڈالئے؟
5. سدھو اور کانہو کون تھے؟

15.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ماپیلا بغاوت (1836-54) پر ایک تفصیلی نوٹ تحریر کریں؟
2. 1857ء سے پہلے کی قبائلی اور کسان بغاوتوں کی نوعیت پر بحث کیجئے؟
3. سنتھال بغاوت (1855-56) کے واقعات پر روشنی ڈالئے؟

15.8 مزید مطالعہ کے لئے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. A.R. Desai (ed.), *Peasant Struggles in India*, Oxford University Press, 1979.
2. Bipan Chandra et al., *India's Struggle for Independence*, Penguin Books India, 1988.
3. Grover and Grover, *A New Look at Modern Indian History*, S Chand & Company Limited, New Delhi, 1983.
4. Ishita Banerjee Dube, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, 2014.
5. Ranajit Guha, *Elementary Aspects of Peasant Insurgency in Colonial India*, Duke University Press, 1999.
6. R. Mukherjee, *Awadh in Revolt*, *1857–1858*: *A Study of Popular Resistance*, Oxford University Press Delhi, 1984.
7. S. B. Chaudhuri, *Civil Rebellion in the Indian Mutinies* (*1857-1859*), The World Press Private Ltd., 1957.
8. Sekhar Bandhopadhyay, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman Private Limited, New Delhi, 2004.

اکائی 16۔ 1857 کی بغاوت اور برطانوی حکومت کی طرف منتقلی

(1857 Revolt and Transition to the British Raj)

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 1857 کی بغاوت کی نوعیت

16.3 1857 کی بغاوت کے اسباب

16.3.1 سیاسی اسباب

16.3.2 سماجی و مذہبی اسباب

16.3.3 معاشی اسباب

16.3.4 فوجی اسباب

16.4 1857ء کی جنگ آزادی کے اہم مراکز

16.4.1 شمالی ہند

16.4.2 مرکزی ہندوستان

16.4.3 گجرات میں شورش

16.4.4 دکن میں آزادی کے لیے مزاحمت

16.5 بغاوت کی ناکامی کی وجوہات اور اہمیت

16.6 1857 میں برطانوی حکومت کی تنظیمِ نو

16.7 اکتسابی نتائج

16.8 کلیدی الفاظ

16.9 نمونہ امتحانی سوالات

16.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

16.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
16.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
16.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

16.0 تمہید (Introduction)

انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کے ذریعہ 1857 میں کی جانے والی آزادی کی پہلی کوشش کو مورخین نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں ایک طبقہ اسے مسلح فوجیوں کی بغاوت کہتا ہے تو دوسرا اسے تمام ہندوستانیوں کی شورش گردانتا ہے۔ کچھ انگریزوں نے اسے کٹر مولویوں کی برطانوی حکومت کے خلاف

16.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- 1857 کی بغاوت کی نوعیت سے واقف ہو سکیں گے۔
- بغاوت کے اسباب و وجوہات کو بخوبی جان سکیں گے۔
- بغاوت کے اہم مراکز کی نشان دہی کر سکیں گے۔
- بغاوت کی ناکامی کے وجوہات کا جائزہ لے سکیں گے۔

16.2 1857 کی بغاوت کی نوعیت (Nature of the Revolt of 1857)

1857 کی بغاوت ہندوستان کی تاریخ کا واحد ایسا موضوع ہے جو مورخین کے مابین مسلسل مباحثہ کا سبب بنا ہوا ہے۔ متعدد مورخین نے اس کی نوعیّت پر اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے چند مورخین کی رائے پیش کر کے بغاوت کی نوعیّت سمجھنے کی کوشش کرنا لازمی ہے۔ کے اور میلیسن نے اس بغاوت کو کٹّر مذہبی طبقے بالخصوص مولویوں کی برطانوی حکومت کے خلاف سازش بتانا ہے۔ اس سازش میں ہندوستانی حکمراں طبقہ اپنی حکومتوں کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے شامل ہو گیا تھا۔ مجموعی طور پر وہ اس بغاوت کے لیے مسلمانوں کو مواردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔

- ٹی۔ آر۔ ای۔ ہومس کا خیال ہے کہ فوجی بغاوت سے ہندوستانی حکمراں فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ برطانوی حکومت کے قیام سے انہیں سب سے زیادہ دھکّا پہنچا تھا۔ مسلمان اور برہمن جو بغاوت میں شامل ہوئے اُن کے سیاسی اور مذہبی مفاد کو بھی ٹھیس پہنچی تھی۔ اجمالی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرکاری مورخین بغاوت کی اہمیت کو متعصبانہ طریقے سے کم پیش کر کے اپنی کوتاہیوں کی پردہ پوشی کرتے نظر آتے ہیں۔

- آر۔ سی۔ مجومدار انگریز مورخین کے سُر میں سُر ملاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس بغاوت میں زوال شدہ ہندوستانی حکمرانوں کی شمولیت مرتے دم کی ہچکیوں کے مترادِف تھی۔اس خیال میں تعصب کی بُو آتی ہے، کیونکہ اس دور میں جدید اور جمہوری خیالات کا کوئی تصور نہیں تھا۔ علاوہ ازیں برطانوی حکمراں اپنی تاناشاہی کے ذریعہ اپنی مفاد براری کر رہے تھے۔انہیں ہندوستانیوں کی فلاح کی ذرا پرواہ نہیں تھی۔اس لحاظ سے وہ ہندوستانی حکمرانوں سے بہتر نہیں سمجھے جا سکتے۔
- مذکورہ بالا آراء کے برعکس وی ڈی ساور کر قومی جذبے سے سرشار 1857 کی بغاوت کو 'آزادی کی پہلی جنگ' سے عبارت کرتے ہیں۔
- جوہن ہیرس اس خیال سے اتفاق رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ 1857 کی بغاوت 'آزادی حاصل کرنے کا پہلا زبردست ہیجان تھا۔'
- ایس۔این۔ سین فرماتے ہیں کہ 'کوئی بھی قوم زیادہ عرصے تک غلامی برداشت نہیں کر سکتی۔' باالفاظ دیگر یہ برطانوی حکومت کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی ایک عظیم کوشش تھی۔
- ایس۔پی۔ چودھری اپنی عمیق تحقیق کی بنیاد پر 1857 کی بغاوت کو 'قومی پیمانے پر ایک عظیم اور بے ساختہ مزاحمت' سے تعبیر کرتے ہیں۔ مزید برآں فرماتے ہیں کہ اس طرح کی بغاوتوں میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے، جو اس سے پیشتر بھی چھوٹے پیمانے پر رُونما ہوتی رہی تھیں۔'
- مارکسی نظریات سے متاثر مورخین اس بغاوت کو برطانوی سامراجیت اور سرمایہ داری کے خلاف جہد قرار دیتے ہیں۔ ایم۔این۔ رائے اپنی متناسب رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ 'یہ بغاوت حالاں کہ سیاسی اعتبار سے کسی حد تک آزادی کی پہلی جنگ سمجھی جا سکتی ہے، مگر سماجی اعتبار سے یہ ایک رجعت پسندانہ تحریک تھی۔'
- سر سیّد احمد خاں اس بغاوت کے چشم دید گواہ تھے، انہوں نے اپنی معرکتہ الآراء تصنیف 'اسبابِ بغاوتِ ہند' میں اس موضوع کے ہر پہلو کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے اس تاریخی واقعہ کو ہندوستان کے تمام طبقوں کی ایک عام بغاوت قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کے لیے برطانوی حکومت کی توسیع سلطنت کی پالیسی، ناجائز معاشی انتفاع کے طریقے اور ہندوستان کے مذہبی اور ثقافتی معاملات میں بے جا مداخلت ذمہ دار تھے۔ انہیں اسباب کی بِنا پر میرٹھ کی چھوٹی سی فوجی بغاوت کی چنگاری آناًفاناً پورے ہندوستان میں شعلوں کی طرح بھڑک گئی۔ مزید برآں انگریز مورخین کی رائے کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس بغاوت میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھائی بھی شریک تھے۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے بیشتر مقاموں میں اس کی قیادت کی تھی اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس کی صفائی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ دراصل ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام سے سب سے زیادہ مسلمانوں کو صدمہ اور نقصان پہنچا تھا۔ مذکورہ بالا آراء کے پیش نظر یہ باوثوق طور پر کہا جا سکتا ہے کہ 1857 کی بغاوت درحقیقت تاریخ کا ایک ایسا عظیم واقعہ تھا، جس کے بے حد سنگین اور دوررس نتائج مرتب ہوئے اور ہر طبقے کو متاثر کیا تھا، بالخصوص برطانوی حکومت کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اس کی ناکامی بھی کسی المیے سے کم نہ تھی۔

16.3 1857 کی بغاوت کے اسباب (Causes for the Revolt of 1857)

16.3.1 سیاسی اسباب

میسور ریاست کی بیخ کنی: 1857 میں بنگال کی فتح کے بعد انگریز تاجروں کو ایک ریاستی حکمراں کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ کرناٹک کی جنگوں میں فتحیابی کے بعد انگریزوں کو اپنی فوجی طاقت کا احساس ہو گیا تھا۔ لہٰذا توسیع سلطنت کے لیے گورنر جنرل ویلزلی نے ماتحتی معاہدہ کا طریقہ اختیار کیا۔ دکن میں ٹیپو سلطان انگریزوں کی توسیع سلطنت میں بڑی رُکاوٹ تھا۔ اس نے انگریزوں کو کئی جنگوں میں زبردست ٹکر دی تھی۔ ویلزلی نے جب ٹیپو کے سامنے ماتحتی معاہدہ کی پیش کش کی تو اس نے انکار کر دیا۔ اس پر برانگیختہ ہو کر ویلزلی نے ایک بڑی فوج تیار کر کے نظام حیدرآباد اور مراٹھوں کو اپنے ساتھ ملا کر میسور پر حملہ کر دیا۔ میسور دربار کے غدّار امراء کے ساتھ سازش کر کے 1799ء میں میسور کی جنگ میں ٹیپو سلطان کو شکست دی۔ اس جنگ میں ٹیپو سلطان شہید بھی ہوئے۔ معاشی اعتبار سے کئی مفید علاقوں کو اپنی حکومت میں الحاق کر کے چھوٹی سی ریاست میسور کے پشتینی راجا کے حوالے کر دی۔ اس سے ماتحتی معاہدہ بھی کر لیا۔ اس طرح ایک جرأت منداور بہادر حکمراں ٹیپو سلطان کی انگریزوں نے بیخ کنی کر دی تھی۔ ظاہر ہے کہ انگریزوں کی سفّاکانہ پالیسی سے میسور کے عوام بالخصوص مسلمان بے حد ناراض ہو گئے تھے۔ 1857 کے بے خوف جنگجو احمد اللہ شاہ مدراسی بعد کو احمد اللہ شاہ فیض آبادی ٹیپو سلطان سے بہت متاثر تھے۔

ماتحتی معاہدہ اور نظام حیدرآباد کی ماتحتی: کرناٹک کی جنگوں میں حیدرآباد کے حکمران نظام علی نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا حتیٰ کہ ٹیپو سلطان سے بھی بے اعتنائی برتی تھی۔ ویلزلی نے نظام سے دوستی کو مزید مضبوط کرنے کے بہانے ماتحتی معاہدہ کی پیش کش کی۔ نظام علی نے امراء سے صلاح مشورہ کر کے معاہدے پر دستخط کرنے میں خیریت سمجھی۔ اس معاہدے کے تحت انگریزوں کی نگرانی میں ایک فوج تیار کی گئی، جس کا پورا خرچہ نظام کو برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس کے عوض میں انگریزوں نے نظام کی حکومت کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ امدادی فوج انگریز اپنی دیگر جنگوں میں بھی استعمال کرتے تھے۔ لہٰذا بغیر خرچ کیے انگریزوں کے پاس ایک بڑی فوجی طاقت تیار ہو گئی تھی۔ دربار میں ایک برٹش ریزیڈنٹ رکھا جاتا تھا، جو انگریزوں کے مفاد کی حفاظت کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ دربار کے اندرونی معاملات میں بھی انگریزوں کی دخل اندازی بڑھ گئی۔ نظام کو اپنے وزیر اور جانشیں انگریزوں کی منظوری کے بغیر انتخاب کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ نظام علی کے بعد سکندر جاہ نے انگریزوں کے چُنگل سے نکلنے کی بہت کوشش کی۔ وزیر کا تقرر کئی سال تک التواء میں پڑا رہا۔ آخر کار انگریزوں کی مرضی ہی سے وزیر کا تقرر ہو سکا۔ وزراء میر عالم، منیر الدولہ، سالار جنگ وغیرہ انگریزوں کے وفادار تھے۔ اس طرح خرچہ نظام کا ہو رہا تھا اور فائدہ انگریزوں کا۔ سکندر جاہ کو اپنی مرضی کا جانشین نامزد کرنے کی منظوری نہ دے کر انگریزوں نے کمزور نصیر الدولہ کو جانشین تسلیم کیا۔ نصیر الدولہ کے زمانے میں انگریزوں سے کوئی تکرار نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اول، اس کے دور میں ولیم بینٹنگ نے سیاسی مداخلت کی پالیسی سے گریز کیا تھا۔ دوم، اس نے انگریزوں کے ساتھ امن کی پالیسی اختیار کی تھی۔ نصیر الدولہ نے اپنے جانشین افضال الدولہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ انگریزوں کے ساتھ امن رکھنے ہی میں خیر ہے۔ افضال الدولہ حالاں کہ انگریزوں کو پسند نہیں کرتا تھا، مگر بظاہر انگریزوں سے ملا رہا۔ جب 1857 کی بغاوت ظہور پذیر ہوئی جس کا حیدرآباد پر بھی اثر پڑا تو اس نے درپردہ انقلابیوں کی مدد کی تھی۔ حیدرآباد میں اگر وزیر سر

سالار جنگ نہ ہوتے تو انگریزوں کا خاتمہ یقینی تھا۔ انہوں نے مصلحت انگیزی سے کام لے کر انگریزوں کو حیدرآباد میں محفوظ رکھا۔ اس وفاداری کے عوض انہیں انعام واکرام سے نوازا اور 'سر' کا خطاب بھی عطا کیا۔

دہلی کے بادشاہوں کی تذلیل: 1803ء میں مراٹھوں کی شکست کے بعد ایک طرف تو مراٹھوں کی دیگر ریاستیں ماتحتی معاہدہ کی پابند ہو چکی تھیں۔ دوسری طرف ویلزلی نے دہلی کے مغل بادشاہ کے ساتھ سمجھوتہ کیا تھا۔ 1764ء میں بکسر کی جنگ میں میر قاسم اودھ اور دہلی کے حکمرانوں کی شکست کے بعد سندھیا مغل حکومت کا محافظ مقرر ہوا تھا۔ 1805ء میں شاہ عالم دوم سے معاہدے کے بعد انگریز دہلی کی حکومت کے محافظ بن گئے تھے۔ ماتحتی معاہدہ کے تحت ہندوستان کی تقریباً تمام ریاستیں لارڈ ہسٹینگز کے زمانے میں 1818ء تک کمپنی کی ماتحت ہو چکی تھیں۔ اسی کے ساتھ کمپنی کے حاکموں نے ریاستوں کے اندرونی معاملات میں من مانی دخل اندازی شروع کر دی تھی۔ نتیجے کے طور پر شاہ عالم دوم کی حکومت دلی کی حدود تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ مثل مشہور تھی کہ 'حکومتِ شاہ عالم دِلّی تا پالم۔' شاہ عالم کے جانشین اکبر ثانی نے جب لارڈ ہسٹینگز سے معاہدے کے تحت خراج میں اضافہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تو گورنر جنرل نے بادشاہ کے سامنے کئی نامناسب شرطیں رکھیں۔ اول، بادشاہ کو اپنے تمام خطابات کو خیر باد کرنا ہوگا۔ دوم، نذر پیش کرنے کی رسم ختم کرنی ہوگی۔ سوم، گورنر جنرل کو دربار میں بادشاہ کے برابر مرتبہ دینا ہوگا، جس کے تحت بادشاہ اور گورنر دربار میں ایک ساتھ داخل ہوا کریں گے۔ اکبر ثانی کے ان شرطوں کو منظور کرنے سے انکار کرنے پر گورنر جنرل نے خراج میں اضافے کے معاملے کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا تھا۔ ہسٹینگز کے بعد آخر کار ایمرہسٹ کے زمانے میں اکبر ثانی کو تمام شرطوں کو ماننا پڑا۔ اکبر ثانی نے جب مرزا جہانگیر کو اپنا وارث بنانے کی تجویز رکھی تو گورنر جنرل نے نامنظور کر دی۔ اسی زمانے میں انگریزوں نے خراج کو پنشن کی اصطلاح دے دی تھی۔ اس طرح دہلی کی ماتحتی کے ظاہری گمان کو بھی ختم کر دیا تھا۔

انتہا تو اس وقت ہوئی جب ڈلہوزی نے بہادر شاہ کی دہلی کی حکومت کو سرے سے قلع قمع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اُس نے پہلے مرزا فخر الدین کے سامنے تجویز رکھی کہ اگر وہ لال قلعہ چھوڑ کر مہرولی میں رہائش پذیر ہونے کے لیے تیّار ہو جائیں تو اُن کو جانشیں تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ دراصل انگریز لال قلعہ کو اسلحہ خانہ بنانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ فخر الدین کے انتقال کے بعد مرزا قویش کے سامنے بھی یہی شرطیں رکھی تھیں۔ بہادر شاہ نے انہیں حالات کے پیش نظر پیشین گوئی کر دی تھی کہ اس کے بعد نہ تو بادشاہ رہے گا اور نہ ہی بادشاہت۔ چنانچہ اُن کی پیشین گوئی لفظ بہ لفظ سچ ثابت ہوئی۔ 1857 کی بغاوت کے بعد انگریزوں نے مغلیہ سلطنت کا نام و نشان ہی مٹا دیا۔

واجد علی شاہ کی معزولی: اودھ کے نواب شجاع الدولہ 1764ء میں بکسر کی جنگ میں میر قاسم کی شکست کے بعد ہی سے انگریزوں کی ماتحتی قبول کر چکے تھے۔ ویلزلی نے معاہدے میں مزید شرطوں کا اضافہ کر کے سعادت علی خان کو 1797ء میں نواب بنا دیا تھا۔ اس طرح اودھ کے اندرونی معاملات میں انگریزوں کی مداخلت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ سعادت علی خاں کے انتقال کے بعد انگریزوں نے غازی الدین حیدر کو نواب بنا دیا تھا۔ غازی الدین حیدر بہت مالدار اور فیّاض تھے۔ انگریز اُن سے وقتاً فوقتاً بے تحاشا دولت بطور قرض لیتے رہے۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ولیم بینٹنگ نے ریاستوں میں سیاسی مداخلت سے گریز کیا تھا۔ محمد علی شاہ اور ان کے وزیر مہدی علی خاں گوناگوں انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انہوں نے اودھ ریاست کے نظم و نسق کو چار چاند لگا دیے تھے۔ اس لیے انگریزوں کو مذکورہ بالا

نوابوں کے دور میں دخل اندازی کا کوئی بہانہ نہ مل سکا۔ محمد علی شاہ کے جانشیں امجد علی شاہ نااہل ثابت ہوئے اور ریاست بدحالی کا شکار ہو گئی۔ اس طرح انگریزوں کو ایک بار پھر دخل اندازی کا موقعہ مل گیا۔ امجد علی شاہ کے بعد جب واجد علی شاہ اودھ کے حکمراں بنے تو مذکورہ بالا وجوہات سے ریاست کے حالات ناگفتہ بہ ہو چکے تھے۔ اب ایسا زمانہ آگیا تھا کہ انگریزوں کی دخل اندازی کے سامنے اصل حکمراں بے دست و پا ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ واجد علی شاہ نے حکمرانی سے غیر دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور وہ موسیقی اور رقص و رنگ کی محفلوں میں مست رہنے لگے تھے۔ ڈلہوزی نے توسیع سلطنت کے لیے نئے نئے بہانے تراشے تھے۔ ان میں ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ ماتحت ریاستوں کی بدحالی کو درست کرنا برطانوی حکومت کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ اس اصول کے تحت 1856ء میں واجد علی شاہ کو اودھ کے تخت سے معزول کر دیا۔ انہیں پینشن دے کر کلکتہ مٹیا برج کے علاقے میں رہائش پذیر ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ ڈلہوزی کے اس قدم سے برطانوی حکومت کو بیش بہا دولت کا فائدہ پہنچا۔ ڈلہوزی ملکہ وکٹوریہ کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ کے خادم نے اودھ کا الحاق کر کے برطانوی حکومت کو کروڑوں روپیوں سے مالا مال کر دیا ہے۔"

اصولِ الحاق: مزید توسیع سلطنت کے لیے ڈلہوزی نے ایک اور نیا بہانہ تراشا تھا اور وہ یہ کہ وہ تمام ریاستی حکمراں جن کے اولاد نہیں ہے اور متبنّیٰ بیٹا ہے اسے جانشین نہیں مانا جائے گا۔ اس اصول کے تحت آٹھ ریاستوں کا اپنی حکومت میں الحاق کر لیا۔ اِن ریاستوں میں 1848ء میں ستارا، 1849ء میں جیت پور اور سنبھل پور، 1850ء میں باغت، 1852ء میں اُدے پور، 1853ء میں جھانسی، 1854ء میں ناگپور کا برطانوی حکومت میں الحاق کر لیا۔ اسی اصول کے تحت 1853ء میں پیشوا باجی راؤ دوم کے انتقال کے بعد اُن کے متبنّیٰ بیٹے ناناصاحب کی اسّی ہزار پاؤنڈ سالانہ پینشن بند کر دی گئی اور انہیں کانپور کے قریب بیتھور میں رہائش پذیر ہونا پڑا۔

16.3.2 سماجی و مذہبی اسباب (Social and Religious Causes)

1813ء کے ایکٹ میں برطانوی حکومت نے مذہبی اور سماجی معاملات میں غیر جانبداری کی پالیسی اپنانے کا وعدہ کیا تھا، لیکن دوسری جانب عیسائی مذہب کی نجی مشنریوں کو ہندوستان میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کی اجازت بھی دے دی گئی تھی۔ ایک قانون کے تحت عیسائی مذہب قبول کرنے والے کو اپنے والدین کی جائیداد میں وراثتی حق برقرار رکھا۔ بقول سرسید 1857 کے زمانے میں یورپ سے کئی پادری ہندوستان آئے تھے اور وہ ہندوستان کے مذہبی پیشواؤں سے مجادلے میں مصروفِ کار تھے۔ مسلم علماء اور ہندو بھائی بھی برطانوی حکومت کی مذہبی معاملات میں دخل اندازی کے سخت خلاف تھے۔

ہندو مذہب کے اونچی ذات کے لوگ بھی برطانوی حکومت کی مذہبی مداخلت کی پالیسی سے ناخوش تھے۔ بالخصوص لارڈ ولیم بینٹنگ نے ہندو مذہب کی فرسودہ رسم و رواج پر زبردست وار کیا تھا۔ 1829ء میں ستی کی رسم کو قانون نافذ کر کے جرم قرار دے دیا تھا۔ بعد ازاں قانون پاس کر کے بیواؤں کی دوبارہ شادی کرنا جائز قرار دے دیا۔ لڑکیوں اور میریا بچّوں کی قربانی کا انسداد کیا۔ انگریزی تعلیم کا جب فروغ شروع کیا تو انگریزی زبان کو فارسی کی جگہ سرکاری زبان بنا دیا گیا تھا۔ حالانکہ ان میں کچھ اصلاحیں یقیناً سماجی بہتری کی ضامن ثابت ہوئیں،

لیکن اُس وقت ہندوستانیوں کو ان کے مذہبی اور سماجی معاملات میں دخل اندازی قطعاً پسند نہیں تھی۔ انہیں وجوہات کی بناپر ہندوستان کے مذہبی طبقے بھی پُرجوش طریقے سے بغاوت میں شریک ہوگئے تھے۔

16.3.3 معاشی اسباب (Economic Causes)

مالگزاری بندوبست اور ناجائز انتفاع: مالگزاری بندوبست میں بے جا تبدیلیاں کر کے کسان، زمین دار اور تعلق دار سبھی طبقوں کو ناراض کر دیا تھا۔ بنگال میں فتح کے بعد لارڈ کارنوالس نے سب سے پہلے استمراری بندوبست نافذ کیا۔ اس کے تحت کسانوں کی بجائے زمین داروں سے لگان کا معاہدہ کیا۔ اس طرح کسانوں کی حق تلفی ہوئی۔ تھومس منرو نے استمراری بندوبست کی جگہ رعیّت داری بندوبست اپنایا، جس کے تحت کسانوں کو زمین کا مالک مان کر ان سے براہِ راست لگان وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ بظاہر یہ طریقہ بہتر تھا، مگر انگریز افسر لگان وصول کرنے میں بہت سختی سے پیش آتے تھے اور لگان ادا نہ کرنے کی صورت میں کسانوں کی زمینیں چھین لی جاتی تھیں۔ ولیم بینٹنگ نے لینڈ رِزمپشن ایکٹ پاس کر کے انعامی جاگیریں ضبط کر لی تھیں۔ یہ جاگیریں علمائ، فن کار، شاعر اور ادیبوں کو ان کی مخصوص خدمات کے عوض دی جاتی تھیں۔ اس طرح زمین اور زراعت سے جُڑے تمام طبقوں کو کسی نہ کسی طرح تباہ و برباد کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اِن طبقوں کے لوگ بھی بغاوت میں شامل ہوگئے تھے۔

ابتداء میں اِیسٹ انڈیا کمپنی کو تجارت میں اجارہ داری حاصل تھی۔ ہندوستان کی گھریلو صنعتوں میں تیار شدہ نایاب اشیاء انگلینڈ برآمد کی جاتی تھیں۔ اِن اشیاء میں ڈھاکے کی ململ، ریشم، ہیرے جواہرات وغیرہ شامل تھے۔ اس سے ہندوستان کو بھی فائدہ ہوتا تھا۔ 18، ویں صدی کے آخر میں اور 19، ویں صدی میں انگلینڈ میں صنعتی انقلاب کے ساتھ بہترین اور پائیدار کپڑے اور دیگر اشیاء بننے لگیں۔ لہٰذا 1813ء کے ایکٹ کے ذریعہ کمپنی کی اجارہ داری ختم کر دی گئی اور انگلینڈ کی دیگر نجی کمپنیوں کو آزادانہ تجارت کی اجازت مل گئی۔ اس طرح ہندوستان انگریز تاجروں کے لیے ایک وسیع مارکیٹ بن گیا، جہاں سے سستا کچّا مال برآمد کیا جاتا تھا اور انگلینڈ کی اشیاء کو زیادہ سے زیادہ منافعہ لے کر بیچا جاتا تھا۔ اس طرح ہندوستان کی دولت کا بہاؤ انگلینڈ کی جانب ہو گیا تھا۔ مگر ہندوستان کو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ آزادانہ تجارت کو انگلینڈ کے چند معاشیات کے ماہرین نے مزید بڑھاوا دیا۔ ایڈم اسمتھ کی کتاب 'ویلتھ آف نیشنس' نے آزادانہ تجارت کی وکالت کی تھی۔ بعدازاں جیرمی بینتھم نے ایڈم اسمتھ سے اتفاق کرتے ہوئے اس نظریے کو مزید دلیلوں کے ساتھ جائز قرار دیا۔ بینتھم کے مطابق آزادانہ تجارت سے زیادہ سے زیادہ لوگ فائدے اٹھائیں گے اور زیادہ سے زیادہ خوشحالی آئے گی۔ ظاہر ہے کہ اِن تمام اقدامات سے انگلینڈ تو مالا مال ہو گیا، مگر ہندوستان اقتصادی اعتبار سے مسلسل بدحالی کا شکار ہوا۔ اس طرح برطانوی حکومت کی معاشی پالیسیوں نے ہندوستانیوں کی اقتصادی اعتبار سے کمر توڑ کر رکھ دی تھی، جس کی وجہ سے زراعت اور تجارت سے جُڑے طبقے بغاوت میں شامل ہوگئے تھے۔

16.3.5 فوری سبب (The Immediate Cause)

تنخواہ اور ترقی کے مسئلے: کافی عرصے سے ہندوستانی فوجیوں کو برطانوی حکومت سے شکایتیں تھیں۔ اول ان کی یورپی سپاہیوں کے

مقابلے میں تنخواہیں بہت قلیل تھیں۔ایک ہندوستانی پیدل سپاہی کو صرف سات روپے ماہانہ اور گھوڑ سوار کو صرف 27،روپے ماہانہ ملتے تھے، جس میں گھوڑوں کو پالنے اور دیکھ ریکھ کرنے کا خرچہ بھی شامل ہوتا تھا۔اس کے برعکس یورپی سپاہیوں کی تنخواہیں تین گنی ہوتی تھیں۔علاوہ ازیں بیرونی جنگوں میں بھتّہ ملتا تھاوہ بھی برمااور افغانستان کی جنگوں کے بعد منقطع کر دیا گیا تھا۔ایک ہندوستانی سپاہی کو اونچے عہدے پر ترقی کے لیے بیس سال انتظار کرناپڑتا تھااور وہ بھی صوبیدار کی آسامی سے اوپر ترقی نہیں کر پاتا تھا۔اونچے عہدوں پر صرف یورپی کو فائز کیا جاتا تھا،یہ چلن کارنوالس نے شروع کیا تھا اور یہ برابر جاری رہا۔اُس کو ہندوستانیوں پر بھروسہ نہیں تھا۔مزید برآں یورپی افسر نسلی امتیاز کی بنا پر ہندوستانیوں کے ساتھ نفرت آمیز رویّہ اختیار کرتے تھے،بنگال رجمنٹ میں زیادہ تر سپاہی اونچی ذات کے ہوتے تھے۔ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد تین لاکھ کے قریب تھی،جب کہ یورپی صرف چالیس ہزار تھے۔حقیقت میں برطانوی فتوحات کا افتخار ہندوستانی سپاہیوں کو حاصل تھا، بقول کرسٹوفر ''بیشک ہندوستانی فوجی جسمانی اعتبار سے یورپی کے مقابلے میں لحیم و شحیم اور بہادر ہوتے تھے''اس کے باوجود ان کے ساتھ ہر معاملے میں امتیاز برتا جاتا تھا۔

ہندوستانی فوجیوں پر پابندیاں : علاوہ ازیں ہندوستانی فوجیوں پر انگریز افسروں نے جو پابندیاں عائد کی تھیں ،ان سے ان کے مذہبی جذبات کو بہت ٹھیس پہنچتی تھی۔1857 سے پیشتر یورپی افسروں نے حکم جاری کیا کہ کسی سپاہی کو ٹیکا لگانے، بالی پہننے اور داڑھی رکھنے کی اجازت نہیں ہو گی۔حد تو اس وقت ہوئی جب کہ ولیم بینٹنگ کے زمانے میں کچھ یورپی افسروں نے ہندوستانی سپاہیوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنا شروع کی۔ظاہر ہے یہ بات ناقابل برداشت تھی۔

چربی کے کارتوسوں کے استعمال کا مسئلہ : 1857 کے دوران برطانوی حکومت نے پُرانی توپوں کی جگہ اِنفیلڈ رائفل کا استعمال رائج کیا تھا۔یہ رائفل 1854ء میں کریمیا کی جنگ میں بہت مؤثر ثابت ہوئے تھے۔اس کے استعمال میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا مگر اِن میں جو کارتوس استعمال کیے جاتے تھے،اُن کو بنانے میں سؤر اور گائے کی چربی استعمال کی جاتی تھی۔اِن کارتوسوں کو دانت سے کاٹ کر استعمال کیا جاتا تھا۔ظاہر ہے اس میں ہندو اور مسلمان سپاہیوں کو سخت اعتراض ہوا اور انہیں وجوہات کے باوصف رانی گنج، بارک پور اور بہرام پور کی چھاؤنیوں میں بغاوت ہو چکی تھی۔29، مارچ 1857 کو 34، انفنٹری کے ایک سپاہی منگل پانڈے نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ یورپی افسروں پر حملہ کیا اور قتل کر دیا۔اس بغاوت کے جُرم میں اس کو گرفتار کیا اور پھانسی پر چڑھا دیا تھا۔9، مئی کو عبداللہ نام کے ایک سپاہی نے اپنے فوجی بھائیوں سے خطاب کرتے ہوئے سوال کیا کہ کیا وہ چربی کے کارتوس کا استعمال کرنا برداشت کر سکیں گے ؟اس پر تمام ہندوستانی سپاہی مشتعل ہو گئے تھے۔منگل پانڈے کو پھانسی کے صدمے اور مذکورہ بالا شکایات کے سبب ہندوستانی سپاہیوں نے میرٹھ چھاؤنی میں بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔تقریباً اسّی سپاہیوں کو قید بند کر دیا گیا۔10، مئی کو بالآخر ہندوستانی سپاہیوں نے یورپی افسروں کا قتل کیا اور اپنے بھائیوں کو قید سے آزاد کرایا۔11، مئی کو میرٹھ سے روانہ ہو کر تمام انقلابی دہلی پہنچ گئے۔چربی کے کارتوس کا کمال بہادر شاہ اپنے حسب ذیل شعر میں بیان کرتے ہیں

'نہ ایران نے کیا نہ شاہ روس نے
انگریز کو تباہ کیا کارتوس نے'

16.4 1857ء کی جنگ آزادی کے اہم مراکز

میرٹھ میں ہندوستانی فوجیوں نے 10، مئی 1857 کو بغاوت کا علم بلند کیا، یورپی افسروں کا قتل کیا، اپنے بھائیوں کو قید سے آزاد کرایا اور 11، مئی کو دہلی پہنچے اور بہادر شاہ ظفر سے بغاوت کی قیادت کرنے کی گزارش کی۔ بادشاہ نے انہیں سمجھایا اور برٹش ریزیڈنٹ سے ان کی شکایات کو دُور کرانے کی پیش رفت کی، لیکن انقلابیوں نے ریزیڈنٹ پر گولی چلا دی، وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر فرار ہو گیا۔ بالآخر بادشاہ کو انقلابیوں کے ساتھ بغاوت میں شریک ہونا پڑا۔ بادشاہ کے بغاوت میں شامل ہوتے ہی پورے ہندوستان میں بغاوت کے شعلے بھڑک گئے۔ بادشاہ نے ایک فرمان جاری کیا، جس میں بغاوت کی وجوہات کی وضاحت کی اور ہندو اور مسلمانوں کو متحد ہو کر برطانوی حکومت کو ہندوستان کی زمین سے اکھاڑ پھینکنے کی اپیل کی۔

اسی دوران جنرل بخت خاں جو بریلی میں انگریزی فوج میں صوبیدار کی حیثیت سے متمکن تھے۔ اپنی فوج کے ساتھ دہلی پہنچ گئے۔ دہلی میں انقلابیوں کی ایک مضبوط قیادت کی کمی کو انہوں نے پورا کیا۔ وہ مغلیہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ افغانستان کی جنگ میں برسرِ پیکار رہ چکے تھے۔ بخت خاں نے پہلے بادشاہ سے ملاقات کی اور گزارش کی کہ وہ انہیں مغلیہ فوج کا کمانڈر مقرر کر دیں اور انہیں جنرل کا خطاب عطا کیا جائے۔ بہادر شاہ نے حالات کے پیشِ نظر جنرل بخت خاں کی تمام شرطیں منظور کر کے بغاوت کی قیادت کرنے کے احکام جاری کر دیے۔ انقلابیوں نے بڑی خوش دلی سے جنرل بخت خاں کا خیر مقدم کیا۔ جنرل بخت خاں نے علماء حضرات بالخصوص فضلِ حق خیرآبادی سے جو اس وقت دہلی میں مقیم تھے، برطانوی حکومت کے خلاف فتویٰ جاری کرایا۔ اس طرح بغاوت کے لیے مذہبی جواز بھی حاصل کر لیا۔ بخت خاں نے دوسرا خاص قدم یہ اُٹھایا کہ ہندو بھائیوں کے مذہبی جذبات کا خیال رکھتے ہوئے دہلی میں گئوکشی پر پابندی لگا دی۔ جنرل بخت خاں کی قیادت میں انقلابیوں نے اول انگریزوں کو دہلی سے نکالا اور انگریزی فوج کا تمام حملوں میں بڑی مستعدی سے مقابلہ کرتے رہے اور انہیں دہلی کے اندر داخل نہیں ہونے دیا۔ جب برطانوی فوج دہلی کے کشمیری گیٹ کی جانب سے 19، ستمبر 1857 کو داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی تو برطانوی فوج کے ساتھ انقلابیوں نے زبردست مقابلہ کیا۔ انگریزوں کی فوج بے حد طاقتور تھی، اس لیے انقلابیوں کی شکست ہوئی۔ بہادر شاہ کو ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لینی پڑی۔ جنرل بخت خاں بدایوں اور روہیل کھنڈ ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچ گئے۔ چلتے وقت انہوں نے بادشاہ سے بہت اصرار کیا کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلیں، مگر بادشاہ نے دہلی ہی میں رہنا پسند کیا۔ بخت خاں نے لکھنؤ اور شاہ جہاں پور میں انقلابیوں کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ جب انقلابیوں کو ان مراکز میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا تو وہ نیپال میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ 27، جنوری 1857 کو میجر ولیم ہڈسن نے بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کیا۔ دو ماہ تک اُن پر مقدمہ چلتا رہا۔ بعد ازاں بادشاہ کو عمر قید کی سزا دی گئی اور برما میں رنگون شہر میں بھیج

دیا گیا۔ 7، نومبر 1861ء میں ان کا انتقال ہو گیا، وہیں ان کا مقبرہ ہے۔ بہادر شاہ ظفر کو اپنے وطن ہندوستان کو چھوڑنے کا بہت غم تھا۔ وطن کی محبت میں انہوں نے حسب ذیل شعر کہا تھا:

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے　　دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

ہڈسن نے شہزادوں کا بے رحمانہ قتل کر کے ان کی لاشوں کو کوتوالی کے سامنے والے گیٹ پر لٹکا دیا جو خونی دروازے کے نام سے مشہور ہوا۔

16.4.1 شمالی ہند (North India)

لکھنو (Lucknow): دہلی کے بعد بغاوت کا دوسرا بڑا مرکز لکھنؤ تھا۔ اودھ کا صوبہ چونکہ سیاسی اعتبار سے مرکزی اہمیت کا حامل تھا۔ اس لیے یہاں جو بغاوت ہوئی وہ بڑی فیصلہ کن تھی۔ واجد علی شاہ کی 1856ء میں معزولی کی وجہ سے یہاں کا ہر طبقہ برطانوی حکومت کے خلاف ہو گیا تھا اور بے حد غم و غصے میں تھا۔ 16، مئی کو میرٹھ اور دہلی کی بغاوت کی خبر سُن کر اودھ کے انقلابیوں نے بھی بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ انگریزوں نے بھی احتیاطاً حفاظتی انتظامات کر لیے تھے۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد بیگم حضرت محل واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ نہیں گئی تھیں اور جب بغاوت ہوئی تو انہوں نے بہ نفسِ نفیس انقلابیوں کی سربراہی اختیار کر لی تھی۔ 9، جولائی 1857 کو اپنے نابالغ بیٹے برجیس قدر کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا۔ بندوقوں کی گونج کے ساتھ ان کی تخت نشینی کی گئی اور قائم مقام کی حیثیت سے بیگم حضرت محل نے اودھ کا نظم و نسق درست کیا۔ شرف الدولہ کا وزیر کی اسامی پر تقرر کیا۔ ممو خان کو دیوان اور جے لال سنگھ کو فوج کا کلکٹر بنایا۔ مخصوص شخصیات پر مشتمل ایک کورٹ کی تشکیل کی مگر اختیارات سب اپنے ہاتھ میں رکھے۔ وہ ایک باعزت اور باحُرمت خاتون تھیں۔ ہر وقت حجاب میں رہتی تھیں، ضرورت پڑنے پر حجاب ہی میں رہتے ہوئے جنگ میں شامل ہونے سے گریز نہیں کرتی تھیں۔ ایک شاہی فرمان کے ذریعہ بیگم حضرت محل نے تمام ہندو اور مسلمانوں سے متحد ہو کر بغاوت میں شریک ہونے کی اپیل کی۔ مولانا فضلِ حق خیر آبادی سے مشورہ کر کے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کا فتویٰ جاری کرا دیا تھا۔ اودھ کی ماتحت زمینداریاں مقامی سربراہوں کے تحت کر دی گئیں۔ گورکھپور میں محمد حسن، سلطان پور میں مہدی حسن، سنکر پور میں بیٹی مادھو بخش، نرپت سنگھ کو رؤیا، اُدت نارائن اور مادھو پرساد کو بیر پور دیوی بخش سنگھ اور تین دیگر زمینداروں کو دُھریا کے سربراہ مقرر کیے۔ اِن سب نے متحد ہو کر بیگم حضرت محل کا آزادی کی جنگ میں بھرپور تعاون دیا تھا۔ بالخصوص راجا مان سنگھ اپنے 90، ہزار سپاہیوں کے ساتھ بیگم حضرت محل کے جہاد میں شریک ہو گئے تھے۔ تعلقدار بھی برطانوی حکومت سے ناراض تھے، کیونکہ ڈلہوزی نے تعلقداری بندوبست کو ختم کر دیا تھا اور انہیں ان کی زمینداریوں سے بے دخل کیا تھا اور جو سپاہی اس بغاوت میں شامل تھے وہ بھی زیادہ تر اودھ سے تعلق رکھتے تھے۔

لکھنؤ کے فیض آباد میں سپاہیوں نے 8، جون 1857 کو بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ انہوں نے پہلے خزانہ لوٹا اور جیل کو توڑ کر قیدیوں کو رہا کرایا۔ اسی جیل میں احمد اللہ شاہ فیض آبادی قید بند تھے، وہ انگریزوں کے جانی دشمن تھے، وہ گوریلا وار فئر کے طریقوں کے ماہر تھے۔ ان کو انقلابیوں نے اپنا کمانڈر تسلیم کیا۔ سب سے پہلے انقلابیوں کا انگریزوں سے چِن ہٹ کے مقام پر مقابلہ ہوا، جہاں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ 30، جون کو شہر پر قبضہ کیا، بعد ازاں 2، جولائی کو برٹش ریزیڈنسی کا محاصرہ کیا۔ 6، ہزار سپاہیوں کے علاوہ اس مورچے میں تعلقدار بھی شامل

تھے۔ یورپی کے پاس صرف 1600، فوجی تھے، انقلابیوں نے سب سے پہلے مچھّی بھون کے اسلحہ خانے کو تباہ و برباد کیا۔ یہ محاصرہ 67، دن تک جاری رہا۔ لارنس اپنی فوج کا معائنہ کر کے جیسے ہی اپنے کمرے پر پہنچا ایک گولی دیوار پار کر کے لارنس کو لگی، جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ کلکتہ کی جانب سے ہیولاک فوج لے کر بغاوت کی سرکوبی کے لیے آیا۔ لکھنؤ میں گومتی ندی کا کنارہ پار کر کے برٹش ریزیڈنسی کی جانب رُخ کیا، اس وقت قیصر باغ سے ہیولاک کی فوج پر گولیاں برسنا شروع ہو گئیں۔ لیکن آخر میں حضرت محل کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو وہ 14، مارچ کو بھیروں ہوتے ہوئے بریلی پہنچیں۔ وہاں بغاوت میں شامل ہوئیں، شاہ جہاں پور میں احمد اللہ شاہ کی مدد کی، مراد آباد اور خیر آباد میں انقلابیوں کی مدد کی۔ اِن تمام مراکز میں جب بغاوت ناکام ہو گئیں تو حضرت محل نے نیپال میں نیا کوٹ میں پناہ لی۔ نیپال کے حکمراں نے 1874ء میں ان کے انتقال تک ان کی خبر گیری میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ ملکہ وکٹوریہ نے انہیں خطوط لکھ کر ہندوستان واپس آنے پر اصرار کیا اور اُن کی حفاظت کی ضمانت بھی لی، مگر انہوں نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔ دراصل انہیں انگریزوں پر بالکل بھروسہ نہیں رہا تھا۔ شاہی فرمان اور حکومت کی نئی تنظیم کو وہ ایک ڈھکوسلا مانتی تھیں۔

کانپور (Kanpur): پیشوا باجی راؤ دوم کے مُتبنّیٰ بیٹے پیشوا ناناصاحب کانپور کے پاس بتھور میں رہائش پذیر تھے۔ 1818ء میں پیشوا باجی راؤ دوم کی انگریزوں کے مقابلے میں شکست کے بعد اسّی ہزار پونڈ سالانہ پینشن دے کر انہیں بتھور میں رہائش پذیر کر دیا تھا۔ 1851ء میں پیشوا باجی راؤ کے انتقال کے بعد ان کی تمام جائیداد کے علاوہ ناناصاحب پنشن کے بھی وارث بن گئے تھے۔ جب ڈلہوزی گورنر جنرل بن کر آئے تو اس نے اصولِ الحاق کے تحت ناناصاحب کی پینشن بھی بند کر دی۔ ناناصاحب نے اپنے مقدمے کی وکالت کے لیے عظیم اللہ خاں کی قیادت میں ایک ڈیلی گیشن انگلستان بھیجا۔ عظیم اللہ خاں بہت اچھی انگلش جانتے تھے، لیکن ان کی کوئی دلیل کام نہیں آئی اور وہ ناکام واپس آئے۔ میرٹھ اور دہلی میں بغاوت کی خبر سننے کے بعد کانپور کے انقلابیوں نے ناناصاحب سے بغاوت میں شامل ہونے کے لیے اصرار کیا۔ نانا صاحب جو پہلے ہی سے برطانوی حکومت کے رویے سے ناراض تھے، بغاوت میں فوراً شامل ہو گئے۔ بہادر شاہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا، اُن کی تعظیم میں توپوں کی سلامی بھی دی۔ اس طرح 4، جون 1857 کو کانپور میں بھی بغاوت شروع ہو گئی۔ ناناصاحب کے گھوڑ سواروں نے پہلے نواب گنج پر قبضہ کیا، اس کے بعد جیل پر حملہ کیا، سرکاری عمارتوں اور آفسوں کو لوٹا، سرکاری خزانہ لوٹا، اسلحہ خانے پر قبضہ کیا، لیکن جب سر ہگ ویھلر نے حملہ کیا تو انقلابیوں کے اصرار پر ناناصاحب دہلی کی جانب روانہ ہونے کو تیار ہو گئے تھے، مگر عظیم اللہ خاں نے ترغیب دی کہ وہ دہلی نہ جا کر کانپور ہی کو اپنا مضبوط مرکز بنائیں۔ بعد ازاں ناناصاحب نے کانپور میں اپنی آزاد حکومت کا استحکام کیا۔ جب ہیولاک اپنی فوج کے ساتھ کانپور کی جانب آرہے تھے تو ناناصاحب نے یورپی کا قتلِ عام کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ ہیولاک کی خبر سُن کر ناناصاحب نے گرانڈ ٹرنک روڈ پر جو کانپور سے سات میل دور ہے، اپنا مورچہ جمایا تھا، لیکن برطانوی فوج نے ناناصاحب کو شکست دے دی۔ ناناصاحب پہلے اپنے اہل و عیال کے ساتھ بِتھور گئے۔ 30، جولائی کو لکھنؤ پہنچے، ناناصاحب کے ایک دوسرے ساتھی تانتیا ٹوپے ناناصاحب کی جانب سے برطانوی فوجوں سے اب بھی ٹکر لے رہے تھے۔ یہ مقابلہ دسمبر 1857 تک جاری رہا۔ شکست کے بعد ناناصاحب نے نیپال میں پناہ لی۔ 1857 میں شاہی فرمان کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے ناناصاحب سے ہندوستان واپس آنے کو کہا، ناناصاحب نے حفاظت کی ضمانت چاہی تو رچارڈسن نے جواب دیا کہ حفاظت کی ضمانت

شاہی فرمان ہی میں مُضمر ہے۔اِس کے باوجود نانا صاحب ہندوستان واپس نہیں آئے، کیونکہ انہیں انگریزوں کے قول و فعل پر قطعاً بھروسہ نہیں تھا۔

شاہ جہاں پور (ShahJahanpur): شاہ جہاں پور بغاوت کا ایک اہم مرکز ثابت ہوا۔ یہاں دیگر مراکز کے سربراہ جمع ہو گئے تھے۔ علاوہ ازیں احمد اللہ شاہ فیض آبادی کی شرکت سے یہاں کی بغاوت کو تقویت پہنچی تھی۔ میرٹھ چھاؤنی اور دہلی کی بغاوت کی خبر سنتے ہی 28، ویں پلٹن کے ہندوستانی سپاہی چربی کے کارتوس استعمال کرنے پر بے حد مشتعل ہو گئے۔ چنانچہ گورکھپور کے مولوی سرفراز علی کی سربراہی میں سپاہیوں نے بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ 31، مئی کو یورپی افسروں کا قتل کیا، مولوی سرفراز علی کے شاگرد قدرت علی اور نیاز علی بھی بغاوت میں شامل ہو گئے تھے۔ قرب وجوار کے گاؤں کے لوگ بھی بغاوت میں شامل ہو گئے۔ انقلابیوں نے چینی کی فیکٹری پر حملہ کیا اور متحد ہو کر بڑی بہادری سے برطانوی فوج کا مقابلہ کرتے رہے۔ شاہ جہاں پور میں ایک دوسرا اہم لیڈر کا نزول ہوا اور وہ تھے مولوی احمد اللہ شاہ فیض آبادی۔ اُن سے بغاوت کو بہت تقویت پہنچی تھی۔ انگریز احمد اللہ شاہ سے بے حد خائف رہتے تھے اور گھبراتے تھے۔ وہ گوریلا وار فیئر کے ماہر تھے۔ انہوں نے کئی مقابلوں میں انگریزوں کے چھکّے چھڑا دیے تھے۔ انگریزوں نے ان کے سر پر پچاس ہزار روپے کا انعام تک رکھ دیا تھا، جب 30، اپریل 1857 کو کرنل ہیلے کی سرکردگی میں انگریزی فوجیں شاہ جہاں پور آئیں تو مولوی احمد اللہ شاہ نے بڑی جرأت اور بہادری سے مقابلہ کیا۔ 3، مئی سے 11، مئی تک سخت مقابلہ ہوا، جس میں برطانوی فوج کمزور پڑتی نظر آئی، کولن کیمپ بیل نے فوراً بریگیڈیئر جنرل جوہنسن کو انگریزوں کی مدد کرنے کے لیے شاہ جہاں پور بھیجا۔ مولوی احمد اللہ شاہ نے 11، مئی 1857 کے مقابلے میں جوہنسن کی فوج کو بھی شکست دے دی۔ بعد کو شہزادہ فیروز شاہ اور اودھ کی بیگم حضرت محل بھی شاہ جہاں پور کی بغاوت میں شریک ہو گئے۔ مختلف مراکز کے سربراہوں نے فیصلہ کیا کہ انگریزوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ تیار کیا جائے۔ احمد اللہ شاہ جب شاہجہاں پور کے راجا سے اس ضمن میں صلاح ومشورہ کرنے پہنچے تو اس نے احمد اللہ شاہ کو بندوق کی گولی سے 5، جون 1857 کو ہلاک کر دیا۔ اِسی کے ساتھ انگریز شاہ جہاں پور کی بغاوت کی سرکوبی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

آگرہ (Agra): آگرہ شمال مغربی صوبے کا صدر مقام تھا، یہ دہلی سے صرف 130، میل کی دوری پر ہے۔ چنانچہ بغاوت کی خبر آناً فاناً آگرہ میں 11، مئی کو پہنچ گئی تھی۔ مولوی احمد اللہ شاہ جب آگرہ میں رہائش پذیر تھے، تو انہوں نے پہلے ہی سے برطانوی حکومت کے خلاف ماحول تیار کر دیا تھا۔ آگرہ میں بغاوت کی سربراہی مولوی رحمت اللہ خان نے سنبھالی اور بڑی بہادری سے برطانوی فوج کا مقابلہ کیا۔ انقلابیوں نے دہلی کے بادشاہ کو اپنا قائد تسلیم کر لیا تھا۔ دوران جنگ قرب وجوار کے گاؤں اور قصبات کے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے۔ انقلابیوں نے شاہ گنج تک برطانوی فوج کا پیچھا کیا، تحصیل اور تھانے پر قبضہ کر لیا تھا۔ ماہ جولائی میں نصیر الدولہ کو اپنا حکمراں مان کر آگرے میں حکومت بھی قائم کر لی۔

تھانہ بھون کیرانہ شاملی (Thana Bhawan Kirana Shamli): اس بغاوت کا اثر تھانہ بھون کے کیرانہ اور شاملی قصبات پر بھی پڑا۔ اس بغاوت میں رحمت اللہ اور چودھری عظیم الدین پیش پیش تھے۔ علاوہ ازیں علماء بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ رشید

احمد گنگوہی، مولانا قاسم نانوتوی نے بغاوت کی قیادت کی تھی، حتیٰ کہ تھانہ بھون میں ایک آزاد حکومت بھی قائم کر لی۔ آخر کار کالِون نے برطانوی فوج کو از سر نو تیار کر کے حملہ کیا، کچھ لوگ بچ کر بھاگ گئے، کچھ کو گرفتار کر لیا گیا، مولانا قاسم نانوتوی کسی طرح بچ کر بھاگ گئے۔ بعد کو انہوں نے دار العلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی۔

روہیل کھنڈ (Rohil Khand): روہیل کھنڈ اور فرخ آباد کی ریاستیں اودھ کے نواب سعادت علی خان نے 1801ء میں ویلزلی سے ماتحتی معاہدہ کے معاہدے کے تحت برطانوی حکومت کو عطا کر دی تھیں۔ بریلی برطانوی حکومت کا صدر مقام تھا، جہاں برطانوی فوج کی تین پلٹنیں تعینات تھیں، ہندوستانی سپاہی کیپٹن میکنزی کے برتاؤ سے بہت ناراض تھے، بغاوت کی خبر سن کر 31، مئی 1857 کو 18ویں اور 68ویں پلٹنوں کے ہندوستانی سپاہیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ میکینزی نے یورپی افسروں کے ساتھ نینی تال میں جا کر پناہ لی۔ اس بغاوت کی کمان حافظ رحمت خان کے پوتے چیف جسٹس خان بہادر خان نے سنبھالی تھی۔ جنرل بخت خان کے توسط سے انہیں دہلی کے بادشاہ کی طرف سے نائب گورنر کا خطاب ملا تھا۔ بادشاہ نے انہیں روہیل کھنڈ کا نواب مقرر کر دیا تھا۔ انتظام الدولہ کا خطاب بھی عطا کیا گیا۔ بڑی تعداد میں ہندو اور مسلمان شامل ہو گئے تھے۔ نکاٹیا کے مقام پر بہادر خان نے اپنی فوج کے ساتھ برطانوی فوج کا بڑی جرأت اور بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن آخر میں انقلابیوں کی شکست ہوئی، خان بہادر پہلے پیلی بھیت گئے، پھر لکھنؤ گئے، بعد کو گھوڑے پر سے گر کر زخمی ہو گئے اور گرفتار کر لیے گئے، مقدمہ چلایا گیا، جس میں انہوں نے بڑے فخر سے کہا کہ ہندوستان ہمارا ہے اور عوام انگریزوں سے بیزار ہیں۔ مقدمے کے بعد ان کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

مرادآباد (Moradabad): مرادآباد کے ضلع میں سب سے پہلے امروہہ میں بغاوت شروع ہوئی، سید گلزار علی نے دہلی کے بادشاہ سے نائب کا خطاب حاصل کر کے انقلابیوں کی قیادت کی۔ اس کے بعد مرادآباد میں 28ویں پلٹن کے ہندوستانی سپاہیوں نے 3، جون 1857 کو بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ اس بغاوت میں ہندو مسلمان اور قرب و جوار کے گاؤں اور قصبات کے لوگ بھی شامل ہو گئے۔ جون 1857 کو امروہہ کی جنگ میں برطانوی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے انقلابیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

بدایوں (Badayun): بدایوں کے انقلابیوں کے سربراہ عبدالرحمن اور فصاحت اللہ تھے۔ وزیر خاں نے بغاوت کی قیادت سنبھالی تھی۔ 27، اپریل کو ککرولہ کی جنگ میں شکست ہوئی۔ آخری دور میں رام نرائن نے اسلام نگر میں انگریزوں کا مقابلہ کیا، مگر شکست ہوئی۔

بجنور (Bijnor): بجنور میں بغاوت کی خبر 19، مئی 1857 کو پہنچی۔ اسی کے ساتھ وہاں بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت شروع ہو گئی، نجیب آباد کے نواب محمود خان نے اس بغاوت کی کمان سنبھالی تھی، بغاوت میں مسلمانوں کے علاوہ گوجر، بنجارے، میواتی، جاٹ اور چوہان شامل تھے۔ ان سب نے مل کر تحصیل کو لوٹا اور انگریز افسروں کا قتل کیا۔ سرسید احمد خان وہاں جج کی حیثیت سے مقیم تھے، انہوں نے چند یورپی افسروں کی جان بھی بچائی۔ انگریزوں کے جانے کے بعد نواب محمود خاں نے بجنور میں حکومت کا نظم و نسق درست کیا، ایک فرمان جاری

کیا، جس میں تحریر تھا کہ ''عوام اللہ کے بندے، ملک بادشاہ کا اور احکام نواب محمود خاں کے''۔ 21، اپریل 1857 تک انقلابی انگریزوں کے حملوں کا مقابلہ کرتے رہے، جب جوہنس نے ایک بھاری فوج لے کر حملہ کیا تو انقلابیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

الہ آباد (Allahabad): میرٹھ اور دلی کی بغاوت کی خبر جب الہ آباد پہنچی تو وہاں کے ہندو مسلمان تعلقدار اور کسانوں نے لیاقت علی کی سربراہی میں بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ ہندوؤں کے لیڈر رامچندر نے بھرپور تعاون دیا۔ لیاقت علی خاں نے اپنا صدر مقام خسرو باغ کو بنایا تھا۔ یہ خبر سن کر کیپٹن نیل 11، جون کو بنارس ہوتے ہوئے 12، جون کو الہ آباد کی باہری آبادی داراؤ گنج پر بمبارڈمنٹ کر دیا اور انقلابیوں کو وہاں سے تتر بتر کر دیا۔ اس کے بعد نیل نے خسرو باغ پر حملہ کیا، مولوی لیاقت علی نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، حالات کے پیش نظر کانپور جانے کا فیصلہ کیا۔ 18، جون تک نیل نے الہ آباد کے انقلابیوں کو شکست دے دی تھی۔

پٹنہ (Patna): پٹنہ میں مولوی علی کریم نے جہادی تحریک کی سربراہی کی تھی۔ لکھنؤ کے کتابوں کے تاجر پیر علی نے اس بغاوت میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ 3، جون 1857 کو پیر علی نے 200، مسلمان پیروکاروں کے ساتھ بغاوت کا آغاز کیا۔ کچھ عرصے تک یہ جہد جاری رہی۔ بالآخر گرفتار ہوئے، انگریزوں نے ان پر مقدمہ چلا کر صادق پوری علماء کے گھر میں قید بند کر دیا۔

متھرا (Mathura): 30، مئی 1857 کو متھرا کے محافظ فوجیوں نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ انگریز خزانے کی گاڑیاں بھر کر آگرہ لے جا رہے تھے۔ ہندوستانی فوجیوں نے انہیں اجازت نہیں دی۔ گولیاں چلا کر برٹن کو مار دیا۔ سرکاری آفسوں اور عمارتوں کو لوٹا اور جلا دیا۔ یورپی نے کسی نہ کسی طرح جان بچا کر آگرہ میں پناہ لی۔ انقلابی اپنے ساتھیوں کو قید سے چھڑا کر دِلّی کی جانب چلے گئے۔

فرخ آباد (Farrukhabad): 1801ء کے ماتحتی معاہدہ کے معاہدے کے بعد فرخ آباد برطانوی سلطنت کا حصہ بن گیا تھا۔ نواب تفضل حسین خاں کو دو لاکھ آٹھ ہزار روپے سالانہ پینشن مقرر کر دی گئی تھی۔ یہاں بغاوت کے خدشے سے کرنل اسمتھ نے اپنی جان بچا کر فتح پور کے قلعہ میں پناہ لے لی تھی۔ 41، ویں پلٹن کے سپاہی بھی بغاوت میں شامل ہو گئے۔ انقلابیوں نے نواب تفضل حسین کو اپنا قائد منتخب کر کے فتح گڑھ کے قلعے پر حملہ کر دیا۔ جب انقلابی قلعے میں داخل ہونے سے قاصر رہے تو انہوں نے قلعہ میں آگ لگا دی۔ کرنل اسمتھ کو جب کامیابی کی امید نہیں رہی تو یورپی عورتوں، مردوں اور بچوں کے ساتھ ایک ناؤ میں بیٹھ کر ندی پار کر کے آگرہ جانے لگے۔ انقلابیوں نے اس ناؤ پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ ان میں بڑی تعداد ہلاک ہوئی، کچھ کو گرفتار کر کے نواب صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ نواب صاحب نے انہیں گولیاں مار کر ہلاک کرنے کا حکم دے دیا۔ بعد کو یورپی فوجیوں نے فروخ آباد پر زبردست حملہ کیا۔ انقلابیوں کو شکست ہوئی، نواب تفضل حسین خاں اور ان کے بھائی گرفتار ہوئے، نواب صاحب کو حجاز روانہ کر دیا گیا اور ان کے بھائی کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔

اٹاوہ (Etawah): 19، مئی 1857 کو اٹاوہ اور جسونت نگر میں بھی بغاوت شروع ہو گئی۔ ضلع اٹاوہ میں ایلن او کٹیوین ہیوم کلکٹر تھے۔ انہوں نے اٹاوہ میں سماجی اصلاحات کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ایک انگلش ہائی اسکول بھی قائم کیا تھا، جسونت نگر میں جب ہیوم بغاوت

کی روک تھام کے لیے پہنچے تو انقلابی انہیں بھی قتل کرنا چاہتے تھے۔ ہیوم کسی نہ کسی طرح بچ کر اٹاوہ آگئے، ہیوم کو خبر ملی تھی کہ دیگر مقاموں سے بھی انقلابی آرہے ہیں، تاج خان بغاوت کے لیڈر تھے۔ 24، مئی 1857 کو گوالیار کی فوج کی مدد سے اٹاوہ پر دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد بھی برطانوی فوج اور انقلابیوں کے مابین جھڑپیں ہوئیں۔ آخر کار انگریزوں نے 10، دسمبر 1857 تک اٹاوہ پر پوری طرح قابو پالیا۔

بستی: بستی میں 5، جون 1857 کو بغاوت شروع ہوئی۔ گورکھپور کے محمد حسن انقلابیوں کے سربراہ تھے۔ 5، جنوری 1857 کو جب گورکھپور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو بستی کے انقلابی امروہہ چلے گئے اور وہاں بغاوت میں حصہ لیا۔ امروہہ کی جنگ میں زبردست مقابلہ ہوا تھا۔

جونپور (Jaunpur): 5، جون 1857 کو جونپور میں انگریزوں کی پالیسی کی وجہ سے پرانے زمیندار ناراض تھے۔ یہ لوگ بھی بغاوت میں شامل ہوئے۔ اس بندوبست کی قیادت ارادت جہاں کے سپرد کی گئی۔ فصاحت جہاں اس کے دوسرے لیڈر تھے۔ 27، ستمبر 1857 کو کرنل روبن نے اپنی فوج کے ساتھ انقلابیوں سے مقابلہ کیا۔ بعد کو ارادت جہاں اور فصاحت جہاں کو گرفتار کر کے پھانسی کی سزا دی گئی۔

اعظم گڑھ (Azamgarh): اعظم گڑھ میں منصب علی نے انقلابیوں کی سربراہی کی۔ کُرمی راجا بینی پرشاد بھی اس بغاوت میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن اکتوبر کے وسط تک انگریز اس بغاوت کو بھی دبانے میں کامیاب ہو گئے۔ 3، جون 1857 کو اعظم گڑھ میں ہندوستانی فوج کے سپاہیوں نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ پلور کا سردار پرتھوی پال سنگھ بھاری فوج لے کر شمال مغربی شہر میں داخل ہوا۔ نظام آباد ساگری کی تحصیل کو تباہ و برباد کیا، کوئل سنگھ جو انگریزوں کا وفادار تھا، وہ بھی پرتھوی پال سنگھ کے ساتھ شامل ہو گیا۔ گھوسی اور سکندر پور کے پرانے جاگیرداروں نے اپنی جاگیروں پر قبضہ کیا۔ محمود آباد تحصیل میں جو مئو اور مبارک پور دیوگاؤں اور چڑیا کوٹ کے کسانوں میں انگریزوں کے خلاف غبار تھا وہ بھی شامل ہو گئے۔ کوئلہ اور اترولی کے راجپوت جو اپنی بہادری اور سرکشی کے لیے مشہور ہیں وہ بھی شامل ہو گئے۔ اترولی کے کُرمی راجا کے بھائی جے پال اعظم گڑھ پر اپنا حق جماتے تھے تو وہ بھی انقلابیوں کے ساتھ بغاوت میں پیش پیش ہو گئے۔ 21، جولائی کو مادھو پرشاد نے پلوار پر حملہ کر دیا۔ مظفر جہاں نے جون کے آخر میں ماہول تحصیل پر قبضہ کر لیا تھا۔ قرب وجوار کے گاؤں کے لوگوں نے نیل کی فیکٹری کو لوٹا۔ لکھنؤ کے انقلابیوں کی حکومت نے کُرمی راجا بینی مادھو کو اعظم گڑھ اور جونپور کا ناظم مقرر کر دیا تھا۔ 20، ستمبر 1857 کو کیپٹن بوائے لیو کی سربراہی میں گورکھوں کی پلٹن سے مندودری گاؤں کے مقام پر بینی مادھو نبرد آزما ہوئے۔ ناکامی کے پیش نظر وہاں سے فرار ہو گئے۔ 4، نومبر کو انقلابیوں نے ایک بار پھر اعظم گڑھ پر حملہ کیا۔ گورکھا فوج اس حملے پر قابو نہ پا سکی۔ اترولی پر انقلابیوں کا 10، نومبر تک قبضہ رہا۔ وہاں سے مختلف علاقوں میں انقلابی فرار ہو گئے۔ بغاوت کی لہر غازی پور تک پھیل گئی۔ جگدیش پور میں کنور سنگھ نے بغاوت کی۔ اس بغاوت نے شاہ آباد کو بھی متاثر کیا۔ سید پور تحصیل میں بھی انگریزوں کے خلاف غصہ تھا۔ وہاں کے لوگ بھی بغاوت میں شامل ہو گئے۔ جگدیش پور کے انقلابی آخر کار انگریزوں سے مقابلے میں پست ہو گئے اور وہاں سے فرار ہو گئے۔ پٹنہ میں زمیندار جن کی جاگیریں انگریزوں نے ہڑپ کر لی تھیں، اپنی جاگیریں حاصل کرنے کے لئے بغاوت میں شامل ہو گئے تھے۔ آخر کار جنرل ڈوکلاس کی سرکردگی میں اکتوبر 1857 کو

انگریزوں نے اعظم گڑھ پر قبضہ کر لیا۔اس طرح اعظم گڑھ کی بغاوت دب گئی۔

سیتاپور(Sitapur): سیتاپور کے خیر آباد کے بخشی ہر پرساد نے بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ محصول میں بندہ حسین، چہلاری کا راجا رانک وار، محمود آباد کا راجا نواب علی خان،ان سب نے مل کر انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔اکتوبر 1857 کو بریگیڈیئر مارکر سے انقلابیوں کا سخت مقابلہ ہوا، مگر شکست ہوئی۔

16.4.2 مرکزی ہندوستان (Central India)

مندیسر(Mandisar): وسطی ہندوستان میں بغاوت کے ضمن میں دو مراکز قابل ذکر ہیں : اوّل مندیسر اور دوم جھانسی۔ مرکزی ہندستان (مدھیہ پردیش) میں زیادہ تر صوبوں میں مراٹھوں کی حکومت تھی۔ یہ صوبے ماتحتی معاہدہ کے معاہدے کی تحت انگریزوں کے ماتحت تھے۔ لکشمی بائی کے علاوہ وسطی ہند کی تمام ریاستوں کے راجا برطانوی حکومت کے وفادار تھے۔ وسطی ہند میں پرنس فیروز شاہ اور لکشمی بائی انقلابیوں کے عظیم رہنما بن کر ابھرے تھے۔

فیروز شاہ مغل خاندان کے چشم وچراغ تھے۔1856ء میں حج کرنے گئے تھے۔1857 میں جب حج کر کے واپس آئے تو بغاوت کا آغاز ہو چکا تھا۔ پہلے وہ اِندور گئے، وہاں جب گرفتاری کا خطرہ لاحق ہوا تو وہ گوالیار چلے گئے۔ دھیرے دھیرے بغاوت کی آگ پورے مشرقی مالوہ میں پھیل چکی تھی۔انقلابیوں نے مندیسر پر قبضہ کر لیا تھا۔انہوں نے فیروز شاہ کو مندیسر کا کمانڈر انچیف مقرر کر دیا۔ فیروز شاہ نے ایک پُر اثر فرمان جاری کیا، جس میں تمام ہندو اور مسلمانوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ متحد ہو کر برطانوی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔اس میں ایک تنبیہ بھی کی گئی تھی کہ جو سردار اور ریاستی حکمراں بغاوت میں شامل ہوں گے، انہیں بادشاہ کی طرف سے انعام واکرام سے نوازا جائے گا اور جو اس حکم کی نافرمانی کریں گے، انہیں سخت سزائیں دی جائیں گی۔ یہ سن کر مغل شاہی خاندان کا رُکن بغاوت کی قیادت کر رہا ہے، تمام ہندو اور مسلمان پُر جوش طریقے سے بغاوت میں شریک ہو گئے۔ ادھر ریاست کے راجا اور وزیر نے زبردست طریقے سے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ میواتی، مکرانی اور افغانی بھی فیروز شاہ کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ مندیسر کے نواسیوں نے فیروز شاہ کو اپنا حکمراں تسلیم کر لیا تھا۔ فیروز شاہ نے ایک نامور شخص مرزا جی کو اپنا وزیر منتخب کیا تھا۔اس طرح فیروز شاہ نے پورے وسطی ہند میں بغاوت کی زبردست مہم چلائی تھی۔ گوالیار کے راجا سندھیا کو بھی بغاوت میں شریک ہونے کے لیے کہا مگر وہ شریک نہیں ہوئے اور نہ ہی کوئی مدد پہنچائی۔ عرصے تک فیروز شاہ اپنے فوج کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کرتے رہے، مگر جب انہوں نے دیکھا کہ کامیابی ناممکن ہے تو شہزادہ فیروز شاہ گوالیار دھولپور، آگرہ اور فروخ آباد ہوتے ہوئے اپنے انقلابیوں کے ساتھ دہلی پہنچے، لیکن جب شہزادے نے دیکھا کہ انقلابی دہلی سے نکل کے جا رہے ہیں تو وہ متھرا گئے اور پھر لکھنؤ پہنچے۔ نومبر 1857 میں روہیل کھنڈ میں بیگم حضرت محل کے معاون بن کر انگریزوں سے برسرپیکار ہوئے، انگریزوں کے لکھنؤ میں قبضے کے بعد شاہ جہاں پور میں احمد اللہ شاہ کے ساتھ انگریزوں سے جنگ لڑی۔ احمد اللہ شاہ کے قتل اور شکست ہونے کے بعد تانیتا ٹوپے کی مدد کی، وہاں سے وہ کعبہ شریف روانہ ہو گئے، کئی مسلم ممالک میں پناہ کے لیے گھومتے رہے۔آخر کار محض 45، سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

جھانسی (Jhansi): جھانسی جو اس وقت وسطی ہند کی مراٹھی ریاست تھا، گنگا دھر رائے جھانسی کے حکمراں تھے۔ 1853ء میں انتقال کے بعد ان کی بیوی رانی لکشمی بائی جھانسی کی حکمراں بنی تھیں۔ گنگا دھر راؤ کا کوئی بالغ جانشیں نہیں تھا۔ ڈلہوزی جب گورنر جنرل بن کر آئے تو انہوں نے توسیع سلطنت کا ایک نیا بہانہ تراشا، 'اصول الحاق' یعنی جس حکمراں کا اصل جانشیں نہیں ہوگا اس کی ریاست کو برطانوی حکومت میں براہ راست ملا لیا جائے گا۔ لکشمی بائی کی جھانسی کی حکومت کو اس اصول کے تحت دیگر ریاستوں کے ساتھ برطانوی حکومت میں ملا لیا گیا۔ لکشمی بائی کو ڈلہوزی کا یہ ناجائز طریقہ بے حد ناگوار لگا تھا اور وہ بے حد ناراض ہوئیں۔ لہٰذا انہوں نے ہندو مسلمانوں کو متحد کر کے 7، جون 1857 کو انگریز افسروں پر حملہ کر دیا اور انہیں جھانسی سے نکال کر اپنی حکومت قائم کی، جھانسی کے قلعہ پر اپنا جھنڈا لہرایا۔ رانی لکشمی بائی کی اس مہم میں بالخصوص رسالدار کالے خاں، تحصیلدار محمد حسین اور حکیم صالح نے جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ حکیم صالح نے انگریزوں سے کہا کہ اگر وہ پُرامن طریقے سے خود کو سپرد کر دیں تو ان کی جانیں بخشی جا سکتی ہیں۔ انگریزوں نے اپنے تمام ہتھیاروں کے ساتھ خود کو سپرد کر دیا۔ مگر کچھ پُرجوش انقلابیوں نے انہیں تہہ تیغ کر دیا۔ بعد کو برطانوی حکومت نے فوجیں بھیجیں، مہارانی کی سربراہی میں زبردست جنگ ہوئی، لکشمی بائی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر قلعہ سے فرار ہوتے وقت گھوڑے سے گر کر زخمی ہو گئیں اور اُن کو گرفتار کر لیا اور شہید کر دیا گیا۔

اِندور (Indore): اِندور یشونت رائے ہولکر کی ریاست تھی۔ بغاوت سے کچھ پہلے مارتنڈ راؤ ہولکر اِندور کے راجا بنے تھے۔ 2، جون 1849ء میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اُن کے مُتبنّیٰ بیٹے تُکوجی راؤ ہولکر 8، مارچ 1852ء کو بالغ ہوئے اور ریاست کی حکمرانی براہِ راست اپنے ہاتھ میں لی۔ جون 1857 کے دوسرے ہفتے میں گوالیار فوج کی پلٹن کے ہندوستانی فوجیوں نے بغاوت کر دی۔ تُکوجی برطانوی حکومت کے وفادار تھے۔ انقلابیوں نے ایک متّحدہ محاذ تیار کیا تھا، جس میں جھانسی کی رانی پیشوا ناناصاحب، اِندور کے سعادت خاں، شہزادہ فیروز شاہ وغیرہ شامل تھے۔ سعادت خاں رسالدار ہولکر کے بخشی حافظ کا بھتیجا تھا۔ سعادت خاں کے فوجیوں سے اچھے مراسم تھے۔ بھوپال میں وارث محمد خاں سے بھی گُفت وشنید جاری تھی، اِندور کے ہندوستانی جتّھے کی مدد سے برٹش ریزیڈنسی پر حملہ کر دیا۔ بھوپال کی سکندر بیگم کو بغاوت میں شامل ہونے کے لیے اصرار کیا، مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اِندور کے وارث علی اور سعادت خاں کے بھائی سردار خاں بھی انقلابیوں کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ مہیدپور پلٹن کے افسر شیخ رحمت اللہ بھی اس بغاوت میں شامل ہو گئے۔ سعادت خاں گوالیار کے راجا سندھیا سے ملاقات کرنے گئے مگر انہوں نے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ انقلابیوں نے مہاراج سے اپنی تنخواہیں ادا کرنے کی مانگ کی۔ منع کرنے کی صورت میں انقلابیوں نے بزورِ طاقت خزانہ لوٹ کر اپنی تنخواہیں حاصل کر لیں۔ انگریزوں نے اِندور کا آفس اور خزانہ مئو میں منتقل کرنے کا ارادہ کیا۔ یکم جولائی 1857 کو اِندور کی برٹش ریزیڈنسی پر انقلابیوں نے حملہ کر دیا، 59، انگریزوں کو تہہِ تیغ کیا، سعادت خاں نے سندھیا کے محل پر حملہ کیا، جہاں وہ گرفتار ہو گئے لیکن امن قائم رکھنے کے معاہدے پر انہیں چھوڑ دیا گیا۔ ایک بار پھر سعادت خاں نے انقلابیوں کے ساتھ برٹش ریزیڈنسی پر حملہ کیا اور اِندور سے انگریزوں کی حکومت اُکھاڑ پھینکی۔ یکم اگست کو دہلی جا کر باشاہ سے ملے۔ ڈورنڈ سنٹرل انڈیا کے ایجنٹ تھے، وہ مئو کے قلعے میں جا کر چھُپ گئے تھے، انقلابی جب کمزور پڑے تو ڈورنڈ نے تکوجی راؤ ہولکر سے انقلابیوں کو سزا دینے کی مانگ کی۔ چنانچہ 9، انقلابیوں کے ہتھیار چھین لیے گئے۔ 147، گھوڑ سوار اور 95، پیدل فوجیوں کو تاعمر قید کی سزا دی گئی۔ اس طرح اِندور کی بغاوت دبا دی گئی۔

دھار (Dhar): دھار ایک چھوٹی سی ریاست تھی، جس کا جسونت راؤ پوار راجا تھا۔ 31، اگست 1857 کو عرب، افغان اور مکرانیوں کی مدد سے گل خان نے بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ گل خاں نے 31، اگست 1857 کو انقلابیوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے ایک نعرہ بلند کیا، 'ہمارا مذہب خطرے میں ہے'۔ 31، اگست کو آنند راؤ کو قلعہ میں بلایا، مگر وہ نہیں آئے۔ 2، ستمبر 1857 کو آخر مہارانی ریجینٹ نے انقلابیوں سے معاہدہ کر لیا، طے پایا کہ وہ انگریزوں کو نہیں ماریں گے۔ اس وقت تک انقلابیوں کی طاقت کافی بڑھ چکی تھی۔ لہٰذا انہوں نے ایک بار پھر بغاوت کا علم بلند کر دیا، سرکاری آفسوں کو لوٹا اور برباد کیا۔ انگریزوں کی فوج 22، اکتوبر کو دھر میں داخل ہوئی، قلعے کے باہر زبردست مقابلہ ہوا۔ انقلابیوں کو شہر کے اندر اور قلعے میں پناہ لینی پڑی۔ پانچ سو انقلابی کسی خفیہ راستے سے بچ کر فرار ہو گئے۔ ایک بڑی تعداد کو قید کر لیا گیا۔ اس کے بعد، امجھیرا، میہد پور، مانپور اور سردار پور میں بھی اسی طرح کی بغاوتیں ہوئیں۔ انقلابی ان بغاوتوں میں بھی انگریزوں سے نبرد آزما ہوئے، لیکن انگریزوں کی فوجی طاقت کے آگے انہیں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

امجھیرا میں انقلابیوں کے سربراہ بشیر اللہ خاں تھے، جن کو پھانسی کی سزا دی گئی، میہد پور کے انقلابیوں کے سربراہ ٹن خاں تھے، ان کو بھی پھانسی کی سزا دی گئی، مان پور میں تانیتا ٹوے انقلابیوں کے سربراہ تھے، ان کے ساتھ راؤ صاحب، نواب رحمت علی خاں، ستّار خاں، بس راؤ شاستری، اشرف علی خاں اور رحیم خاں شامل تھے۔ بھوپال کی سکندر بیگم حالاں کہ بغاوت میں شامل نہیں ہوئیں، لیکن بھوپال ریاست کے بانی کے رشتہ دار بغاوت میں شامل تھے، عادل محمد خاں، واحد محمد خاں، فاضل محمد خاں نے 2، اگست کو امباپانی میں بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔ امباپانی انگریزی فوج سے گھرا ہوا تھا، اس لیے انقلابیوں نے راحت گڑھ کے قلعے میں پناہ لے لی تھی۔ جنوری 1857 تک فاضل محمد قلعہ کا دفع کرتے رہے۔ 16، جنوری 1857 کو ہیوگ روز فوج کے ساتھ راحت گڑھ پہنچے، ایک ہفتہ مقابلہ کرنے کے بعد انقلابی وہاں سے فرار ہو گئے۔ فاضل محمد خاں اور راجا بان پور جو بغاوت میں شامل ہو گئے تھے اور کامدار خاں پنڈارا کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ عادل محمد خاں نے سرفراز خاں، شجاعت خاں اور شفاعت خاں کے ساتھ بغاوت کو جاری رکھا۔ شفاعت خاں کو پھانسی ہوئی، ایک دوسرا انقلابی فضل الحق لڑائی میں مارا گیا۔

بھوپال کے علاقے سپری، اگر اور منڈلیشوَر میں بھی بغاوتیں ہوئیں، ساگر، داموا اور سیونی میں بھی بغاوت کے شعلے بھڑکے، نرسیمہا پور اور اسیر گڑھ میں بھی بغاوت ہوئی۔ آخر میں انگریز اِن تمام بغاوتوں کی سرکوبی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ الغرض کوئی مقام ایسا نہیں تھا جہاں بغاوتیں نہیں ہوئی ہوں۔

راجستھان کے صوبے پر 1857 کی بغاوت کا اثر محدود علاقوں میں نظر آتا ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ راجستھان کی ریاستوں کے تقریباً تمام راجا ماتحتی معاہدہ کے معاہدوں کے تحت برطانوی حکومت سے پُختہ وفاداری نبھاتے رہے۔ اگر کہیں بغاوت کے آثار نمایاں ہوئے بھی تو اس کو اپنی فوجی طاقت سے فوراً سرکوبی کر دی۔

جے پور (Jaipur): جے پور میں کسی طرح کی بغاوت نہیں ہوئی، لیکن جے پور کے چند درباری انقلابیوں کے ساتھ خط و کتابت کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ ان میں راول شو سنگھ، نواب ولایت علی خاں، میاں عثمان خاں اور سعد اللہ خاں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ بغاوت کے وقت یہ لوگ دہلی میں تھے، لیکن جیسے ہی یہ لوگ دہلی سے جے پور واپس آئے، انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ مہاراجا رام سنگھ کے دربار میں اِن سب کی پیشی ہوئی، بغاوت کا جرم عائد کر کے اِن سب کو قلعوں میں قید بند کر دیا گیا۔

اجمیر (Ajmer): اجمیر میں انگریزوں کی براہِ راست حکومت تھی اور وہاں چھاؤنی بھی قائم تھی۔ لہٰذا اجمیر چھاؤنی کے ہندوستانی سپاہیوں نے دہلی میں بغاوت کے بارے میں سُن کر 9، اگست 1857 کو اجمیر جیل سے قیدی سپاہیوں کو چھڑا کر دیگر عوام کے ساتھ بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔

اجمیر کے قریب نصیر آباد چھاؤنی میں ہندو اور مسلمان انقلابیوں نے برطانوی حکومت سے بے حد ناراضگی کے سبب بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔ انہوں نے مغل بادشاہ کو اپنا قائد اور حکمراں تسلیم کیا۔ دیگر وجوہات کے علاوہ ایک افواہ یہ پھیلی ہوئی تھی کہ آٹے میں ہڈّیوں کے پاؤڈر کی ملاوٹ کی جا رہی ہے۔ اس بات سے ہندو اور مسلمان دونوں مشتعل تھے۔ کیونکہ اس سے ان کے مذہب کو ٹھیس پہنچتی تھی۔ لہٰذا 28، مئی 1857 کو نصیر آباد میں بغاوت شروع ہو گئی۔ انقلابیوں نے یورپی افسروں کی بندوقیں چھینیں، سرکاری عمارتوں کو نقصان پہنچایا، جب یورپی حکام نے سخت قدم اٹھائے تو نصف نے تو خود کو سپرد کر دیا اور نصف وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

نیمچ: 3، جون 1857 کو نیمچ چھاؤنی میں بھی بغاوت شروع ہو گئی۔ انقلابیوں نے سرکاری بنگلوں پر گولیاں چلائیں اور کرنل لارنس کی کوٹھی پر آئے۔ اِس بغاوت کے خاص سربراہ شیخ ارادت علی تھے، انہوں نے نیمچ پر قبضہ کر لیا تھا، فوجیوں کو جب انگریز حکام نے وفاداری کی قسم کی یاد دلائی تو ایک فوجی محمد علی نے انگریزوں سے طنزیہ طور پر سوال کرتے ہوئے جواب مانگا کہ "کیا تم نے معاہدے پر عمل کیا تھا جو ہم کریں گے"؟

اس بغاوت میں 2، انگریز عورتوں کو قتل کیا اور بچوں کو جلا دیا گیا، لیکن اُدے پور کے راجا کی فوج کی مدد سے اس بغاوت کی سرکوبی کر دی گئی۔ تمام انقلابی وہاں سے فرار ہو کر کچھ تو دہلی اور آگرہ پہنچے اور کچھ روہیل کھنڈ کے نواب بہادر خاں سے جا ملے۔ نومبر 1857 میں شہزادہ فیروز شاہ نے نیمچ میں دوبارہ مورچہ کھولا۔ اس نے یہ اعلان کرایا کہ جہاں کہیں بھی انگریز پائے جائیں، انہیں اسی طرح سے مارو جیسے سانپ کو مارتے ہیں۔ اس مورچے پر بھی اُدے پور کے راجا کی طرف سے انگریزوں کو مدد حاصل ہوئی اور انقلابیوں کی شکست ہوئی۔

کوٹا: کوٹا میں محراب خاں کی سربراہی میں انقلابیوں نے 15، اکتوبر 1857 کو ایجنسی ہاؤس کا محاصرہ کیا، انہوں نے میجر برٹن کو قتل کیا اور مہاراؤ کے محل کا بھی محاصرہ کیا۔ چھاؤنی کی سرکاری عمارتوں پر قبضہ کیا، مجبوراً مہاراؤ نے اُدے پور کے راجا سے اس کی بیوی اور خاندان کی حفاظت کرنے کے لیے ان کے محل میں پناہ مانگی۔ آخر کار میجر جنرل رابرٹ اپنی بھاری فوج کے ساتھ آیا اور انقلابیوں کو شکست دے دی۔

محراب خاں اور ایک دوسرے انقلابی لیڈر رجے دیال کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ انقلابی محمد خاں، امیر خاں اور گل محمد خاں جنگ میں مارے گئے۔ اکبر خاں کو پھانسی کی سزا دی گئی۔

راجستھان کے ریاست اوامیں ٹھاکر کشال سنگھ نے جودھ پور کے راجا سے ناراض ہو کر بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔ اسی کے ساتھ رسالدار عبد العلی، عبّاس علی خاں، شیخ محمد بخش اور کرنل موتی خاں بھی شریک ہو گئے تھے۔ ماؤنٹ آبو اور اِرن پورا میں بھی بغاوت ہوئی۔ موتی خان اس بغاوت کا سربراہ تھا، صوبیدار شیتل پرساد اور تلک رام بھی اس کے ساتھ مل گئے تھے اور انہوں نے 'دِلّی چلو اور انگریزوں کو مارو' کا نعرہ بلند کیا۔

ٹونک: راجستھان میں ٹونک ایک مسلم ریاست تھی، اس کا حکمراں وزیر محمد خاں تھے۔ میرٹھ چھاؤنی اور دہلی کی بغاوت کی جب خبر پہنچی تو نواب کی فوج کے سپاہیوں نے بغاوت کا علم بلند کیا، وزیر خاں ماتحتی معاہدہ کے معاہدے کے پابند اور انگریزوں کے وفادار تھے۔ انقلابی انگریزوں کے ظُلموں سے تو بے حد ناراض ہی تھے، ٹونک کے حکمراں سے بھی ان کو شکایتیں تھیں، نواب کے بھائی صاحبزادہ منیر خاں اس بغاوت کے سربراہ تھے۔ اس بغاوت میں نواب کے چچا عظیم اللہ خاں اور نمباہیرہ کے غلام محی الدین بخشی بھی شریک تھے۔ انقلابیوں نے نواب کو گھر میں ہی قید بند کر دیا تھا۔

بخشی غلام محی الدین نے نمباہیرہ میں بھی بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ انہوں نے مندیسر کے شہزادہ فیروز شاہ سے بھی مدد حاصل کی تھی، کیپٹن شاور نے اس بغاوت کی سرکوبی کے لیے سخت اقدام کئے۔ اس نے اپنی فوج لے کر قلعہ پر حملہ کیا اور انقلابیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ نواب کے حکم کے مطابق صاحبزادہ منیر خاں کو گرفتار کر لیا گیا اور قلعہ میں قید کر دیا گیا تھا۔ عظیم الدین خاں کو بھی قید کر لیا گیا۔ حافظ منیر عالم کو گرفتار کر کے پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ باقی انقلابی دہلی کی جانب کوچ کر گئے تھے۔ اس طرح راجستھان کے مختلف مراکز کی بغاوت کو دبا دیا گیا۔14

16.4.3 گجرات میں شورش (Rebellion in Gujarat)

گجرات میں بغاوت کے مراکز

وڈودرا (Vadodara): گجرات ممبئی پریسی ڈنسی کا حصہ تھا۔ شمالی ہند کی بغاوت کا اثر گجرات کی ریاستوں پر بھی پڑا تھا۔ وڈودرا کا گائک واڑ حکمراں انگریزوں کے ساتھ ماتحتی معاہدہ کر چکا تھا اور وہ ان کا پختہ وفادار دوست تھا۔ انگریزوں نے ماتحتی معاہدہ کے عیوض گائک واڑ کی حفاظت کی ذمہ داری لی تھی۔ وڈودرا کے ہندو اور مسلمان انگریزوں کی مذہبی معاملات میں دخل اندازی سے پہلے ہی بہت نالاں تھے۔ جب شمالی ہند میں بغاوت کے شعلے بھڑکے تو بلوچ جمعدار اور نواب سرفراز علی خاں کی سربراہی میں انقلابیوں نے ریاستی حکمراں اور انگریزوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ وڈودرا کا ایک تاجر مگن لال بھی بغاوت میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ اپنے 100، آدمی اور 30، گھوڑے لے کر برن گور پہنچا۔ اس نے اپنی طاقت میں مزید اضافہ کر لیا تھا اور اب اس کے پاس 200، آدمی اور ایک سو پچاس گھوڑے ہو گئے تھے۔ لوڈرا گاؤں کے

مقام پر برطانوی فوج سے مقابلہ ہوا۔ جس میں دو انقلابی مارے گئے اور 4، زخمی ہوئے۔ اس کے بعد آخر میں مگن لال کے ساتھی اسے چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ کانکواڑ کی فوج نے تھانہ سامے کے مقام پر مگن لال اور اس کے گیارہ ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ اُن پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان میں سے تین کو بندوق کی گولیوں سے ہلاک کر دیا گیا اور تین کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ مگن لال کے باقی ساتھیوں کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ ایک دوسرے انقلابی وڈودرا کے عمر خان نے اپنے 13، وطن پرستوں کے ساتھ 1857 میں بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ اِن سب کو بھی گرفتار کر کے قید بند کر دیا گیا۔ اس بغاوت کی ناکامی کی وجہ انقلابیوں میں آپسی تعاون اور تال میل کا فقدان تھا۔

ناندود (Nandood): گجرات کے ضلع ناندود مقام راج پیپلا میں سید مراد علی کی سربراہی میں بغاوت کا علم بلند کیا گیا۔ شہر کی دیواروں پر پمفلٹ لگا کر لوگوں کو انگریزوں کے خلاف للکارا، نواب اور راجاؤں سے بغاوت میں شامل ہونے کی اپیل کی اور کہا کہ ان کے اس قدم سے بادشاہ بہادر شاہ بہت خوش ہوں گے۔ ایک معاملات دار بھی اس بغاوت میں شریک ہو گیا تھا۔ مسٹر روجر فوج لے کر ناندود میں مراد علی کا مقابلہ کرنے پہنچا اور اس کو گرفتار کر لیا گیا، لیکن وہ کسی طرح فرار ہو گیا۔ ایک عرب جمعدار بھی بغاوت میں شامل ہو گیا تھا، مگر وہ بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس طرح ناندود کی بغاوت کی برطانوی فوج نے سرکوبی کر دی۔

دوہد اور گودھرا: دوہد اور گودھرا میں یکم جولائی 1857 کو تالے دار کی سربراہی میں بغاوت شروع ہوئی، یہ ایک انعامی گاؤں کا جاگیر دار تھا۔ اس کے ساتھ چُنّی لال دیسائی بھی بغاوت میں شریک ہو گیا۔ 600، انقلابیوں نے دوہد کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ یہاں سندھیا کی فوج بھی آئی ہوئی تھی، انگریزوں کے وفادار صوبیدار حسین شاہ خاں نے قلعہ پر حملہ کر کے انقلابیوں کو وہاں سے جانے پر مجبور کر دیا۔ کیپٹن بَکل اپنی فوج کے ساتھ دوہد کی بغاوت کی سرکوبی کرنے آیا۔ 11، جولائی کو دوہد پہنچا۔ تالے دار اپنے ساتھیوں کو لے کر فرار ہو گیا۔ 23، جولائی 1857 تک دوہد کو انقلابیوں سے خالی کرا لیا گیا۔ 15، انقلابی گرفتار کیے گئے تھے، جن پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان میں سے ایک کو 14، سال کی بامشقت سزا دی گئی۔ 9، انقلابیوں کو تاعمر قید کی سزا دی گئی، 4، انقلابیوں کو سزائے موت دی گئی۔

گودھرا (Godhra): گودھرا وڈودرا سے 45، میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ بیزابائی کی فوج کے لوگ گودھرا آئے۔ یہ بھوپاور مہوا اور اندور سے اپنی بندوقیں لے کر آئے تھے۔ انہوں نے گودھرا کے سرکاری آفسوں اور عمارتوں پر قبضہ کیا، کیپٹن بکل اور میجر تھامس شیپی کی سرکردگی میں گودھرا کی بغاوت کُچلنے کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کے آنے سے تمام انقلابی فرار ہو گئے۔

سُنتھ اور سانکھید: دکنی گجرات کے پنچ محل ضلع کے مقامات سُنتھ اور سانکھید پر بھی بغاوت کا اثر پڑا تھا۔ جمعدار مصطفی خاں نے وہاں کے لوگوں کے ساتھ حکمران مہارانا بھُون سنگھ جی کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ انقلابیوں میں سندھی، مکرانی اور کابلی بھی شامل تھے۔ مصطفی خاں کا جھگڑا تنخواہ کی عدم ادائیگی سے شروع ہوا تھا۔ وہ اپنے لوگوں کے ساتھ محل کے اندر داخل ہو گیا۔ آخر کار راجا کو بقایا تنخواہ ادا کرنے پر راضی ہونا پڑا۔ انقلابی لیڈر بھاؤ صاحب پوار بھی اپنے آدمیوں کے ساتھ بغاوت میں شریک ہو گئے۔ بھاؤ صاحب کے ساتھ روپا نائک اور کیول نائک بھی بغاوت میں شامل ہو گئے اور حملہ کر کے سرکاری عمارتوں کو نقصان پہنچایا۔ نارو کوٹ کا تھانہ برباد کیا، کیپٹن بیٹس کی سرکردگی میں

برطانوی فوج نے انقلابیوں پر حملہ کیا۔ جمبو گھوڑا کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ انقلابیوں کی ہار ہوئی اور وہ جنگلوں میں جا چھُپے۔ بھاؤ صاحب کے باغی نمائندے گنپت رائے کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ مقابلہ ختم ہو جاتا مگر مکرانی جب اس میں شامل ہو گئے تو انہوں نے چمپانیر اور نارو کوٹ پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے انگریزوں کی فوج کے ناک تلے چنے چبوا دیے تھے۔ کرنل والیس جو اس بغاوت کو دبانے کے لیے مقرر ہوئے تھے، وہ بھی ناکام رہے، انقلابی اس علاقے پر دسمبر 1857 تک قابض رہے۔ نائک بھائیوں نے گوریلا وار فئر کے طریقے آزما کر انگریزوں کو بہت پریشان کیا تھا۔ 28، جنوری 1859ء کو کیپٹن ہیوارڈ فوجدار حسین علی کی گولی سے زخمی ہوا۔ برطانوی فوج کے کچھ سپاہی اور سرکاری صوبیدار بھی مارے گئے۔ آخر کار کیپٹن رچارڈ بینر نے انگریزی فوج کی کمان سنبھالی۔ اُس نے روپا نایک اور کیول نایک انقلابیوں کے ٹھکانوں پر چھاپے مارے۔ آخر کار رُوپا اور کیول نے بینر کی نرم شرائط منظور کر لیں۔

مدیتی (Muditi): مُدیتی ایک چھوٹی سی جاگیر اِدر کے راجا کے ماتحت تھی۔ 1857 کی دہلی کی بغاوت کی خبر سن کر سورج مل ٹھاکر نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر بغاوت کا علم بلند کیا۔ اِدر کے راجا نے میجر وہائٹ لوک سے مدد مانگی۔ 9، اگست 1857 کو انقلابیوں نے مُدیتی پر حملہ کیا۔ لیفٹیننٹ لانے مُدیتی جا کر کیپٹن کونجر اور حسین شاہ کو انگریزی فوج کے ساتھ راجا کی مدد کرنے کا حکم دیا۔ اِن حالات کے پیش نظر انگریزوں نے ٹھاکر سے مکرانیوں کو مُدیتی سے نکالنے کی شرط رکھی تھی، لیکن معاہدہ نہ ہو سکا۔ 24، نومبر 1857 کو آخر کار کیپٹن رائیکس نے سورج مل کو شکست دے دی۔ سورج مل نے جب اپنے آپ کو کمزور پایا تو اس نے اپنے ہتھیار راجا کے سامنے ڈال دیے، اس طرح مُدیتی کی بغاوت اختتام پذیر ہوئی۔ 15

16.4.4 دکن میں آزادی کے لیے مزاحمت (Resistance for Independence in the Deccan)

دکنی ہند میں بغاوت کے مراکز

حیدرآباد (Hyderabad): شمالی ہند میں 1857 کی بغاوت جس جوش و خروش، انہماک اور قربانی کے جذبے سے ظہور پذیر ہوئی تھی، اتنی شدّت سے دکنی ہندوستان کے صوبوں اور ریاستوں میں نظر نہیں آتی۔ دکن میں صرف حیدرآباد کی بغاوت قابل ذکر ہے۔

پونا چھاؤنی کے مولوی نورالہدیٰ حیدرآباد کی کچھ اہم شخصیات سے گفت و شنید کر رہے تھے، تاکہ وہاں بھی بغاوت کا علم بلند کیا جا سکے۔ آخر کار مولوی الہ الدین نے انقلابیوں کی سربراہی کا بیڑہ اُٹھایا، جیسے ہی دہلی کی بغاوت کے بارے میں سنا، حیدرآباد کے انقلابی بھی بغاوت پر آمادہ ہو گئے تھے، وہ پہلے ہی سے برطانوی سرکار کی پالیسیوں سے ناخوش تھے۔ پہلے انقلابیوں نے مکّہ مسجد اور چار مینار کی دیواروں پر عوام کو بغاوت کے بارے میں باخبر کرنے اور بغاوت کرنے اور اکسانے کے لیے پمفلٹ چسپاں کئے۔ جون 1857 کو تمام انقلابی مکّہ مسجد میں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں رشید الدین خاں اور مولوی الہ الدین بھی شریک تھے۔ 16، جولائی 1857 کو انہوں نے جہاد کی ایک تفصیلی اسکیم تیار کی۔ بعد ازاں مولوی الہ الدین کی سربراہی میں برٹش ریزیڈنسی پر حملہ کیا گیا۔ روہیلہ جمعدار تُرّاباز خاں بھی بغاوت میں شامل ہو گئے۔ حیدرآباد کے نظام افضال الدولہ بلاواسطہ طور پر بغاوت کے نہ صرف حامی تھے، بلکہ مدد بھی فراہم کر رہے تھے، لیکن انجام کار نظام حیدرآباد کے وزیر سر سالار

جنگ نے جو انگریزوں کے وفادار تھے، اس بغاوت کو اپنی مصلحت انگریزی سے زیادہ مشتعل ہونے سے باز رکھا۔ سر سالار جنگ کے تعاون سے انگریزوں کی فوج نے حیدرآباد کی بغاوت کی بہت جلد سرکوبی کر دی۔ اس وفاداری کا برطانوی حکومت نے سالار جنگ کو 'سر' کا خطاب عطا کیا تھا۔

ماسوائے حیدرآباد دکنی ہندوستان میں بغاوت کا اثر دیگر دکنی ریاستوں میں نہ ہونے کے برابر پایا جاتا ہے۔ بغاوت کی خبر سن کر کرناٹک میں میسور کے کچھ مسلمان ٹیپو سلطان کے مزار پر ہندوستان کے دیگر مراکز میں بالخصوص شمالی ہند میں بغاوت کی کامیابی کی دعائیں مانگنے ضرور گئے تھے۔ اس کے سوا وہاں کوئی قابل ذکر بغاوت کی تحریک نہیں ہوئی۔

تامل ناڈو میں چُنگل پت کے سلطان بخش نے اور سیّد حمید جلیل نے دہلی کی بغاوت کے بارے میں سن کر بغاوت کا علم بلند کیا تھا، مگر انگریزی فوج نے اس کی سرکوبی کر دی۔ کوئمبتور میں شیخ عبداللہ، کڈّالور میں سیّد قاسم اور شیخ امام کے نام بغاوت کے محرکات سے جُڑے ہوئے تھے، جن کی گرفتاری کر لی گئی تھی۔ اس طرح کی چند مثالیں ضرور مل جاتی ہیں، لیکن دکنی ہندوستان میں بغاوت کی تحریک اس شدت سے ظہور پذیر نہیں ہوئی تھی جس طرح شمالی ہند میں ہوئی تھی۔

16.5 بغاوت کی ناکامی کی وجوہات اور اہمیت

(Causes for the Failure of, and the Significance of, the Rebellion)

جب ہم بغاوت کی ناکامی کی وجوہات پر غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے کئی سوال اُبھر کر آتے ہیں ، کیا یہ تحریک کچھ اصول اور ضابطوں کے پیراؤں میں منظم کی گئی تھی، کیا یہ کسی خاص سیاسی تحریک یا جماعت سے منسلک تھی؟ ان سوالوں کے جواب میں ہم پاتے ہیں کہ نہ تو یہ باقاعدہ منظم تحریک تھی اور نہ ہی یہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتی تھی۔ اگر ایک نعرہ دیا گیا تھا تو وہ تھا جہاد کا یا دھرم یُدھ کا، مگر یہ محض لوگوں میں جذبہ اُبھارنے کا وسیلہ تھا، نہ کہ کسی منظم جماعت کا ایجنڈا، یہ بغاوت نہ تو کسی خاص طبقے کی نمائندگی کر رہی تھی اور نہ ہی اس کا کوئی مرکزی لیڈر تھا۔ فی الوقت جو مقصد ہر انقلابی کے لب پر تھا وہ برطانوی سامراج اور حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کا تھا اور ظالم حکومت سے آزادی حاصل کرنا تھا۔ جدید خیالات اور نئی سوچ کی غیر موجودگی میں بس اس پر اِکتفاء کیا گیا تھا کہ برطانوی حکومت کے مقابلے میں اپنے ہندوستانی حکمراں زیادہ فیض رساں اور بہتر ہوں گے۔ ہر طبقہ اور قوم اُن اغراض اور مفادات کی بھرپائی کا خواہاں تھا جو برطانوی حکومت نے ان سے سلب کر لیے تھے۔ مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسا حیرت انگیز اچانک واقعہ درپیش ہوا تھا جس کی نظیر تاریخ کے پنّوں میں آج تک نظر نہیں آتی۔ اس میں انقلابیوں کے وطنی جذبے اور قربانیوں کی تو کمی نہیں تھی مگر جدید خیالات اور قومی پیمانے پر تنظیم کی یقیناً کمی تھی، جو ناکامی کی اوّل وجہ تھی۔ بغاوت کی ناکامی کی دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ ریاستی حکمران ماتحتی معاہدہ کے معاہدوں سے بندھے ہوئے تھے۔ یہ اپنے مفاد اور اغراض کی وجہ سے ہمیشہ برطانوی حکومت کے وفادار رہے۔ ماتحتی معاہدہ ہی کی وجہ سے ریاستی حکمرانوں کی جنگی صلاحیتیں بھی سلب ہو چکی تھیں۔ ان کی اپنی کوئی فوجی طاقت نہیں تھی بلکہ وہ انگریزی فوج پر منحصر رہتے تھے۔ درحالانکہ برطانوی فوج انہیں کے خرچے سے تیار کی گئی

تھی مگر حکم انگریزوں کا چلتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی سپاہیوں کی شرکت نے بغاوت کی ریڑھ کی ہڈّی کا کام کیا تھا۔ اس کے باوجود ایک بڑی تعداد پھر بھی ہندوستانی سپاہیوں کی برطانوی فوج میں انگریزوں کی مددگار ثابت ہوئی تھی۔ متعدد ہندوستانی انگریزوں کے پٹّھو اور مخبر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

ایک دیگر اہم وجہ یہ تھی کہ ایک مرکزی باصلاحیت لیڈر کی غیر موجودگی اور ہر جگہ علیحدہ علیحدہ تحریکیں چلانے میں بغاوت منظم نہ ہو سکی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر مرکز میں انقلابیوں نے جذبۂ وطن پرستی کا زبردست مظاہرہ کیا تھا۔ بے خوف اور نڈر ہو کر جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ ان میں قابلِ قدر قربانی کا جذبہ تھا اور ان کی قربانیوں کی مثالیں آزادی کی تحریک میں آج تک دی جاتی ہیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ انہیں یہ اندازہ بخوبی تھا کہ برطانوی فوج کے سامنے اُن کی مکمل فتح ناممکن تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی جانوں کی قربانیاں دیں، لیکن مرکز کے اندر اور مرکزوں کے مابین آپسی تال میل کا بہت فقدان تھا، جس کی وجہ سے انقلابیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

بغاوت کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ برطانوی فوجوں کے مقابلے میں انقلابیوں کے پاس جدید ہتھیاروں کی بہت کمی تھی۔ انگریز اگر کسی مرکز میں ناکام ہوتے تھے تو ان کی مدد کے لیے دیگر پریسی ڈنسیز سے فوجی مدد بھرپور طریقے سے دستیاب ہو جاتی تھی۔ لہٰذا مذکورہ بالا وجوہات سے 1857 کی بغاوت ناکام رہی، لیکن اس ناکامی میں بھی ایک بڑی کامیابی پوشیدہ تھی۔ یہاں ایک ضرب المثل صادق آتی ہے کہ 'مرحوم جُولیس سیزر بنسبت زندہ کے زیادہ طاقت ور ثابت ہوا۔'

1857 کی بغاوت کی نوعیّت اور مقاصد کے صرفِ نظر اگر ہم اس واقعہ کے مختلف طبقوں اور اداروں پر گہرے اثرات پر غور کریں تو بظاہر ناکامی کے باوجود تاریخ کا یہ واحد عظیم واقعہ تھا جو لامتناہی اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ 1857 میں ایک ایکٹ پاس کر کے ملکہ وکٹوریہ کی براہِ راست حکومت کا قیام، ملکہ کا شاہی فرمان، جس میں فیض رساں حکومت قائم کرنے کا وعدہ، حکومت کی نئی تنظیم اور اس کے پہلے وائسرائے لارڈ کیننگ کی احتیاط اور اعتدال کی پالیسی، برطانوی حکومت کی کونسلوں میں ہندوستانیوں کی نمائندگی، لارڈ رِپن کے دور میں لوکل سیلف پنچایتوں کے الیکشن، لارڈ ڈفرن کے زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام اور تحریک آزادی کا آغاز، یہ سب حقائق 1857 کی بغاوت کی اہمیت کا بیّن ثبوت ہیں۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ 1857 کے بہادر سپوتوں نے فقید المثال قربانیوں کی وہ چھاپ چھوڑی تھی جس نے آزادی کی طویل تحریک کو بے حد متاثر کیا تھا۔ اس میں ہمارے متعدد لیڈروں نے جان کی بازی لگائی اور بڑی تعداد نے اپنی خوشحال زندگی کو خیر آباد کر کے آزادئ ہند کو پروان چڑھایا تھا۔ آج ہم آزادی کا سانس انہیں کی وجہ سے لے رہے ہیں۔

تاریخ کے اس گوناگوں اہمیت کے واقعہ سے نہ تو کسی ماضی کے واقعہ سے اور نہ ہی بعد کی کسی تحریک سے مماثلت کی جاسکتی ہے۔ اس واقعہ سے تمام طبقوں، قوموں، ہندو، مسلمان، انگریزوں تک نے سبق حاصل کیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ہندوستان کے روشن مستقبل کی تشکیل نو بغاوت کے اثرات ہی میں مضمر ہے۔

16.6 1857 میں برطانوی حکومت کی تنظیمِ نو

(Reorganisation of the British Government in 1857)

1857 کی بغاوت ایک ایسا عبرت ناک تاریخی واقعہ تھا، جس سے ہندوستان اور برطانیہ کے ہر ذی شعور طبقے نے سبق حاصل کیے تھے۔ سب سے پہلے برطانوی حکومت کے طرزِ حکومت میں تبدیلیاں کی گئیں، ملکہ وکٹوریہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو برخاست کر کے ہندوستان کی حکومت براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک مخصوص رقم ادا کرنا طے پایا تھا۔ ڈائریکٹروں نے اپیلیں بھی کیں مگر ان اپیلوں پر کوئی سنوائی نہیں ہوئی۔ یکم نومبر 1857 کو ملکہ وکٹوریہ نے ایک شاہی فرمان جاری کیا، اس فرمان کو ملکہ کی ہدایتوں کی روشنی میں لارڈ ڈربی نے ڈرافٹ کیا تھا۔ اس فرمان کے چند مخصوص پہلو مختصراً پیش کیے جا رہے ہیں:

اوّل: اس میں تحریر تھا کہ ملکہ وکٹوریہ کی ہندستانی حکومت فیض رساں، اعتدال پسند اور غیر جانب دار ہوگی۔ کسی کے ساتھ کسی طرح کا نسلی اور مذہبی امتیاز نہیں برتا جائے گا اور مذہبی رواداری برتی جائے گی اور یہ کہ عوام کو احساس دلایا جائے کہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت ہندوستان کے تمام ہندوستانیوں کی فلاح و بہبودی کا کام کرے گی اور ملک میں خوشحالی لائی جائے گی۔ مزید برآں ریاستی حکمرانوں کے ساتھ اچھے رویے کا یقین دلایا اور یقین دلایا کہ آئندہ کسی بھی ریاست کا الحاق نہیں کیا جائے گا، مگر پرانے معاہدے برقرار رہیں گے۔ فرمان میں تمام قیدیوں کو رہا کرنے کے احکام بھی جاری کیے گئے تھے، البتہ جنھوں نے قتل کیے تھے ان کی سزا کو بدستور رکھا گیا تھا۔

1857 کا ایکٹ: شاہی فرمان جاری کرنے کے ساتھ ہی 2، اگست 1857 کو ایک انڈیا ایکٹ پاس کیا گیا، جس کے تحت ہندوستان میں ملکہ وکٹوریہ کی حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا گیا، گورنر جنرل کی جگہ وائسرائے کا تقرر کیا گیا، اس کے لیے انگلستان میں ایک بورڈ آف کنٹرول کی تشکیل کی گئی اور ایک سیکریٹری آف اسٹیٹ کا تقرر کیا گیا جو بورڈ سے صلاح و مشورہ کر کے ہندوستان کے وائسرائے کو ہدایات جاری کیا کرے گا۔ ہندوستان میں وائسرائے کی بھی ایک کونسل تشکیل کی گئی تھی، جس میں یورپیئن کے علاوہ مخصوص ہندوستانیوں کو نامزد کر کے نمائندگی دی جانے لگی۔ ایکٹ کے تحت لارڈ کیننگ کو پہلا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ کیننگ نے فرمان کے اصولوں کے تحت اعتدال پسندی اور احتیاط کی پالیسی اپنائی۔ ریاستی حکمرانوں سے رشتے کے بارے میں اس نے اصولِ الحاق کی پالیسی کو خیر باد کرنے اور گود لینے کی رسم کو منظوری دے دی۔ لیکن اپنے اس اصول کو بھی واضح کر دیا کہ وفادار ریاستی حکمرانوں کو انعامات اور خطابات سے نوازا جائے گا اور جو حکمراں بے وفائی اور غدّاری کریں گے، انہیں سزائیں دی جائیں گی۔ چنانچہ اس اصول کے تحت نظام حیدرآباد کو انعام واکرام اور خطابات سے نوازنے کے علاوہ ان کے پُرانے علاقے واپس کر دیے گئے۔ اسی طرح گوالیار کے حکمران سندھیا کی بھی تعظیم و تکریم کی گئی۔ مگر دھار اور کوٹا ریاستوں کے حکمرانوں کو 1857 میں ان کی تلوّن مزاجی اختیار کرنے کی وجہ سے کچھ علاقے کھونے پڑے۔ پُرانے انصافی اداروں کی تنظیمِ نو کی گئی جس کے تحت پریسی ڈنسیز میں ہائی کورٹ قائم کیے گئے۔ فوج کی تنظیم نو کی گئی، فوج میں کافی تخفیف کر دی گئی تھی، لیکن فوج کو ایک نئے اصول، ڈویژن اینڈ کاؤنٹر پوائنز، کے تحت مذہب اور ذاتوں کی ملی جُلی فوج تشکیل کی گئی۔ ہتھیار بند فوج میں یورپی ہی کو نوکری مل سکتی تھی، آزادانہ تجارت کو مزید فروغ

حاصل ہوا۔ اب پورا انگلستان ہندوستان سے تجارت کر سکتا تھا اور فائدے اُٹھا سکتا تھا۔ اسی کے تحت درآمد پر ٹیکس کم لگائے گئے اور برآمد پر زیادہ ٹیکس لگائے گئے، جس سے انگلستان کو اور بھی زیادہ فائدہ پہنچا اور ہندوستان کی صنعتوں کی حالت بدتر ہوتی گئی۔

وائسرائے جوہن لارنس کے دور میں پنجاب ٹیننسی بل اور اودھ رینٹ بل پاس کیے گئے۔ اس کے تحت جو کسان 12، سال سے جس زمین پر کھیتی کر رہے تھے، وہ اس زمین کے مالک قرار دیے گئے۔ اس قانون سے تعلقدار اور زمیندار ناراض ہو گئے تھے۔ وائسرائے لارڈ میوؔ کے دور میں بجٹ میں اصلاحات کی گئیں۔ لارڈ میوؔ نے اجمیر میں شہزادوں اور رئیس زادوں کے لیے جدید تعلیم کا بالخصوص انجینئرنگ کالج قائم کیا۔ لارڈ نارتھ بُرک نے اقتصادی حالات درست کیے، مگر وہ ہندوستانیوں کو جدید تعلیم مہیا کرانے کے حق میں نہیں تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ ''سوتے ہوئے کتّوں کو مت جگاؤ، انہیں سونے دو''۔

لارڈ لٹن کا دور کئی اعتبار سے مُنفرد ثابت ہوا۔ سب سے پہلے اسے ایک بڑے قحط کا سامنا کرنا پڑا، جس کو اس نے اپنی صلاحیتوں سے مشکل مسئلوں کے حل نکالے، لیکن وہ ایک رجعت پرست حکمراں تھا۔ اس کے زمانے میں یکم جنوری 1877ء میں دِلّی دربار منعقد کیا گیا، جس میں تمام ریاستوں کے حکمرانوں کو اور ہندوستان کی مخصوص ہستیوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس میں جو حاضر نہیں ہوا اس کو غدّار قرار دیا گیا۔ تمام حکمرانوں نے ملکہ وکٹوریہ کے ساتھ وفاداری کی قسم لی تھی۔ اسی کے زمانے میں 1878ء میں ورنا کلر ایکٹ پاس کر کے ہندوستانی زبانوں کے اخبارات پر پابندی لگادی گئی تھی۔ اسی سال ایک آرمس ایکٹ پاس کر کے ہندوستانیوں کو ہتھیار رکھنا ممنوع قرار دے دیا تھا، لٹن نے سرسید کے اینگلو محمڈن کالج علی گڑھ کا 1870ء میں سنگِ بنیاد رکھا، جس کا انگریز پرنسپل مقرر کیا گیا تھا۔ لارڈ رِپن کا دور فیض رساں کہا جاسکتا ہے، اس نے ایک لوکل سیلف گورنمنٹ کا ایکٹ پاس کر کے پنچایتوں میں الیکشن کرائے تھے۔

لارڈ ڈفرن کے زمانے میں ایک انگریز مصلح ایلن اوکٹیوین ہیوم نے 28، دسمبر 1885ء میں بمبئی میں مخصوص 72، ہندوستانیوں کو مدعو کر کے ایک انجمن کا قیام کیا، جس کا نام انڈین نیشنل کانگریس رکھا گیا۔ اس کا پہلا اجلاس 28، دسمبر تا 30، دسمبر کو ڈبلو۔ سی۔ بنرجی کی صدارت میں منعقد کیا گیا۔ ہیوم 1912ء تک اس کے سکریٹری بنے رہے، ہیوم کا یہ قدم ہندوستان کی جمہوری سیاست میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ حالاں کہ اس انجمن کا مقصد ہندوستانیوں کو آزادی دلانا نہیں تھا، بلکہ ہیوم کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر اپنے مسائل پر بحث کریں اور حکومت سے گفت وشنید کر کے ان مسائل کا حل نکالیں، تاکہ 1857 جیسی بغاوت دوبارہ رُونما نہ ہو سکے۔ آر۔ سی۔ مجومدار کے بقول کانگریس دراصل برطانوی حکمرانوں کے لیے ایک سیفٹی والو، کا کام کرنے کے لیے تشکیل کی گئی تھی، لیکن بعد ازاں اسی انجمن نے ہندوستانیوں کے لیے امرت کا کام کیا۔ یعنی جمہوریت اور جدید دور کی پیغامبر ثابت ہوئی۔

مجموعی اعتبار سے ملکہ وکٹوریہ کے دور حکومت میں جو آغاز میں تبدیلیاں کی گئیں وہ محض ظاہری تھیں۔ اگر غور کیا جائے تو سیاسی رجعت پرستی، اقتصادی انتفاع کی پالیسی میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی۔

16.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

1857 کی بغاوت کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔اس سے برطانیہ کی جابرانہ اور لوٹ مار پر مبنی معاشی پالیسیوں کے خلاف برسوں سے پنپ رہا لاوا ایک دم سے پھوٹ نکلا۔اس بغاوت کے متعدد اسباب تھے اور کوئی ایک واحد سبب اس کے لیے ذمے دار نہیں تھا۔بغاوت کی نوعیت کو لے کر بھی مورخین میں اختلافات ہیں جس کا ہم پچھلے اوراق میں مشاہدہ کر چکے ہیں۔بغاوت بھلے ہی کچل دی گئی مگر اس کی وجہ سے انگریزوں کے منمانے رویے پر کچھ حد تک روک لگی اور اپنے آئندہ اقدامات میں انہوں نے کافی احتیاط سے کام لیا۔

16.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

سیکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا	؛	ہندوستانی حکومت کے لیے برطانیہ میں نمائندہ
انفیلڈ کارتوس	:	ایک نئے قسم کے کارتوس جو منہ سے چبا کر چلائے جاتے تھے۔

16.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

16.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. 1857 کی بغاوت کی شروعات کس شہر سے ہوئی؟
2. 1857 کی بغاوت کو آزادی کی پہلی جنگ کس نے کہا؟
3. کیا 1857 کی بغاوت مسلمان مولویوں اور حکمرانوں کی سازش تھی؟
4. 1857 کی بغاوت کے وقت کس افغان سربراہ نے دہلی میں ان کی قیادت کی؟
5. 1857 کی بغاوت کو سپاہیوں کی بغاوت کس نے کہا؟
6. 1857 کی بغاوت کے دوران کس جانور کو مارنے پر پابندی لگائی گئی؟
7. 1857 کی بغاوت میں کس کی چربی کے کارتوس چلانے سے سپاہیوں نے منع کیا؟
8. 1857 کی بغاوت کے بعد نانا صاحب کہاں چلے گئے؟
9. دہلی میں بغاوت کے وقت مغل بادشاہ کون تھے؟
10. اودھ میں 1857 کی بغاوت کے وقت کس مسلم خاتون نے قیادت کی؟

16.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. کانپور میں 1857 کی بغاوت کی وجوہات اور واقعات بیان کیجئے؟
2. شاہجہاں پور میں انقلابی لیڈروں کے متحدہ محاذ کی جدوجہد اور نتائج پر روشنی ڈالیے؟

3. 1857 کی بغاوت میں علماء کے کردار اور جدّوجہد واضح کیجئے؟
4. وسطی ہند میں (مندیسر) 1857 کی بغاوت میں شہزادہ فیروز شاہ کی جدّوجہد پر تبصرہ کیجئے؟
5. جھانسی میں رانی لکشمی بائی کی انگریزوں کے خلاف جنگ کے مقاصد اور واقعات بیان کیجئے؟
6. راجستھان میں 1857 کی بغاوت کی نوعیت اور واقعات پر روشنی ڈالیے؟
7. ٹونک میں 1857 کی بغاوت کی نوعیت اور واقعات پر تبصرہ کیجئے؟

16.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. دکنی ہند میں بالخصوص حیدرآباد میں 1857 کے اثرات بیان کیجئے؟
2. 1857 کی ناکامی کی وجوہات کا تجزیہ کیجئے اور اہمیت کا جائزہ لیجئے؟
3. 1857 میں ہندوستان میں ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کے قیام اور تنظیمِ نو کے مخصوص پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیجئے؟

16.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Kaye and Malleson, *History of the Mutiny of 1857* (London 1898).
2. Mujeeb Ashraf, *Muslim Attitudes Towards British Rule and western culture in India* (Delhi, 1982).
3. Mujeeb Ashraf, *Some Aspects of British Colonial Rule in India* (New Delhi, 2002).
4. Mujeeb Ashraf, *Some Aspects of British Colonial Rule in India* (New Delhi, 2002).
5. Mujeeb Ashraf, *The Role of Muslims in the Indian Freedom Struggle*, Vol. III.
6. P.C. Joshi (Ed.), *Rebellion of 1857*, A symposium, (New Delhi, 1957).
7. Raja and Mujeeb Ashraf, *The Role of Muslims in The Indian Freedom Struggle*, Vol.II (Delhi, 2012).
8. R.C. Majumdar, *The Sepoy Mutiny and the Revolt of 1857*.
9. S.B. Chaudhari, *Civil Rebellion in the Indian Mutiny* (Calcutta, 1957).
10. Sir Saiyyad Ahmad Khan, *Asbab-i-Baghawat-e-Hind* Delhi, 1971.
11. S.N. Sen, *Eighteen Fifty Seven* (Delhi, 1958).
12. T.R.E. Holmes, *At History of the Indian Mutiny*.
13. V.D. Savarkar, *The Indian war of independence* Bombay, 1947.

نمونہ پرچہ امتحان

نظامت فاصلاتی تعلیم Directorate of Distance Education

ماسٹر آف آرٹس Master of Arts

Subject Code : MAHS114CCT

Paper IV : History of India (1757-1857)

چوتھا پرچہ: تاریخ ہندوستان (1757-1857)

پہلا اسمسٹر امتحان ، 1st Semester Examination

نشانات : 70 Marks : 70 وقت : 3 گھنٹے Time : 3 hours

ہدایات

یہ پرچہ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں جو کہ معروضی سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ (1 0 x 1 =10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں 8 سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو (200) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی 3 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً پانچ سو (500) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30 Marks)

حصہ اول

سوال : 1

i. کرتاز (*Cartaz*) کیا ہے؟

ii. واسکوڈی گاما کس ملک کا رہنے والا تھا؟

iii. *Rise of Maratha Power* نامی کتاب کا مصنف کون ہے؟

iv. چوتھ اور سردیش مکھی نامی ٹیکس کن علاقوں میں نافذ کیا گیا؟

v. کس سال میں کمپنی کے ارباب اختیار نے سورت کی فیکٹری کو قلعہ بند کرنے کی کوشش کی؟

vi. بمبئی کا جزیرہ کمپنی کو 1668ء میں کس سے حاصل ہوا؟

vii. انگریزوں اور مغل شہنشاہ میں پہلی جنگ کس سال میں ہوئی؟

viii. 'غلام گیری' نامی کتاب کس زبان میں لکھی گئی؟

ix. 1923 کے لی کمیشن کی وضاحت کریں۔

x. ریلے کمیشن کب قائم ہوا؟

حصہ دوم

2. پرتگالیوں کے ہندوستان آمد پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. ہندوستان میں کمپنی کی فیکٹریوں کی تنظیم پر روشنی ڈالیے۔
4. بنگال کی معاشی لوٹ کھسوٹ پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔
5. ہندوستان میں مقامی حکومت کے حوالے سے رپن کی 1882 کی قرارداد کیا تھی؟
6. سیڈلر کمیشن کی خاص سفارشات کیا تھیں؟
7. رادھا کرشنن کمیشن میں کون سی سفارشات پیش کی گئیں؟
8. ہندوستانی ثقافت پر جیمس مل کی تنقید پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
9. 1857 کی بغاوت میں علماء کے کردار اور جدّوجہد واضح کیجئے؟

حصہ سوم

10. ہندوستانی ریاستوں میں فرانسیسی پیشہ ور فوجیوں کے کردار پہ روشنی ڈالیے۔
11. پلاسی کی جنگ کے اسباب و نتائج پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔
12. جدید تعلیم کی توسیع میں ووڈس ڈسپیچ کی اہمیت بتائیے۔
13. انیسویں صدی کے ہندوستان میں ستی کی رسم کے خلاف چلائی گئی مہم پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
14. 1857 کی ناکامی کی وجوہات کا تجزیہ کیجئے اور اہمیت کا جائزہ لیجئے؟

اہم نکات